

کمرے میں اے سی کی کولنگ کے ساتھ ساتھ سگریٹ کی ناخوشگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ مکرم علی نے پردہ ہٹایا تو شیشے کی دیوار سے سورج کی چمیلی کرنیں چھن کر تندر چلی آئیں اور چند لمحوں قبل والا اندھیرا ماحول یکا یک جگمگا اٹھا۔

مکرم علی نے پلٹ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ کارپٹ پر ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سگریٹوں کے ٹوٹے، خالی پیکٹ کولڈ ڈرنک کی بوتلیں، ان کے کھولنے کی Keys گندی پلیٹیں اور جانے کیا الا بلا سامان بکھرا ہوا تھا۔ ہر کونے میں کشن اونڈھے پڑے تھے، ایک تکیہ پھنا ہوا تھا اور اس کی نرم روئی کبوتر کے پروں کی طرح پورے کمرے میں بکھری ہوئی تھی۔ بیڈ شیٹ آدھی بیڈ پر آدھی کارپٹ پر تھی۔

اور وہ ہاتھ پاؤں پھیلائے، التالیٹا، بے خبر سو رہا تھا۔

”چھوٹے شاہ صاحب۔“ مکرم علی نے بے حد مودبانہ انداز میں اسے پکارا۔ ”آپ نے بارہ بجے جگانے کو کہا تھا۔“

”ہوں۔“ وہ کراہا اور سیدھا ہو کر پھر بے سدھ ہو گیا۔

”چھوٹے شاہ صاحب۔“

”ہوں۔ کیا ہے بابا.....؟“ وہ بے زاری سے گویا ہوا۔

”بارہ بج کر دس منٹ ہو چکے ہیں۔“

”ہونے دو۔“ وہ غنودگی میں بولا ”تمہارا کیا لیتے ہیں.....“

”آپ کو کہیں جانا تھا۔“

”مجھے!“ اس نے بمشکل سوجی ہوئی آنکھیں کھولیں اور سوئے ہوئے دماغ کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔

”مجھے کہاں جانا تھا؟ ہاں..... یاد آیا..... چائے لائے ہو؟“

”حاضر ہے جناب۔“ مکرم علی نے پھرتی سے ٹرائی گھسیٹ کر بیڈ کے نزدیک کی۔ ٹی کوزی ہٹا کر پیالی میں گرم گرم چائے ڈالی۔ دودھ

انڈیلا اور چمچہ ہلانے لگا۔

”چائے شاہ صاحب!“

”وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں جھپکا جھپکا کر نیند بھگانے کی کوشش کرتے ہوئے اس ہاتھ سے کپ لے لیا۔

”میرا کوئی اچھا سا شلوار سوٹ نکال دو..... کوئی سفید نکال لو کلف والا۔“

”جی صاحب۔ اور کوئی حکم؟“

”کوئی فون تو نہیں آیا تھا؟“ سوئی سوئی آواز میں اس نے پوچھا۔

”نہیں شاہ جی!“

”وہ سب“ کتے“ کب گئے؟“ پیالی خالی کر کے مکرم کی جانب بڑھائی۔

”جی! سائیں..... دس بجے تک سب چلے گئے تھے۔“

”ناشتہ کروادیا تھا؟“

”جی سائیں..... بالکل۔“

”ہوں..... ٹھیک۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا ”یہ سب گندا اٹھواؤ یہاں سے۔ بلاؤ خیراں کو۔ میں نہانے جا رہا ہوں..... امید سے کہو ناشتا تیار

رکھے۔“

”جی بہتر!“

وہ ہاتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔



”اوئے۔ آگیا میرا سوہنا راجہ۔“ لشکر نے اسے دیکھ کر سیٹی بجائی۔

لینڈ کروزر کا دروازہ شان سے بند کر کے اس نے ان سب کی جانب قدم بڑھائے۔

”ہم تو سمجھے تھے تم نے ارادہ بدل دیا۔“

”بندے کی زبان کھری نہ ہو تو پھر کیا رہ جاتا ہے اس کے پاس؟“ اس نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

اپنے اونچے لمبے قدم کے ساتھ، زمین پر شان اور مضبوطی سے قدم جمائے، مونچھوں کو بل دیتے ہوئے، وہ کسی ریاست کا بگڑا شہزادہ نظر آتا تھا۔ سفید کلف لگے شلواری قمیض پر، میروں شال بازوؤں کے گرد لپیٹ کر پیچھے ڈال رکھی تھی۔ گریبان اور آستینوں کے کف پر سونے کے لٹکس چمک رہے تھے اور خم دار پلکوں والی، آنکھیں، دولت، جوانی اور وجاہت کے نشے سے مخمور ہو رہی تھیں۔

”پھر چلیں؟“ فہد نے گھڑی دیکھی ”ڈیڑھ تو یہیں بیٹھ گیا ہے۔ آدھے گھنٹے کا راستہ ہے۔“

”اپنے شہزادے کی لینڈ کروزر فرمائے بھرے گی نا۔“ لشکر ہنسا۔ ”راستے کی کیا فکر؟“

”کھانے پینے کا کیا انتظام ہے؟“ اس نے تینوں کو باری باری دیکھا۔

”مچھلی، جو شکار کریں گے۔ اور پانی جو دریا میں بہہ رہا تھا۔“ لشکر نے قہقہہ لگایا۔

”اور مزید جو اپنے عالم شاہ صاحب کی خواہش ہو!“ آصف نے ٹکڑا لگایا۔

”بے غیر تو۔“ اس نے ہنس کر ہنوا نکالا۔

نیلانوت نکال کر فہد کو تھمایا۔ ”لینا راستے میں سے کچھ۔ ورنہ سب سے پہلے تمہارے دوزخ ہی چیخنا شروع ہوتے ہیں۔“

”خدا تجھے خوش رکھے۔“

”جیتا رہ میرا یار۔“

”وہ ان سب کے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ جا بیٹھا۔

”تو آ کیسے گیا یار؟“ فہد نے اشتیاق سے پوچھا۔

”کیوں؟ کل ہامی نہیں بھری تھی؟“ اس نے تیوری پر بل ڈالے۔

”پھر بھی۔ لگتا تھا بڑی بے دلی سے کہہ رہا ہے۔“

”ہوں، بے دلی سے ہی کہا تھا۔ مجھے یہ معمولی مچھلیوں کا شکار کا شوق نہیں ہے۔ ایک ہنسی پانی میں ڈال کر بیٹھ جاؤ، احمقوں کی طرح انتظار کرنے، بندے کے ہاتھ میں بندوق ہو۔ کاندھے پر کارتوس کی پٹنی ہو تو وہ بھلا بھی لگے۔ شکار کا لفظ بھی اچھا لگے کانوں کو۔ یہ مچھلیوں کا شکار تو صرف عورتوں کے لئے ہی ہونا چاہئے!“

ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے اک ادا سے بے نیازی سے کہا۔

”ابے عورتوں میں اتنا صبر کہاں میرے شہزادے۔“

”لشکر نے حسب عادت بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ ”وہ تو منٹ میں ہنسی چھوڑ چھاڑ ہاتھ جھاڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوں گی۔ یہ کانا ڈال کر مچھلی

کا انتظار کرنا تو ہم مردوں کا ہی دل گردہ ہے۔“

بات چونکہ معنی خیز تھی اس لئے اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

”تم مردوں کا۔“ اس نے زور دے کر کہا ”مجھے ایسی بھی کوئی مجبوری نہیں۔“

”ہاں شہزادے۔“ فہد نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”تو بڑا آدمی ہے۔ اپنے نصیب ایسے کھرے کہاں، تیرا تو پورا وجود ہی ایک دلفریب، خوشنما کاٹا ہے مچھلی کی نظر پڑی اور پھنسی ہی پھنسی۔“ وہ ہولے سے ہنس کر خاموش ہو گیا۔

”یار عالم! یار سچ سچ بتا۔ کتنے شکار کر چکا ہے آج تک؟“ آصف نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

”ہوں گی کوئی سو ڈیڑھ سو کے قریب۔“ لشکر نے لقمہ دیا۔

”کیسے۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”بدنام کرتا ہے مجھے۔“

”پھر سچ بول۔“

”بس دس پندرہ سے زیادہ نہیں۔“ وہ ہلکے سے ہنسا۔

”بس دس پندرہ! خدا کی پناہ!“

”آصف نے آنکھیں پھیل کر دہشت سے مرجانے کی ایکٹنگ کی۔

”میرا کوئی قصور نہیں۔“ اس نے کاندھے اچکائے۔ ”بقول فہد کے میرا تو پورا وجود ہی ایک پرفریب کاٹا ہے ایسے میں دس پندرہ بھی کم

ہیں یہ بھی تو تھوڑا بہت بھاگئیں، نظر کو۔ ورنہ عالم شاہ کے ساتھ وقت گزارنا کوئی معمولی بات نہیں۔“

”اس کے لہجے میں اپنی ذات کا بے پناہ غرور ملکورے لے رہا تھا۔

”وہ تو ہے۔“ لشکر نے مکھن لگایا۔ ”ہمارا شہزادہ اتنا تو نوازیہ دیتا ہوگا کہ ان کو سودا مہنگا نہ پڑے۔“

وہ غرور سے مسکراتا رہا۔

”پراہیک بات کھٹکتی ہے۔“ آصف نے کن آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”دل کی بستی سوئی ہے شہزادے کی۔“

”ہا۔“ وہ ہنسا۔ ”اس بستی کو بسانے والی بڑی مشکوں سے ٹکرائے گی۔“

”وہ کیوں؟“ تینوں ساتھ بولے تھے۔

”وہ اس لیے کہ پہلے لاکھ لڑکیاں مسترد ہوں تو ویسی کوئی ایک ملے گی۔“

”کیسی؟“

”چودھویں کے چاند کی پہلی کرن سی ابر نیساں کے پہلے شفاف قطرے کی سی..... چودھویں کی رات میں چپکے سے چٹک جانے والے

بہار کے پہلے غنچے کی سی معطر معطر پاکیزہ پاکیزہ۔“

تھوڑی دیر کے لئے گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔ سب اپنی اپنی سوچوں میں کھو گئے۔ پھر اس خاموشی میں فہد کی سوچ میں ڈوبی

بوجھل آواز نے چیرا۔

”یار عالم۔ میں نے دیکھی ہے ایسی لڑکی..... بالکل ایسی۔“



”آپا..... یہ چادر تیار ہوگئی ہے۔“

اس نے سفید، کڑھائی کی ہوئی چادر۔ بہن کے سامنے پھیلا دی۔

”ہوں..... چلو شکر ہوا..... خدا خدا کر کے مکمل تو ہوئی۔“ مہ جہیں نے سلائی مشین روک کر چادر کو بغور دیکھا۔ ”بڑی صفائی سے بنی ہے!“

”جی تو محنت بھی تو کتنی کی ہے میں نے۔“ اس نے فخر سے کہا ”اب ذرا اوڑھ کر تو دکھائیں کیسی لگتی ہیں!“

اس نے مہ جیس پر چادر ڈال کر دیکھی۔

’ضوفی کیا کرتی ہو! ماں دیکھ لیں گی..... کیا سوچیں گی بھلا؟‘ اس نے چادر استار کر ضوفشاں کو گھورا۔

’کیا سوچیں گی؟ میں آپ کی بہن ہوں ضوفشاں۔ عاصم بھائی نہیں!“ وہ شوخ لہجے میں بولی مہ جیس کو ہنسی آگئی جسے چھپانے کے لئے وہ سلائی مشین پر جھک گئی۔

’لڑکیوں..... کچھ رات کے کھانے کا بھی بندوبست کرنا ہے یا نہیں۔“ اماں ادھر ہی آرہی تھیں۔ ضوفشاں جھٹ پٹ چادر تہ کرنے لگی۔

’کیا کپے گا ماں؟‘ اس نے چادر تہ کر کے تخت کے کونے میں رکھی۔

’بھنڈی لی تھی صبح، پکا لوا چھی مسالے والی تھوڑی دال پکا لومونگ کی۔ پودینے اور زیرے کی چٹنی بنالو۔“

’اماں دو پہر کا آلو گوشت بھی رکھا ہے۔“

مہ جیس نے دھاگا توڑتے ہوئے کہا۔ ’’بلا وجہ اتنا ذخیرہ ہو جائے گا۔ دو دن باسی سالن ملے گا کھانے کو!“

’ارے تمہاری پھوپھی آرہی ہیں۔ کہلوا یا تھا انہوں نے۔ اب کیا دو پہر کا آلو گوشت رکھ دوں صرف۔“

’پھوپھی آئیں گی آج؟‘ ضوفشاں کا دل چوری سے دھڑکا۔ ’’کس کے ساتھ۔“

’آز رہی لائے گا.....‘ انہوں نے خیال پیش کیا۔ ’’اللہ جانے!“

’آز؟‘ ضوفشاں کے لب مسکرائے۔

’چلوڑ کیو! اب اٹھ بھی جاؤ..... آتی ہوں گی وہ۔“ اماں نے پھر کہا۔

وہ خوشی خوشی باورچی خانے کی سمت چل دی۔

مسالا بھوننے کے ساتھ ساتھ بھنڈیاں بھی کاٹنے لگی۔

’ضوفی..... میں روٹی پکا لیتی ہوں۔“ تھوڑی دیر میں مہ جیس بھی چلی آئی۔

’جی..... آپ کی قمیص مکمل ہوگئی؟‘

’ہاں ترپائی رہتی ہے۔ وہ تم سے کرواؤں گی!“

’جناب! اتنی فالتوں نہیں ہوں میں۔ مجھے ابھی اسائنمنٹ بھی تیار کرنی ہے اپنی۔“

’ہاں تو کل کر دینا۔ مجھے جلدی نہیں۔“ وہ ہنسی۔

’یہ آپ کی ہر قمیص کی ترپائی کرنا مجھ پر فرض ہے کیا؟‘ وہ جھنجھلائی۔

’تم سمجھو تو بڑی بہن کا کام آسان کرنا فرض ہی بنتا ہے تمہارا۔“ مہ جیس مسکرائی۔

’اللہ کرے جلدی سے شادی ہو جائے آپ کی، جان چھوٹے میری ان ترپائیوں سے۔“

’فکر نہ کرو جاتے ہی تمہیں بلوالوں گی۔“

’آپا۔“ اسے ہنسی آگئی۔

روٹی پکا کر مہ جیس باہر چلی آئی۔ وہ بیسن پر ہاتھ دھو رہی تھی جب ’’آداب“ کی شریر آواز نے اسے چوٹکا دیا۔

دونوں بازو، دروازے کے بائیں دائیں پھیلائے وہ مسکرا رہا تھا۔

’ولیکم آداب“ وہ ہنسی جیتے رہیں۔

’کیسی ہو؟‘

’اللہ کے فضل سے بہت اچھی ہوں۔“

”دعا کرو اللہ کا فضل ہم پر بھی جلد ہو۔“ وہ اندر آ گیا۔

”باہر جاؤ نا“ وہ گھبرائی ”یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”کاش کہ تم بڑی نہ ہوئی ہوتیں۔“ اس نے سرد آہ بھری ”چھوٹی تھیں تو کم از کم تمہارے ساتھ بیٹھنے کی تو اجازت تھی۔“

”تم باہر چل کے بیٹھو.... میں بھی وہیں آتی ہوں۔“ اس نے سمجھایا۔

”مجھے چائے چاہیے۔“

”اچھا.... لاتی ہوں۔“

”لاتی ہوں نہیں.... یہیں بناؤ میری نگاہوں کے سامنے۔“ وہ چیز بھی پر بیٹھ گیا۔

”آؤ را!“

”کتنا اچھا لگتا ہے میرا نام تمہارے لبوں سے۔“

”آؤ ریلیز.... ابا آگئے تو بہت برا لگے گا....“

”او کے جلدی سے باہر آ جاؤ۔“ وہ خلاف توقع مان گیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اس نے جلدی جلدی چائے بنائی اور رے لے کر باہر نکل آئی۔

آنگن میں آؤ را اور مہ جہیں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

”پھوپھی اور اماں کہاں ہیں؟“

”چھوٹے کمرے میں ہیں۔ ابا کے پاس۔“ مہ جہیں ہنسی۔

”کوئی خاص بات ہے؟“ وہ متحس ہوئی۔

”خاص الخاص۔ آؤ را طمینان سے بولا۔ ”امی تاریخ لینے آئی ہیں شادی کی۔“

”ہائے سچ۔“ وہ اچھلی۔ ”کتنا مزہ آگے گا نا۔“

”کتنا مزہ آگے گا نا۔“ آؤ را نے منہ بنا کر اس کی نقل اتاری ”پتا چلے گا محترمہ کو جب اکیلی پورے گھر کا کام کرو گی!“

”ہونہ۔.... میں کام سے نہیں گھبراتی۔“

”پھر کس سے گھبراتی ہو؟“ وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔

مہ جہیں نے کھنکار کر منہ دوسری جانب کر لیا۔

ضوفشاں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے ڈانٹا۔ وہ مسکراتے ہوئے چائے پینے لگا۔

”کل یونیورسٹی آؤ گی؟“ چائے پی کر اس نے پوچھا۔

”ہاں.... کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”بس یونہی۔“ اس نے کاندھے اچکائے۔

”ضوفی....!“ اماں باہر آ رہی تھیں ”بیٹا کھانا نہیں پکا کیا اب تک؟“

”کھانا تو تیار ہے اماں!“

”بس تو رگڑو دسترخوان.... انتظار کس بات کا ہے؟“

”اماں....“ وہ جوش سے ان کے نزدیک پہنچی۔

”اماں.... تاریخ ہو گئی طے؟“

”اماں نے غور سے اسے دیکھا اور ہنس دیں۔“

”ہاں ہو گئی۔ تجھے بڑا شوق ہے.....“

”کون سی تاریخ اماں.....“

”وہ پوچھتی رہ گئی۔ اماں مڑ کر واپس اندر کی جانب بڑھ گئیں۔“

”سب سمجھتا ہوں میں تمہیں کس بات کی جلدی ہے۔“ پیچھے کھڑے آذر نے سرگوشی کی۔

”کس بات کی بھلا“ اس نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

”مہ جبین باجی اور عاصم بھائی پنہیں گے تو اپنی باری آئے گی نا۔“

”افوہ..... خوش فہمی کی دلدل میں گردن تک پھنس گئے ہو.....“ وہ منہ بنا کر جانے لگی۔

”ذرا نکال دو۔“ اس نے ہاتھ پھیلا کر روکا۔

”شی..... پٹو او گے کیا؟“ وہ جھک کر اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکل گئی۔



اگلے روز وہ اسے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر لکرا گیا۔

”تم.....“ وہ چونک کر رہی۔

”ہوں۔ ذرا ساتھ چلو میرے۔“

”کہاں؟“ وہ ہوفی بنی۔

”جہاں بھی میں کہوں، بھگا کر نہیں لے جاؤں گا محترمہ کو۔“ وہ اس کے انداز پر چڑسا گیا۔

”آذر!“ وہ بے بسی سے بولی۔

اسے ایسی باتیں پسند نہیں تھیں۔ بالکل بھی نہیں تھیں۔ وہ لاکھ اس کا کزن تھا، اس کے گھر آتا جاتا تھا، لیکن اس وقت دیکھنے والوں میں کسی کو بھی اس بات کا علم نہ تھا۔ اس کے ساتھ اسے جاتا دیکھنے والے محض ایک لڑکے کے ہمراہ جاتا دیکھتے اور اسے اپنے کردار کی چمکیلی سفید چادر پر بدگمانی کی ایک معمولی سی چھینٹ بھی گوارا نہ تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ ہائیک کی چابی انگلیوں میں جھلاتا ہوا غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”سوری آذر۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔ ”میرا پیر یڈ ہے۔“

”اجالا.....“ اس کی آواز میں غصہ تھا، رنج تھا۔ وہ چپ چاپ سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ گھر آ کر بھی چپ رہی۔ وہ دو پہر کو سونے کے بجائے بیٹھک میں بیٹھی اپنے نوٹس بناتی رہی لیکن دماغ وہیں الجھا ہوا تھا۔

اسے اپنے رویے سے پیدا ہونے والے آذر کے جذبات کا احساس تھا، لیکن پشیمانی یا چھتاوا نہ تھا۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے سے قبل اسے علم تھا کہ آذر بھی وہیں پڑھتا ہے۔ لیکن اس نے اسی وقت اپنی حدود کا تعین کیا تھا۔ اس نے طے کیا ہوا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔

”چلو کزن۔“ آذر نے اس کا فارم جمع کروا کر خوش خوش کہا تھا ”اب رہا کرے گی ملاقات، ورنہ جس قدر تم اپنے ابا سے ڈرتی ہو.....“

”نہیں آذر.....!“ اس نے قطعی لہجے میں اس کی بات کاٹی تھی۔ ”اس غلطی فہمی میں کبھی مت رہنا کہ میں ابا سے ڈر کر اپنے اوپر پابندیاں بٹھاتی ہوں نہیں۔ بلکہ ابا نے تو مجھے کچھ کہا ہی نہیں، کوئی معمولی سا نصیحت بھرا جملہ بھی نہیں۔ انہیں از خود علم ہے کہ ان کی بیٹی کیا ہے انہیں مان ہے خود پر بھی اور مجھ پر بھی اور میں اس مان کو اس بھروسہ کو توڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ان کے کہے بغیر ہی میں نے ایک دائرہ اپنے گرد کھینچا ہے جس سے

میں ایک قدم بھی باہر نہیں نکالوں گی..... اور ہاں یورنیورسٹی میں صرف اور صرف پڑھنے جاؤں گی۔ وہاں مجھ سے کسی قسم کی پذیرائی کی کوئی توقع مت رکھنا۔“

”سوری اجالا۔“ وہ شرمندہ ہو گیا۔ ”مجھے علم ہے تمہارے بارے میں، تمہاری سوچوں اور تصورات کے بارے میں، میں خود نہیں چاہوں گا کہ کسی ایک زبان سے بھی تمہارے بارے میں کوئی غلط بات نکلے خواہ وہ میرے ہی حوالے سے کیوں نہ ہو!“

جانے اس نے اپنی وہ بات کیوں بھلا دی تھی۔

صوفشاں نے بین بے دلی سے پھینک دیا اور انگلیاں چٹخا نے لگی۔ آذر کی ناراضگی کا احساس اسکے دل و دماغ پر تھوڑے برسا رہا تھا۔ اس کا ماند پڑتا چہرہ، غصہ اور رنج سے بھرالہجہ بار بار اس کے ذہن میں در آتا۔

”اجالا.....!“

”کس طرح سے کہا تھا اس نے، رنج سے، تاسف سے۔ جیسے ٹوٹ سا گیا ہو، بکھر گیا ہو۔“

”کیوں کیا میں نے ایسا؟“

”پھر اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ اپنے انکار کے انداز پر افسوس ہوا۔ وہ اسے رسائیت سے بھی سمجھا سکتی تھی۔ اسے اس کا کیا عہد، اسی کے الفاظ میں یاد دلا سکتی تھی۔ لیکن اس نے تو اس طرح سے منع کیا تھا جیسے وہ آذر نہ ہو کوئی اور عام لڑکا ہو، جسے وہ جانتی ہی نہ ہو۔ دل کی بے چینی حد سے گزری تو وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔“

”اماں۔“ باہر آ کر اس نے تخت پر لیٹی اماں کو پکارا۔

”ہوں..... کہو.....“

”اماں میرا دل نہیں لگ رہا ہے گھر میں۔“ اس نے بڑے بڑے لہجے کے ساتھ کہا۔

”ہیں!“ وہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگیں۔

”گھر میں دل نہیں لگ رہا ہے؟ پھر کہاں لگے گا بیٹی؟“

”اماں۔ چلیں ذرا پھوپھی کے ہاں چلتے ہیں۔“

”اس نے منت کی۔“ بس تھوڑی دیر کو اماں۔“

”کل ہی تو آئی ہیں تمہاری پھوپھی۔ آج ہم چل دیں ان کے ہاں۔ کچھ دن ٹھہر کر چلیں گے۔“

”لو۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ جب دل چاہے تب نہ جاؤ اور بے دلی سے چل دو۔ میرا دل تو آج کہیں باہر نکلنے کا چارہ رہا ہے اور آپ کہہ رہی ہیں کچھ دن بعد، کیا ضروری ہے کہ میرا دل چاہے!“

”آدھا دن تو تم یورنیورسٹی میں گزار کر آتی ہو۔ پھر بھی باہر نکلنے کو دل کرتا ہے تمہارا؟“ اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”وہاں کیا میں تفریح کے لئے جاتی ہوں۔“ وہ چڑ گئی ”پڑھنے جاتی ہوں۔ آپ پڑھائی کو دل کا بہلاوا سمجھتی ہیں۔ ارے جان کا وبال ہوتی

ہے۔“

اماں ہنس دیں

”اچھا چلو، تیار ہو جاؤ۔ چلے چلتے ہیں..... بڑی محبت جاگ رہی ہے پھوپھی کی۔“

”اوہ۔ تھینک یو اماں۔“ وہ خوش ہو گئی۔

جلدی جلدی اس نے اپنا سوٹ استری کیا۔ نہادھو کر تیار ہوئی اور اماں کے پاس آ گئی۔ وہ بھی کپڑے تبدیل کر کے تیار تھیں۔

”چلیں اماں؟“ دھکتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس نے پوچھا۔

”چلو۔ میں نے کیا کرنا ہے مزید۔“ وہ کھڑی ہو کر چادر اوڑھنے لگیں۔

وہ لوگ پانچویں تو شام کے سائے دھیرے دھیرے اترنا شروع ہوئے تھے۔

پھوپھی جان عصر کی نماز سے فارغ ہو کر بیٹھی تھیں اور سامنے دھری نوکری میں رکھی ہوئی پالک صاف کر رہی تھیں۔

”آداب پھوپھی۔“ وہ اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر لپٹی۔

”جیتی رہو۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”اکیلی ہیں آپ؟“ اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔

”نہیں۔ عاصم تو ابھی گیا ہے کہیں۔ ہاں آذر ہے شاید اوپر کے کمرے میں وہ پڑھ رہا ہوگا کچھ۔“

”چائے پی لی آپ نے؟“ وہ بھی پالک صاف کروانے لگی۔

”کہاں بیٹی۔ اب اس عمر میں مجھ سے نہیں گھسا جاتا باورچی خانے میں منٹ منٹ پر۔ میں تو بس رات کا کھانا پکانے ہی گھسوں گی۔“

عاصم اور آذر خود ہی بنا لیتے ہیں تو میں بھی پی لیتی ہوں!“

”چلیں پھر آپ اور اماں باتیں کریں۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”وہ ہاتھ جھاڑتی باورچی خانے کی سمت چل دی۔ تاکہ جلدی جلدی چائے بنائے۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر آذر کو ان لوگوں کی آمد کا علم ہو گیا

تو وہ اسے جلانے کے لئے فی الفور گھر سے نکل جائے گا اور پھر اس وقت تک نہ لوئے گا جب تک کہ وہ واپس نہ چلی جائے۔ اسے آذر کے مزاج کے تمام پہلوؤں کا علم تھا۔

پھوپھی اور اماں کو چائے دے کر وہ ٹرے میں رکھا آذر کا کپ انگلی سے گھمانے لگی۔

”پھوپھی..... آذر کو چائے دینی ہے؟“

”آں؟ بیٹی دے آؤ..... اس نے بھی ابھی کہاں پی ہے شام کی چائے۔“

ضوفشاں نے ٹرے اٹھائی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اس کا دل ذرا تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آذر کو منانا

اسے دنیا کا مشکل ترین کام لگا کرتا تھا۔

چھت کی مغربی سائیڈ پر واقع واحد کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن پردے کی وجہ سے اندر کا منظر نگاہوں سے اوجھل تھا۔ ضوفشاں نے

چوری چوری ذرا سا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔

کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے، چہرہ چھت کی جانب کیے، وہ آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ سامنے میز پر رکھی کھلی کتاب کے ورق کھڑکی سے

اندر آتی ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ چین اس کی انگلیوں کے درمیان اس طرح جھول رہا تھا جیسے کسی بھی وقت نیچے زمین پر گر جائے گا۔ ضوفشاں

آہستہ سے پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی۔ دبے پاؤں چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچی۔ بڑی آہستگی سے ٹرے میز پر رکھ کر اس نے آذر کی بند پلکوں پر

دھیرے سے ہاتھ رکھ دیے۔

”اجالا.....“ وہ فوراً بے اختیار بولا اٹھا۔

اس نے ہاتھ ہٹا دیے اور مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آگئی۔

”تمہیں کیسے پتا چلا ہماری آمد کا؟“ وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”مجھے کیا پتا۔“ وہ بے رخی سے بولا۔

”پھر نام کیوں لیا تھا میرا؟“ اسے حیرانی ہوئی۔

”یونہی۔ بے ارادہ۔“ وہ اپنی کھلی کتاب کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”اوہ..... اس کا مطلب ہے میرے بارے میں سوچ رہے تھے۔“ وہ شوخی سے بولی۔

”ہاں۔ تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا!“ وہ صنفی پلٹتے ہوئے بولا۔

”اچھا۔ کیا سوچ رہے تھے۔“

”یہی کہ کس قدر بے مروت اور بے احساس ہو۔ دوسروں کے نازک جذباتوں کو بے دردی سے قدموں تلے روندتی ہوئی کس شان سے آگے بڑھ جاتی ہو۔“

”آذر!“ وہ بھگنی ”اتنے بدگمان ہو مجھ سے بس اتنا ہی جانتے ہو مجھے؟“

”جاننے لگا ہوں۔“

”تم خود صحیح اور غلط میں تمیز نہیں کر سکتے تو کم از کم دوسرے کے..... بارے میں اندازہ قائم کرتے وقت محتاط رہا کرو۔“ اسے اپنے بارے میں کہے گئے اس کے ریمارکس غصہ دلا گئے۔ ”تم آسانی سے ناراض تو ہو گئے لیکن کیا ناراض ہونے سے قبل تم نے یہ تجزیہ کرنے کی کوشش کی کہ صحیح کون تھا اور غلط کون؟“

”کیا غلطی کی تھی میں نے؟“ وہ بھی بھڑک اٹھا۔

”سرراہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر زبردستی لے جا رہا تھا کہیں؟ یا چلا چلا کر لوگوں کو بتا رہا تھا کہ دیکھو یہ ہے وہ لڑکی جو مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتی ہے۔ آخر تم اپنی ذات کے بارے میں اتنی کانشس کیوں ہو؟ کیا تم دنیا کی واحد لڑکی ہو؟“

”آذر!“ اس کی آنکھوں میں آنسو گئے۔ لبوں پر اس نے سختی سے دانت جما لیے۔

زندگی میں پہلی بار اس نے ضوفشاں سے اس قدر سخت الفاظ میں اور اتنے تلخ لہجے میں بات کی تھی۔ اسے شدت سے اپنی توہین کا احساس

ہوا۔

”کیوں رونے لگیں؟“ وہ تنہی سے ہنسا ”شاید اس لیے کہ میرے الفاظ سے تمہیں اپنی بے عزتی محسوس ہوتی ہو، لیکن یہ سب کچھ میں نے اس لیے کیا اجالا کہ تمہیں احساس ہو کر جنہیں چاہا جاتا ہے اور جن سے چاہت کا اقرار سنا جاتا ہے، ان کے ہاتھوں ہی جب توہین کے احساس کا تجربہ ملتا ہے تا تو اس تجربہ کو خاموشی سے قبول کر لینا بڑا مشکل امر ہے..... صبح جو کچھ تم نے کیا۔ تم تصور نہیں کر سکتیں کہ مجھے کس قدر ہتک محسوس ہوئی..... محبت کرنے والوں کو بڑا مان ہوتا ہے ایک دوسرے کی ذات پر..... بڑا حق سمجھتے ہیں اور اپنا اور جب یہ مان اور بھروسہ اچانک ہی جھوٹا لگنے لگے تو پھر دنیا کی ہر شے سے اعتبار اٹھنے لگتا ہے۔“

”آذر۔“ اسے احساس ہوا کہ وہ بے حد بکھرا ہوا تھا ”آئی ایم سوری.....“

”بے وجہ الفاظ ضائع مت کرو.....“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”تم تو حد سے زیادہ خفا ہو.....“

”کیا بے وجہ ہوں؟“ اس نے اپنی سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”معاف نہیں کرو گے؟“ اسے پھر رونا آ گیا۔

”پتا نہیں۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

”دیکھو آذر..... تم جانتے ہو کہ میں گھر سے باہر نکل کر اپنی ذات کے بارے میں کس قدر محتاط ہو جاتی ہوں.....“

”اتنی کہ دوسروں کی ذات کو خود انہیں کی نظروں میں گرا دیتی ہو.....“

”آذر پلیز..... میری بات تو سن لو۔“ اس نے منت کی۔

”کیا سن لوں؟ کیا میں تمہارے بارے میں نہیں جانتا؟ میں سب جانتا ہوں..... تمہاری ہر طرح کی سوچ سے واقف ہوں اور صحیح

میں تمہیں صرف اپنی بائیک تک لے جا رہا تھا جو میں باہر کھڑی کر کے آیا تھا..... جانتی ہو کیوں؟“

”کیوں؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”اسلئے کہ.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر جھک کر میز کا نچلا خانہ کھولا اور وہاں سے ایک بڑا سا بکس نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ اجالا نے آنسو پونچھ کر حیرانی سے اسے دیکھا۔

”میں تو صرف تمہیں پی پی برتھ ڈے کہنا چاہتا تھا۔“ وہ سر جھکا کر افسردگی سے بولا۔

”آج تمہاری سالگرہ ہے نا..... اور تمہیں پھول پسند ہیں..... اس لیے.....“

”صوفشاں سے ندامت اور تاسف کے گہرے احساس تلے دب کر کچھ بولنا ممکن نہ رہا۔ وہ خود بھی اسی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے کوئی

بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

دونوں کے درمیان خاموشی کے چند لمحات آ کر چپ چاپ گزر گئے۔

”آذر.....“ پھر اس نے آہستگی سے کہا۔

”ہوں.....“

”ابھی تک ناراض ہوا؟“ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”تم نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے اجالا..... مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہ لڑکی ہے جسے مجھ سے محبت کا دعویٰ ہے۔“

”پلیز، معاف کر دو.....“ صوفشاں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

پہلے تو وہ لمحہ بھر کو حیران ہوا پھر ہولے سے ہنس دیا۔

”یہ کیا حرکت ہے.....“

”بولو نا..... کرتے ہو معاف؟“

”ہاں بابا اب کھولو انہیں۔“

اس نے خود ہی اس کے ہاتھ پکڑ کر علیحدہ کر دیے۔

”دیکھو..... میں تمہارے لیے چائے لائی ہوں۔“ آنسو پونچھتے ہوئے اس نے مسکرا کر بتایا۔

”لائی ہو۔“ نہیں ”لائی تھیں“ وہ مسکرایا۔ ”عقل مند لڑکی۔! چائے کب کی ٹھنڈی ہو گئی ہے!“

”گرم کر کے لاتی ہوں۔“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے ڈانٹا ”نیچے گئیں تو امی اور ممانی پھر نہیں آنے دیں گی.....“

”آذر.....“ وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا غصہ بڑا خطرناک ہے۔“

”جلدی اتر جاتا ہے اس لیے؟“ وہ ہنسا ”کوئی اور ہوتا نا دس دن بات نہ کرنے والا، پھر قدر آتی تمہیں میری۔“

”سچ بڑے اجنبی لگنے لگتے ہو.....“

”اجنبی تو مجھے تم لگی تھیں صبح، دل چاہتا تھا ایک جھانپڑا سید کروں اس بوتھے پر اور لا حول پڑھ کر پلٹ جاؤں۔“

”تو کر دیتے۔“ وہ مسکرائی ”لیکن ایک بات سن لو..... آئندہ بھی اگر اس طرح کہیں لے جانے کی کوشش کرو گے تو میرا جواب یہی ہوگا۔“

”آئندہ میرے ابا جی کی توبہ جو غلطی سے کوئی آفر کی تمہیں.....“

”کتنے پیارے پھول ہیں۔“ اس نے پیارے پھولوں پر ہاتھ پھیرا۔

”کاش یہ بات تم نے صبح کبھی ہوتی، میرا دن بھی برباد نہ ہوتا۔ ایمان سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں اب تو۔ صبح سے حالت فاقہ میں

ہوں۔“

”تم نے اب تک کھانا نہیں کھایا؟“ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ناشتا تم کووش کرنے کی جلدی اور خوشی میں نہیں کر سکا تھا۔ پھر تم نے اتنی اچھی خوراک دے دی کہ دوپہر کا کھانا اسی چکر میں گول کر دیا۔ اب تک تو غم و غصہ نے بھوک کا احساس ہونے ہی نہیں دیا تھا۔ اب غصہ اتر رہا ہے تو نفقہ بہت طاری ہو رہی ہے۔“

”میں کھانا لاتی ہوں۔“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

”بیٹھ جاؤ یا ر۔ یقین کرو کچھ زیادہ بری نہیں لگ رہیں۔“

”پیٹ بھر کر کھانا کھاؤ گے تو بالکل نہیں لگوں گی۔“ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔



پوائنٹ سے اتر کر اس نے سانس درست کیا۔ سفید چادر سر پر اچھی طرح جمائی اور آگے بڑھ گئی۔ نسان سنی کے سائیڈ مرر میں اس کا چہرہ اس طرح ابھرا تھا جیسے صبح دھند چھٹنے پر کسی جھیل میں کھلا کنول اچانک نمایاں ہو جائے۔ کنول کے رخساروں پر شفاف شبنم چمک رہی تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے عالم شاہ نے نیم باز نظروں سے مر کو تادیر گھورا پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ گاڑی اس کی رفتار کے ساتھ آہستہ آہستہ حرکت میں آئی تھی۔

”آئیے۔ میں آپ کو چھوڑ دوں!“

”وہ جوانی دھن میں مگن آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ پہلے چونکی پھر حیرانی سے گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔

لائٹ گرین کلر کی نسان سنی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا وہ شخص نہ تو دیوانہ لگتا تھا اور نہ ہی چھچھورا۔ خمار آلود نظریں اس کے چہرے پر ٹکائے وہ بڑی سنجیدگی سے اپنی کہی ہوئی بات کے جواب کے منتظر تھا۔

”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“ اس نے قدرے بد مزاجی سے پوچھا۔

”میں نے کہا ہے کہ گاڑی میں بیٹھیں۔ میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔“

واہ۔ کیا انداز تھا۔ کیا لہجہ تھا۔ کیا شان بے نیازی تھی۔ جیسے وہ مری جا رہی تھی کہ کوئی گاڑی مددِ نجیبی کی مانند نازل ہوا اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔

”شکریہ!“ اس نے بے حد چبا کر محض ایک لفظ اس کے منہ پر زور سے مارا اور آگے بڑھ گئی۔

”سنو۔“ وہ پھر سر پر موجود تھا۔ ”مجھے انکار سننے کی عادت نہیں ہے۔“

”مجھے آپ جیسے بگڑے رئیس زادوں سے نپٹنے کی خوب عادت ہے۔“ وہ رک گئی اور زور سے بولی۔ ”یہاں سے رفو چکر ہوتے نظر آئیں ورنہ پورا محلہ آپ کی بے عزتی کا تماشا دیکھے گا۔“

تیز تیز قدم اٹھاتی وہ ایسی گلی میں مڑ گئی جہاں سید عالم شاہ کی کار کا داخل ہونا ممکن نہ تھا۔

اس نے دانت اس زور سے بھینچے کہ کپٹی کی رگیں پھول گئیں۔ گاڑی اس تیزی سے آگے بڑھائی کہ فضا دیر تک ٹائروں کے چرچرانے کی آواز سے گونجتی رہی۔



گھر میں تیزی سے داخل ہو کر اس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا پھر بند دروازے سے ٹیک لگا کر چند گہرے گہرے سانس لیے۔ دل اس تیزی سے دھڑک رہا تھا ابھی اچھل کر حلق میں آن پھنسے گا۔ ویسے تو اس نے بہادر اور نڈر بننے کی اپنی ہی کوشش کر ڈالی تھی لیکن اندر سے وہ کتنی وحشت زدہ ہوئی تھی یہ وہی جانتی تھی۔

”ضوئی!“ مہ جہیں کسی کام سے باہر آئی تھی۔ اسے یوں دروازے سے ٹیک لگائے کھڑے دیکھ کر حیران ہوئی۔ ”کیا ہوا ہے؟ ایسے کیوں کھڑی ہو؟“

”کچھ نہیں آپا!“ اس نے چادر کے پلو سے چہرے کا پسینہ خشک کیا۔ ”بس ذرا گرمی سے چکر آ گیا تھا۔“

”دیکھو تو ذرا کیسی پیلی رنگت ہو رہی ہے۔“ مہ جہیں نے غور سے اسے دیکھا۔ ”چلو اندر چل کر لیٹو۔ میں گلو کو زبنا کر دیتی ہوں۔“

پسینہ پسینہ ہوتے وجود کے ساتھ وہ کمرے میں آ کر بستر پر ڈھس گئی۔ پیر سینڈلوں کی قید سے آزاد کیے بغیر ہی بستر پر رکھ لیے۔

مہ جہیں نے آ کر اس کی سینڈلیں اتاریں اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا

”لو اٹھو۔ پی لویہ۔“ اس نے گلو کو زکا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔

ضوئی نے اٹھ کر ذرا سا گلو کو ز پیا اور پھر تنکے سے ٹیک لگالی۔

”اب تو ٹھیک ہونا!“ اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

”جی آپا!“ وہ مسکرائی۔ ”پریشان نہ ہوں۔ گرمی سے اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کیا پکایا ہے آج؟“

”پلاؤ پکایا ہے۔ لے آؤں؟“

”نہیں ابھی نہیں۔ ابھی تو میں سوؤں گی ذرا دیر۔ پھر اٹھ کر کھاؤں گی۔ اماں کہاں ہیں؟“

”مارکیٹ تک گئی ہیں۔ اب تو آتی ہی ہوں گی۔“

مہ جہیں دروازہ بند کر کے چلی گئی تو وہ پھر لیٹ گئی۔

”کون تھا وہ۔“ اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے چھت پر گھومتے بچے کو گھورا۔

”دھونس تو ایسے ہمارا تھا جیسے میں نے کبھی اپنے جملہ حقوق اس کے نام لکھ دیے ہوں۔ شکل سے اچھا خاصا ڈھنگ کا بندہ لگ رہا تھا اور

حکمتیں ایسی۔“

تادیر وہ اس واقعے کے بارے میں سوچتی رہی یہاں تک کہ اسے نیند آ گئی۔

شام کو وہ سو کر اٹھی تو کافی فریش ہو چکی تھی۔

دوپہر والے واقعہ کا خوف بڑی حد تک زائل ہو چکا تھا۔

”ہو گا یونہی کوئی غنڈہ۔“ چائے پیتے ہوئے اس نے سوچ کر بے فکری سے کاندھے اچکا دیے تھے۔

”ایک لڑکی اکیلی جاتی نظر آئی ہوگی تو اس نے سوچا ہوگا کہ ذرا سی غنڈہ گروی ہی کر لے۔“

”اپنی سوچ پر وہ خود ہی مسکرائی تھی۔

”کیا بات ہے۔ اکیلے اکیلے مسکرایا جا رہا ہے؟“ آذر اچانک اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

”ارے۔“ وہ چونک اٹھی۔ ”تم کب آئے؟“

”بس بھی۔ جب تم میرے بارے میں سوچ رہی تھیں۔“ اس نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”اچھا۔ بڑی خوش فہمی ہے جناب کو۔“ وہ ہنسی۔ ”اطلاعا عرض ہے کہ میں ہر گز تمہارے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔ اور جس کے

بارے میں سوچ رہی تھی اگر بتا دوں تو تپ کر رہ جاؤ گے۔“

”پھر رہنے ہی دو۔ میرا موڈ بہت ہی اچھا ہے اور میں بالکل تپنا نہیں چاہتا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر جیسے التجا کی۔

”چلو جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ بھی مان گئی۔ ”یہ بتاؤ کہ موڈ کیوں اچھا ہے؟“

”ارے واہ۔ ایسے ہی بتا دوں۔ بنا کسی رشوت کے۔“ وہ ہنسا۔

”میں کیوں رشوت دینے لگی تھیں؟ موڈ تمہارا اچھا ہے یا میرا؟“

”بات ہی ایسی ہے۔ سنو گی تو پھر کٹ اٹھو گی۔“ اس نے لپٹایا۔

”نہ بابا۔ مجھے نہیں پھر کٹنا۔ اس نے منہ بنایا۔

”اچھا نہ سہی۔“ اس نے کاندھے اچکائے۔ ”ویسے خبر بڑی اہم ہے۔ توپ کا گولہ۔“

”چلو بتاؤ۔ کیا رشوت لو گے؟“ وہ تجسس کے ہاتھوں بار مان گئی۔

”بس آگئیں لائن پر“ اس نے قہقہہ لگایا۔

”آذر!“

”اچھا بابا۔ بتاتا ہوں۔ چلو ایس کرو۔ کوئی مزید اسی چیز کھلانے کا وعدہ کرو۔“

”اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی؟“

”نہیں بھئی۔ ابھی مرنا نہیں ہے۔ بازار سے منگوا کر کھلانا۔“ وہ شرارت سے ہنسا۔ ضوفشاں نے اسے گھور کر دیکھا۔

”گھورومت۔ میرا دل ویسے ہی بہت کمزور ہے۔“ اس نے سمجھنے کی اداکاری کی۔

”اب بتاؤ بھی آذر۔“ اس کا صبر جواب دے گیا۔

”جو کہو گے کھلا دوں گی۔“

”پر اس؟“

”ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔“ وہ چیخنی۔

”تو سنو۔ کان ادھر لاؤ۔ بات راز کی ہے۔“ وہ پراسرار بنا۔

”ایسے ہی بتا دو۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”اوہ ہوں۔“ اس نے نفی میں سر بلایا۔

صاف لگ رہا تھا، وہ اسے ستانے کیلئے ایسا کر رہا ہے۔ ضوفشاں نے دانت پیس کر اسکی شریر مسکراہٹ کو دیکھا اور کان اس کی جانب کیا۔
”فرمائیے۔ لیکن ذرا جلدی۔“

”آہم۔“ وہ اس کے کان میں کھنکارا، پھر آہستگی سے بولا۔ امی آج ممائی سے تمہارا رشتہ مانگنے آرہی ہیں۔ میرے لیے۔“
ضوفشاں کا صرف کان ہی نہیں پورا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بے یقینی سے اس نے آذر کی سمت دیکھا۔
”کیا۔ کیا کہا؟“

”پھر سنو گی؟“ وہ شرارت سے ہنسا۔ ”ہاں بھئی، بات ہی ایسی ہے!“
”دیکھو پلیز۔ تنگ مت کرو۔“ اس نے التجا کی۔ ”بتاؤ ناں پوری بات۔“
”کون سی بات۔“ مہ جہیں آذر کے لیے چائے لائی تھی۔ متوجہ ہو کر پوچھنے لگی۔
”آپا۔ دیکھیں ناں کتنا بد تمیز ہے یہ۔“ وہ روہانسی ہوئی۔

”کیا بات ہے بھئی۔ کیوں تنگ کر رہے ہو میری بہن کو؟“ مہ جہیں نے اس کا کان پکڑا۔
”ارے۔ ارے مہ جہیں باجی۔ یہ جانبداری اور اقرار پروری کا عظیم الشان مظاہرہ بند کریں۔ بتاتا ہوں میں۔“
مہ جہیں اس کا کان چھوڑ کر ضوفشاں کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”امی صبح ابا جان کو بتا رہی تھیں کہ آج شام وہ آپ لوگوں کے گھر آرہی ہیں۔ ضوفنی کا رشتہ میرے لیے مانگنے کے لیے۔“ اس نے
کا لڑکھڑے کیے۔ ”میں نے سوچا۔ کیوں نہ امی سے پہلے پہنچ کر سر پر اندر دے دیا جائے۔“
”لیکن پھوپھی جان کس کے ساتھ آئیں گی؟“ مہ جہیں نے پوچھا۔
”ابا جان کے ساتھ۔ آپ کیا سوچ رہی ہیں؟“ وہ شرارت سے پوچھنے لگا۔
”کچھ نہیں۔“ وہ جھینپ گئی۔ ”میں بھلا کیا سوچوں گی۔“
”پھوپھی جان کو اچانک یہ خیال کیسے آ گیا؟“ ضوفشاں گہری سوچ میں گم تھی۔
”ارے کیسے بھی آیا۔ آیا تو۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ مہ جہیں کو ہنسی آ گئی۔
”آپ دونوں کے لیے اطلاع ہے کہ جو کچھڑی آپ دونوں نے مل کر پکائی ہے۔ اس کی خبر سب کو ہے۔“
وہ بولی۔ ”پھوپھی جان اور اماں ہم سے ڈبل عمر گزار چکی ہیں اس دنیا میں۔ اماں تو کئی بار مجھ سے اس سلسلے میں بات کر چکی ہیں۔“
”کیا بات؟“ ضوفشاں متحسّس ہوئی۔

”یہی کہ آذر اور ضوفنی بھی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور نگار کا ارادہ بھی لگتا ہے ضوفنی کو مانگنے کا۔ کہہ رہی تھیں کہ انہیں کوئی اعتراض
نہیں ہوگا اور نہ ہی ابا کو۔“ مہ جہیں نے دونوں کو اماں کے خیالات سے آگاہ کیا۔
”بس تو پھر ملاؤ ہاتھ۔“ آذر نے ضوفشاں کی سمت ہاتھ بڑھایا۔
وہ منہ چڑھا کر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

”دیکھا جہیں بابی، کتنی بد تمیز لڑکی ہے!“ وہ بھنایا۔
”سوچ لو۔ ساری عمر یہی بد تمیزیاں سہو گے۔ ابھی بھی وقت ہے غور و خوض کر لو۔“
”چلیں کوئی بات نہیں۔ جیسے عاصم بھائی آپ کو کہیں گے۔ ایسے ہی میں بھی۔“
”پنو گے آذر۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”ویسے مجھے تو مزاتب آگے گا جب اماں، ضوفنی کو تم سے پردہ کرائیں گی۔“

”ناممکن۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں ممافی جان سے خود بات کر لوں گا اس سلسلے میں۔ ارے ہم جی دار لوگ ہیں۔ کوئی عاصم بھائی کی طرح تھوڑا ہی ہیں کہ میدان چھوڑ کر بھاگ لیں۔“

”ہاں ہاں دیکھوں گی تمہاری جی داری بھی۔“ وہ ہنسی۔ ”یہ جو بیٹھ کر پڑ پڑ باتیں بگھارتے ہونا۔ بولتی بند کر دیں گی اماں اور پھوپھی جان۔“

”وہ بیٹھا ہنستا رہا۔ فقرے اچھا لٹا رہا۔

رات نے اپنے پر پھیلائے ہی تھے جب پھوپھی جان اور پھوپھا مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ آ گئے۔

”اچھا تو نوابزادہ یہاں براجمان ہیں۔“ پھوپھی نے اسے دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پھیلا کیں۔ ”ہضم نہ ہو سکی خوشی تجھ سے؟“

”کہاں امی۔“ وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔ ”پیٹ میں درد کر دیا۔ دوڑ آیا یہاں۔“

باورچی خانے میں بیٹھی ضوفشاں بھی ہنسنے لگی۔

گھر کی بات تھی جس کا سب کو ہی پہلے سے علم تھا۔ نہ پھوپھی جان نے کسی خاص انداز سے بات چھیڑی نہ ہی اماں یا ابانے کچھ کہا۔ سب خوش دلی سے ہنستے مسکراتے باتیں کرتے رہے۔

مہ جہیں اور عاصم کی شادی کی تاریخ پہلے ہی چھ ماہ بعد کی رکھی جا چکی تھی۔ اماں اور پھوپھی اسی کی تیاریوں کی باتیں کرتی رہیں۔ ابا اور پھوپھا سیاست کی جانب نکل گئے۔

وہ اطمینان سے باورچی خانے میں چلا آیا۔

”لڑکیو۔ کیا پکار رہی ہو سسرالی رشتے داروں کے لیے؟“ اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر دریافت کیا۔

”سسرالی رشتے دار ہوں گے تمہارے۔“ مہ جہیں چڑی۔ ”ہمارے تو پھوپھی اور پھوپھا جان ہیں۔“

”واہ بھئی۔ ہماری بھابھی تو بڑی ڈپلومیٹک ہیں۔“ وہ خوش دل سے ہنسا۔ ”دیکھا ضوفنی تم نے؟“

ضوفشاں خاموشی سے روٹیاں پکاتی رہی۔

آذر اسے سب کے سامنے ضوفنی اور اکیلے میں ہمیشہ اجالا کہہ کر پکارتا تھا۔ نجانے کون سا کمپوٹرفٹ تھا اس میں جو موقع کی مناسبت سے وہ بالکل بالکل صحیح نام لیا کرتا۔ بے ساختہ اور لاشعوری طور پر بھی۔ اس نے اکیلے میں ضوفشاں کو کبھی ضوفنی یا ضوفشاں نہ کہا تھا۔ ہمیشہ ہی اجالا کہا کرتا۔ یہ نام اس نے ضوفشاں کو خود ہی دیا تھا۔

”تمہیں دیکھ کر سورج کی سنہری اور چاند کی روپیلی روشنی کا خیال آتا ہے۔ جیسے تمہارا وجود کرنوں سے مل کر بنا۔ تمہیں دیکھنے سے میری آنکھوں میں روشنیاں سی بھر جاتی ہیں۔ میرے ارد گرد اجالے لکھر جاتے ہیں میں تمہیں اجالا کہا کروں گا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“

اس نے بہاروں کی ایک بڑی خوب صورت سی شام میں اس سے پوچھا تھا اور وہ سر جھکا کر ہنس دی۔ وہ شام، اس کی پرچھائیاں آج بھی ضوفشاں کی خوب صورت آنکھوں میں موجود تھیں۔

”کیا سوچنے لگیں کزن؟“ اس نے دروازہ بجایا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ چونک کر روٹیاں دسترخوان میں لپیٹنے لگی۔

کھانا سب نے مل کر کھایا۔ ضوفشاں کو شبہ تھا کہ اب شاید اماں اسے آذر سے ذرا کم میل جول کے لیے کہیں گی۔ لیکن انہوں نے نہ ضوفشاں کے سب کے ساتھ مل کر کھانا کھانے پر اعتراض کیا اور نہ ہی آذر سے نوک جھونک کرنے پر۔ حالانکہ مہ جہیں کو عاصم کے سامنے نہ آنے کی ہدایت اماں نے اسی وقت کر دی تھی جب انہیں پھوپھی جان کے ارادوں کا علم ہوا تھا۔ جاتے وقت انہوں نے ضوفشاں کی پیشانی چوم کر اس کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھما دیے۔

”یہ کیا ہے پھوپھی؟“ وہ جزبہ ہوئی۔

”شگون ہے بیٹی۔ خدا تم دونوں کا ساتھ مبارک کرے۔ خیر و عافیت کے ساتھ میری بیٹیاں میرے گھر پہنچیں۔“

ضوفشاں نے چوری چوری آذر کو دیکھا۔ وہ بڑی شان سے مسکرا رہا تھا۔ جلدی سے پلٹ کر وہ اندر آگئی۔ کمرے کی کھڑکیاں کھول کر باہر نکلی۔ گلی میں جھانکنے لگی۔

رات اسے بڑی خوشگوار، بڑی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ دل کی تمام کلیاں ایک ساتھ کھل رہی تھیں۔

”ہوں۔ تو محترمہ اب تک خیالوں میں گم ہیں۔“ مہ جہیں تمام کام پنا کر اندر آئی تو اسے اسی طرح گم سم بیٹھا دیکھ کر شرارت سے بولی۔

”نن..... نہیں۔“ وہ چونک گئی۔ ”میں تو یونیورسٹی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“

اسے سب سے پہلے یہی بات سوچھی، سو کہہ گئی۔

”یہ کہ کل آذر سے وہیں ملاقات ہوگی؟“

”اوں ہوں۔ آپا!“ اس نے جیسے سرزنش کی۔ ”آپ بھی یہی سوچتی ہیں؟“

”ارے نہیں۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔“ وہ جلدی سے معذرت کرنے لگی۔

”ضوفشاں مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔“



اگلے چند دن اس کے بے حد مصروف گزرے تھے۔ مہ جہیں کو جہیز کی تیاری کے لیے کچھ چیزیں خریدنی تھیں اور اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں

تھی۔ سو ضوفشاں نے تین دن یونیورسٹی سے چھٹی کر کے اس کے ساتھ بازار کے چکر لگائے۔

”آپا۔ تھکا مارا ہے آپ نے تو؟“ گنے کا جوس پیتے ہوئے اس نے شکایت کی۔

”تم تو ڈبل تھکاؤ گی مجھے۔“ مہ جہیں نے آنکھیں نکالیں۔ ”تمہاری تو بری کی تیاری بھی مجھے ہی کرنی ہوگی۔“

ضوفشاں کھلکھلا کر ہنس دی۔

”خواتین۔ یہ بازار ہے۔ یہاں سرعام قہقہے نہیں بکھیرتے“

”ایں تم یہاں بھی ٹپک پڑے؟“ مہ جہیں نے بھنا کر سر پر کھڑے آذر کو دیکھا۔

”یہاں بھی سے کیا مراد ہے آپ کی؟“ اس نے برامان کر اسے دیکھا۔ ”میں اتنا تو نہیں آتا آپ کے گھر۔“

”اس سے بھی زیادہ آنا چاہتے ہو؟“ اس نے مزید حیران ہونے کی اداکاری کی۔

”میری توجہ ہی اتنی زبردست ہے۔“ اس نے ضوفشاں کو غور سے دیکھ کر مہ جہیں کو چڑانے کے لیے کہا۔ ”عاصم بھائی بے چارے کیا

کرنے آئیں آپ کے گھر۔“

”ارے وہ شریف آدمی ہیں۔“ مہ جہیں ہنسی۔

”تمہاری طرح چھپھورے تھوڑے ہی ہیں جو دن رات سسرال میں موجود ہیں۔“

”دیکھتی ہو کزن اپنی آپا کو۔“ وہ لا جواب ہو کر اس سے الجھ پڑا۔

”مجھ سے کیا کہتے ہو۔“ وہ مسکرا دی۔ ”بھابی ہے تمہاری۔ لڑو جتنا چاہو۔“

”صرف بھابھی ہی نہیں سالی بھی ہوں۔ اس رشتے سے بھی دودو ہاتھ کر سکتی ہوں تم سے۔“

”ویسے تم کیا خریدنے آئے ہو؟“

”میں۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔ اور ایک گہری نظر ضوفشاں پر ڈالی۔ ”ایک خاص چیز خریدنے آیا تھا کسی خاص شخصیت کے لیے۔“

”لے لی پھر؟“ مہ جہیں نے پوچھا جبکہ ضوفشاں تجسس سے بے تاب ہو گئی۔

”ہاں لے لی۔“ اس نے جیب تھپتھپائی۔

”کیا ہے آذر۔“ بالآخر اس سے صبر نہ ہوا بے حد اشتیاق سے پوچھ ہی لیا۔

”سر پرانز ہے۔“ وہ ہنسا۔

”بتا دوں ناں پلیز۔“ اس نے منت سے کہا۔ اسے شک بلکہ یقین تھا کہ آذر نے جو کچھ بھی لیا تھا اس کا تعلق اسی کی ذات سے تھا۔

”رہنے دو ضوفنی، اور اکڑ جائیں گے محترم!“

”مہ جہیں نے بے فکری سے ہاتھ ہلایا۔ ”تمہارے لیے کوئی گفٹ لیا ہوگا خود ہی لا دیں گے ایک دودن میں۔“

”کیوں بھئی۔ اسی کے لیے کیوں۔“ وہ جرح پر اتر آیا۔ ”ممکن ہے آپ کے لیے کچھ ہو۔ عاصم بھائی نے منگوا لیا ہو۔“

”اپنے ایسے نصیب کہاں۔“ مہ جہیں جل کر بولی تھیں۔ ”ان سے تو ہر چیز بعد میں، میں خود وصول کروں گی مانگ مانگ کر۔“

آذر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”بتاؤ ناں آذر کیا ہے۔“ ضوفشاں کے دماغ کی سوئی وہیں انگی ہوئی تھی۔

”چلو اشارہ دے دیتے ہیں۔“ اس نے دریا دلی دکھائی۔ ”جو کچھ لیا ہے۔ تمہارے لیے ہی ہے۔“

”واقعی۔ کیا ہے؟“ وہ کھل اٹھی۔

”جلد ہی پتا چل جائے گا۔“ مسکرایا۔ ”امی سے بھجوا دوں گا۔ اوکے گرلز۔ بائے بائے۔“

”وہ ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گیا۔“

”بد تمیز۔“ ضوفشاں دانت پیس کر رہ گئی۔ ”پتا ہے ناں مجھے بے چینی رہے گی تو کیسے جلدی سے چلتا بنا ورنہ گھنٹوں کھڑا باتیں کرتا رہتا۔“

”تو بہ ہے ضوفنی تم سے بھی۔“ مہ جہیں ہنس دی۔ ”ذرا صبر سے کام نہیں لے سکتیں کیا؟ اتنا تجسس کیوں بھرا ہوا ہے۔ آخر تم میں۔“

”آپا۔ بتائیں ناں۔ کیا لیا ہوگا اس نے میرے لیے؟“

”میٹھا پان۔“ وہ جھلائی۔ ”اب کھسکو۔ گھنٹہ بھر لگا دیا یہیں کھڑے کھڑے۔ اماں کا پتا نہیں ہے کیا۔ برے برے خیال آرہے ہوں گے

انہیں۔“

دونوں سامان سنبھالتی آگے بڑھ گئیں۔



وہ تین دن کے بعد یونیورسٹی آئی تھی اور لیکچرر کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔

”سنو فرح۔ ڈاکٹر مختار کے پچھلے دو لیکچرز چاہئیں مجھے۔“ اس نے فرح کو سیڑھیوں پر پکڑا۔ ”میں آنہیں سکی تھی ناں۔“

”ڈاکٹر مختار کی کلاسز تو میں نے بھی نہیں لیں۔“

”اس نے افسوس سے شانے ہلائے۔“ تم عاصمہ سے مل لو ناں۔ اس کا تمہیں پتا ہے ایک ایک حرف اتارتی ہے ہر پروفیسر کی زبان سے

نکلا ہوا۔“

”عاصمہ ہے کہاں؟“ اس نے پوچھا۔ ”نظر تو نہیں آئی وہ مجھے۔“

”بائنی ڈیپارٹمنٹ گئی ہے۔ کسی لڑکی سے ملنا تھا اسے!“

”بائنی ڈیپارٹمنٹ!“ اس نے زیر لب دہرایا، اور باہر کی جانب بڑھ گئی۔

ماتھے پر فائل لٹائے، بڑی بے فکری سے وہ خراماں خراماں بائنی ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جب ایک سایہ اس کے عقب سے

ابھرا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

اس نے بد مزگی سے گردن گھمائی اور جیسے اس کے قدموں نے مزید چلنے سے انکار کر دیا۔ بے ساختہ اور بے ارادہ اپنی جگہ رک گئی تھی۔

”آپ؟“ خود اس کی زبان سے نکلا۔

”پچھانتی ہوں مجھے؟“ اس کے لبوں پر آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ بڑے رعب سے اس نے سوال کیا جیسے جواب دینا اس پر فرض ہو جائے گا۔

”مجھ سے اور میرے نام سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“ وہ کڑے لہجے میں بولی۔ ”کیوں پچھالے لیا ہے آپ نے میرا؟“

اس نے اپنے سوال کا جواب سنے بغیر آگے قدم بڑھا دیے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ صوفشاں تیز تیز چل رہی تھی جبکہ وہ انتہائی

اطمینان سے خراماں خراماں چلتا ہوا بھی مسلسل اس کے برابر تھا۔ ”دیکھیں مسٹر پلینز جو کوئی بھی آپ ہیں“ وہ جیسے ہار کر پھر رک گئی۔

”مجھے عالم شاہ کہتے ہیں۔“ گردن کا ہلکا سا خم دے کر اس نے اپنا تعارف کرایا، گویا یہ ملاقات صوفشاں کے لیے بڑی مسرت کا باعث ہو۔

”مسٹر عالم شاہ۔ یہ کوئی شارع عام نہیں۔ تعلیمی ادارہ ہے۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”دوستی کرو گی مجھ سے؟“ اپنی خمار آلود سرخ آنکھیں اس کی آنکھیں میں ڈال کر اس نے پوچھا۔

”دوستی؟“ حد درجہ تعجب سے اس نے دہرایا۔

”مگر کیوں؟ میں بھلا کیوں ایک انجان، غیر شخص سے دوستی کر لوں؟“

”دوستی کرنے سے قبل سب غیر اور انجان ہوتے ہیں۔ بعد میں آشنا ہوتے ہیں ایک دوسرے کی ذات سے۔“ وہ جیسے اس کی کم عقلی

پر مسکرا رہا تھا۔

”بڑی مدہم، بڑی ہلکی مسکراہٹ لمحہ بھر کو اس کے لبوں پر چمکی تھی۔ جیسے پل بھر کے لیے بجلی کو بند جائے۔“

”مجھے آپ کی یا کسی بھی دوسرے غیر مرد کی ذات سے آشنائی پیدا کرنے کا کوئی شوق فضول نہیں۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ ”ایسی

آفر زان کو دیں جن سے جواب میں کچھ ملنے کی توقع ہو۔ میں آپ کی کوئی بھی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔“

”سمجھتی کیا ہو خود کو تم؟“ وہ سلگ کر رہ گیا۔ چہرے پر کئی سائے آ کر گزر گئے۔

”میں نے آپ کو کچھ سمجھنے پر مجبور نہیں کیا مسٹر۔ جو کچھ میں خود کو سمجھتی ہوں اس سے آپ کا کچھ نہیں بگڑتا۔“

کھٹ کھٹ کرتی وہ آگے بڑھ گئی۔ دونوں ہاتھ کمر میں رکھے وہ اسے دور جاتے دیکھتا رہا پھر ایڑیوں پر گھوم گیا۔

سلگتے تپتے ذہن کے ساتھ صوفے پر بیٹھا چھت پر لٹکے فانوس کو گھور رہا تھا۔ بچھی ہوئی منٹھیاں بار بار کھلتیں اور پھر بند ہو جاتیں۔ سرخ ہوئی آنکھیں میں وحشت سی ناچ رہی تھی۔

”سمجھتی کیا ہے خود کو۔ کیا؟ کیا؟“

”وہ تملما کراٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ لیکن آگ تھی کہ مزید سلگتی چلی جا رہی تھی۔ دھواں تھا کہ حلق تک آ رہا تھا دم گھونٹ رہا تھا۔

مکرم علی کی ہمراہی میں اندر آتے فہد کو وہ ایک بھوکے شیر کی مانند لگا انتہائی غصے کی حالت میں پنجرے میں چکرار رہا تھا۔

مکرم علی اس کو چھوڑ کر اپنے قدموں لوٹ گیا۔

”عالم۔ یا رکھا ہوا ہے؟“ وہ آگے بڑھا۔

جواب اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

”غصے میں لگتے ہو؟ مجھے بلایا تھا تم نے؟“ وہ پریشان ہو گیا۔

”تم نے ہی بتایا تھا ناں مجھے اس کے بارے میں کیوں بتایا تھا؟“ وہ جیسے پھٹ پڑا۔

”کس کے بارے میں؟“ وہ حیران ہوا۔

”اس ابرنیساں کے پہلے قطرے کے بارے میں جو تیزاب سے زیادہ کاٹ دارا دھلکا دینے والا ہے۔ فہد۔ فہد۔ میری انسلٹ کرنے کی

آج تک کسی کی ہمت نہیں ہوئی۔“

”اوہ۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”یا عالم! میرا کیا قصور ہے اس میں۔ تو نے اپنے آئیڈیل کے بارے میں بتایا تو یونہی مجھے اس کا

خیال آ گیا۔ میں تو اسے جانتا تک نہیں۔ میں نے بتایا تھا ناں میری ماموں زاد بہن کی سہیلی ہے۔ اس کے محلے میں رہتی ہے۔ میں نے خود ایک جھٹک

دیکھی ہے اس کی۔ تم نے ضد کی تو میں نے سہیلی سے معلومات حاصل کر کے دے دیں تمہیں کہ کون سا گھر ہے اس کا اور کہاں پڑھنے جاتی ہے۔ میں کیا

جانوں اس کے بارے میں۔ ملے تم اس سے؟“

”ہاں۔“ وہ پھنکارا۔ ”ملا، اور اس کا بھلا اسی میں ہے کہ وہ آئندہ مجھے، کہیں نظر نہ آئے۔“

”ایسا کیا کر دیا اس نے؟“ وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔

”میں نے اسے دوستی کی آفر کی۔ خود اپنے منہ سے عالم شاہ نے اس سے یہ بات کہی اور۔ اور اس کی ہمت دیکھو۔ صفائی سے انکار کر دیا

اس نے۔“ وہ تملمایا۔

فہد نے بے حد پریشانی سے اپنی ذات کے حد درجہ احساس میں مبتلا اس امیر زادے کو دیکھا۔ دولت کے نشے نے جس کی آنکھوں پر

رعونت اور غرور کی ایسی پٹی باندھ رکھی تھی کہ اسے سوائے اپنی ذات کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

”لیکن عالم۔ وہ تمہارے بارے میں کچھ جانتی بھی تو نہ ہوگی۔“

”مجھے جاننے کے لیے میرا سامنے ہونا کافی ہے۔“ اس نے انگوٹے سے سینہ ٹھونکا۔

”یار۔ جس طبقے سے اس کا تعلق ہے ناں وہاں کی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں، ڈری سہمی، بزدل اور شرمیلی۔“ اس نے عالم شاہ کے کان دھے

پر ہاتھ رکھ کر رسائی سے سمجھایا۔

”میں انہیں اچھی طرح سمجھتا ہوں ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے محض ایک بار ان کے سامنے جانا کافی نہیں ہوتا۔ بار بار اپنی ذات

کے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”توجہ؟“ وہ ہر خند لہجے میں ہنسا۔ ”اس کی خوش قسمتی تھی کہ سید عالم شاہ نے کچھ دیر کو اس پر توجہ کی۔ اپنے در پر آئی خوش قسمتی کو اس نے خود ٹھوکر مار دی ہے۔“

”چلو دفع کرو پھر کیوں بیکار جان جا رہے ہو۔ اس قابل ہی نہیں تھی وہ۔“

”میں چاہوں تو ابھی دو آدمی بھیج کر اسے اپنے قدموں میں لایٹھاؤں۔“

”بھول جاؤ یا ر۔ دنیا میں لڑکیوں کی کمی تو نہیں۔“ فہد ڈر گیا۔

”سمجھتی کیا ہے خود کو۔ مائی فٹ۔“ اس کی جھلک کم ہوتی اور پھر بڑھ جاتی۔

”ارے یار! تو ہمیں حکم تو کر۔ ایک سے ایک ہیرا پڑا ہے محض تیری ایک نگاہ التفات کے لیے۔“ فہد نے ہنس بول کر ماحول کی کشیدگی کو کم

کرنا چاہا۔

”وہ خاموش بیٹا ٹھنڈے پانی کے گھونٹ بھرتا رہا۔“

”زارا کو تو جانتا ہے ناں تو۔ وہی گھٹنگھریا لے بالوں والی لڑکی۔ محمود کے ہاں پارٹی میں ملوایا تھا لشکر نے تجھ سے۔ کب سے جان کھا رہی

ہے لشکر کی کہ ایک بار پھر تجھ سے ملو اوے۔ پہلی نگاہ میں فریفتہ ہو گئی تھی پر۔“

”لعنت بھجواس پر۔“ اس نے آنکھیں موند کر پیشانی پر ہولے سے مکے مارے۔

”بے کار لڑکی ہے۔“

”ہاں پسند تو مجھے بھی نہیں ہے۔“ وہ فوراً بولا۔ ”میں نے تو یونہی ذکر کر ڈالا۔“

”اسے کسی بات کا غرور ہے؟“ وہ اچانک پھر سلگ اٹھا۔

”بس یار! اپنی اپنی نیچر ہوتی ہے ناں ہر انسان کی۔ بعض لڑکیوں کو عادت بھی ہوتی ہے ناں بے وجہ کے نخرے دکھانے کی۔ پھر لائن پر

آ جاتی ہیں۔“

نجانے کیوں اس نے آنکھیں کھول کر فہد کو گھورا۔ وہ گڑ بڑا سا گیا۔

”ویسے میں نے غلط کہا تھا کیا؟ تمہاری سوچوں جیسی ہی لگتی ناں؟“

”سید عالم شاہ اس بات پر پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ہونٹ بھینچ گئے۔ گہری سرخ آنکھیں مزید بوجھل ہو گئیں۔“

سامنے بکھرے کاغذات کو اس نے بے دلی سے سمیٹا اور فائل میں قید کر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ کھلے بالوں میں ہولے ہولے انگلیاں چلاتے ہوئے وہ کسی گہرے خیال میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کڑھائی کرتی مہ جیس نے کوئی دسویں مرتبہ اس کا بغور جائزہ لیا۔ وہ پریشان پریشان سی لگ رہی تھی کھوئی کھوئی سی تھی۔ ایک گھنٹہ قبل وہ پڑھنے کا مواد اکٹھا کر کے بیٹھی تھی اور اس نے غالباً ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ مسلسل کسی سوچ میں گم تھی۔

”ضوئی۔“ اس نے دھاگا توڑتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”اوں۔“ وہ چونک اٹھی۔ ”جی آپا۔ کہیے۔“

”کیا سوچ رہی ہو؟“ اس نے سرسری سا پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ بس پڑھنے کا موڈ نہیں بن رہا؟“ اس نے سر جھٹکا۔

”پریشان سی لگ رہی ہو۔“

”نہیں تو۔“ وہ بے وجہ ہنس دی۔ ”میں بھلا کیوں پریشان ہونے لگی۔“

”سچ کہہ رہی ہو؟“ اس نے قیص میں سوئی لگا کر ای طرف رکھ دی۔ ”یا بھلا واوے رہی ہو مجھے، مجھے تو تم پچھلے کئی دنوں سے ایسی ہی لگ

رہی ہو۔ پریشان پریشان۔ بے کل بے کل۔“

”وہم ہے آپ کا۔“ وہ مسکرائی۔ ”کوئی بات میں بھلا آپ سے کیوں چھپاؤں گی۔ ویسے بھی میں ذرا آذر کا سوچ رہی تھی۔ کتنے دنوں

سے نہیں آیا ناں۔“

”ہاں۔ کافی دن ہو گئے۔ شاید پھوپھی نے کہا ہوا آنا جانا کم کرنے کا۔ لیکن اماں نے تو کوئی اعتراض نہیں کیا تم لوگوں کے آپس میں ملنے یا

بات کرنے پر۔ ارے کہیں بے قوف میری اس روز والی بات کو نہ دل پر لے گیا ہو۔ بازار میں، میں نے محض مذاق میں اس سے کہہ دیا تھا ناں کہ تم روز

روز آ جاتے ہو۔ وغیرہ۔“

”نہیں آپا۔ آپ کے مذاق کا وہ کبھی برا نہیں مانتا۔ ویسے ہی مصروف ہو گا۔ سمسٹر بھی تو قریب ہیں ناں۔“

”اس دن اس نے تمہارے لیے کچھ خریدا بھی تو تھا۔ دینے ہی آ جاتا۔“

وہ محض مسکرا کر رہی گئی۔ مہ جیس نے پھر قیص اٹھا کر کڑھائی شروع کر دی۔

خوفناں نچلا لب دانتوں میں دبائے پھر اسی سوچ میں غرق ہو گئی۔ وہ تین روز سے مسلسل عالم شاہ کے بارے میں سوچ رہی تھی اور سوچ

سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ دراصل وہ اس سے اور اس کے بے باک انداز اور نڈر رویے سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔

”کیا چاہتا ہے یہ شخص مجھ سے!“

یہ وہ سوچ تھی جو مسلسل اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ مہ جیس کے استفسار پر تو اس نے ایک بات گھڑ کر اسے مطمئن کر دیا تھا۔ لیکن خود اپنے

دل کو مطمئن نہ کر پا رہی تھی ویسے تو وہ مہ جیس سے کوئی بات نہ چھپاتی تھی لیکن یہ بات اسے بتانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ اس کی کچھ مدد نہ کر سکتی تھی۔

الٹا خود بھی بے طرح پریشان ہو جاتی اور شاید اماں کو بھی بتا دیتی اور یوں اس پر یونیورسٹی جانے پر پابندی عائد ہو سکتی تھی جو اسے ہرگز منظور نہ ہوگی۔ کئی

بار اس نے سوچا کہ وہ آذر کو ہی بتا دے، لیکن اسے بتانا بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ لڑکا تھا، جذباتی اور جوشیلا تھا۔ نجانے کیا کرنے کی ٹھان لیتا

اور پھر عالم شاہ کوئی معمولی شخص تو نہ لگتا تھا۔ اس کی تو ایک ایک ادا اس کے بے حد مضبوط اور با اثر ہونے کا اعلان کرتی تھی۔ وہ آذر کو کسی خطرے سے

دوچار کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

ایسی ہی بہت سے باتیں تھیں جن پر وہ غور کیے جا رہی تھی اور ہلکان ہو رہی تھی اور ہر چیز سے بڑھ کر اسے اپنی عزت، اپنا بلند کردار عزیز

تھا۔ وہ تو آذر سے ملنے اور اس سے بات کرنے سے انکار کر دیتی تھی۔ مبادا اس کا نام کوئی غلط انداز میں نہ لے اور فقرے کہے۔ پھر بھلا وہ سید عالم شاہ

کا اس طرح پیچھا کرنا کیسے انور ذکر سکتی تھی۔

”اگر اس نے پیچھا نہ چھوڑا تو کیا کروں گی میں۔“ اس نے پریشانی سے سوچا۔

اچانک ہی اپنا تعلیمی کریئر اسے خطرے میں پڑتا نظر آ رہا تھا۔ ایک نظر کڑھائی میں منہمک مہ جہیں پر ڈال کر وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ اماں صحن میں بیٹھی کوئی نئے قسم کا اچار ڈال رہی تھی۔ وہ بھی وہیں چار پائی پر لیٹ کر نیلے آسمان کی وسعتوں کو تنکے گی۔ کتنا سہل جانا تھا اس نے زمانے کی آلودگیوں سے بچ کر چلنے کو۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ انسان خود نیک نیت اور مضبوط ہو تو چاروں طرف کیسی ہی آندھیاں اٹھیں اس کے قدم نہیں اکھاڑ سکتیں۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ کچھ سے بچ کر چلنے کی کوشش میں بھی ایک آدھ چھینٹ اچھل کر ضرور آتی ہے۔

نیل بجی تو اماں نے اس کی جانب دیکھا۔

”ضوئی۔ دیکھو شاید تمہارے ابا آ گئے ہیں!“

”جی اچھا۔“

اس نے اٹھ کر چپلیس پہنیں۔ دو پنا تھیک طرح سے اوڑھتی ہوئی دروازے تک آئی دروازہ کھولتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

”السلام علیکم پھوپھی اماں۔“ وہ ان سے لپٹ گئی۔ پیچھے کھڑا آذر شوخ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”جیتی رہو۔“ انہوں نے اس کا ماتھا چوما۔

”کچھ دعائیہ کلمات ادھر بھی بیج دیجیے۔ ہم بھی جواب دینے کو فارغ ہیں۔“

پھوپھی کے آگے بڑھتے ہی وہ شرارت سے گویا ہوا۔

”آداب۔“ وہ آگے بڑھ گئی۔

چند لمحوں میں یہ پچھلے دنوں کی ساری کوفت اور پریشانی زائل ہو گئی تھی۔ دل و دماغ اچانک ہی کھل اٹھے تھے۔

پھوپھی کو اماں کے پاس بٹھا کر وہ کمرے میں چلی آئی۔

”کون تھا ضوئی؟“ مہ جہیں نے پوچھا۔

”پھوپھی اماں اور آذر۔“ وہ مسکرائی۔

”اوہ۔ جی اچانک ہی شگفتگی چہرے پر نمودار ہوئی ہے۔“ وہ ہنسی۔

”السلام علیکم بھابھی جان۔“ وہ بھی پیچھے پیچھے چلا آیا اور صوفشاں کے سر پر ہلکی چپت لگائی۔

”وعلیکم السلام۔ بڑے دنوں کے بعد نظر آئے بھئی۔“

”کیوں شکایت بھی تو آپ ہی کو تھی۔“ وہ ہنسا۔ ”میرے ہر وقت یہاں جلوہ افروز رہنے کی۔“

”ناراض ہو گئے تھے کیا؟“

”ارے نہیں۔ آپ کی بات پر میں بھلا کبھی ناراض ہوا ہوں۔ آپ سے تو میرے مذاق کے کئی رشتے بنتے ہیں۔“ اس نے شریر نظروں

سے صوفشاں کو دیکھا۔ ”آپ کا اور میرا مذاق تو چلتا ہی رہے گا۔“

”میں پھوپھی اماں سے مل کر آتی ہوں۔“ مہ جہیں اٹھ کر جانے لگی۔

”ارے اچھی طرح ملیے گا۔ ہمیں جلدی نہیں ہے آپ کے کوٹنے کی۔“ اس نے ہانک لگائی۔

”اور کزن۔ سناؤ۔ کیسی گزر رہی ہے؟“

وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”آپ کی دعاؤں سے بہت اچھی گزر رہی تھی۔“

وہ ہنسی۔ ”بڑے دنوں سے راوی چین، ہی چین لکھ رہا تھا۔“

”جھوٹی تو تم سدا کی ہو۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”مانو گی تھوڑا ہی کہ بہت بے چین دن گزر رہے تھے۔ نہ رات کی نیند نہ دن کا سکون، نہ

بھوک نہ پیاس۔“

”چچ چچ۔“ وہ چرانے کے انداز میں بولی۔ ”ترس آتا ہے آپ پر نہ جانے اکیسے میں کیا کیا سوچتے رہتے ہیں۔ آپ ہی باتیں گھڑتے

رہتے ہیں۔ ہم تو خدا کے فضل سے سوئے بھی خوب اور جاگے بھی خوش خوش!“

”اچھا۔ چلو ہاتھ لگن کو آری کا۔ پتا چل ہی جائے گا۔“ وہ گنگلتا۔

ضوفشاں اسے زبان چڑا کر باہر چلی آئی۔

”ضوفی۔“ مہ جیس اسے برآمدے میں ہی مل گئی۔ وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔

”کیا بات ہے آپ؟“ اس نے اس کا چمکتا چہرہ دیکھ کر دلچسپی سے پوچھا۔ ”بڑی خوش نظر آ رہی ہیں۔“

”بات ہی خوشی کی ہے۔“ وہ ہنسی ”اور زیادہ خوش تو تمہیں ہونا چاہیے۔“ وہ شرارت سے مسکرائی۔

”اچھا۔ وہ کیسے؟“

”پھوپھی اماں تمہیں انگوٹھی پہنانے آئی ہیں۔“

”ہج! ایک خوب صورت رنگ اس کے چہرے پر آیا۔“ لیکن اس کی ضرورت کیا ہے۔“

”آذر صاحب کے کارنامے ہیں۔“ دونوں کچن کی سمت چل دیں۔ ”اس دن وہ تمہارے لیے پسند سے انگوٹھی خریدنے ہی گیا تھا اور اس

کی ضد پر پھوپھی اماں آئی ہیں۔“

دونوں کچن میں آ کر بیٹھ گئیں۔ مہ جیس چائے کا پانی رکھنے لگی۔

”خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی محترمہ سے۔“ مہ جیس نے ہنسی سے دیکھا۔ وہ محض مسکرا کر رہ گئی حالانکہ آذر کے بے پناہ محبتوں کے

احساس سے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے، بے خیالی میں وہ اپنے ہاتھ دیکھنے لگی۔ آذر کو اس کے ہاتھ بہت پسند تھے اور کئی بار وہ اظہار بھی کر چکا تھا۔

”یار کزن۔“ وہ بے تکلفی سے اسے ہمیشہ ایسے ہی مخاطب کیا کرتا تھا۔ ”تمہارے ہاتھ تو تمہارے چہرے سے زیادہ خوبصورت ہیں لگتا

ہے کسی ماہر سنگ تراش نے سالوں کی ریاضت کے بعد سنگ مرمر کو ترش کر بنائے ہوں۔“

وہ ہنس کر چپ چاپ اپنا کام کیے جاتی۔

”زیادہ صابن میں بھگو کر مت رکھا کرو انہیں۔ خراب ہو جائیں گے!“ وہ ہدایت کرتا۔

”برتن تم دھو جایا کرو۔“ وہ ہنس کر کہا کرتی۔

”یہاں تو نہیں۔ وہاں دھو دیا کروں گا۔“ وہ معنی خیز باتیں شروع کر دیتا۔

”مجھے زن مرید قسم کے شوہر بالکل پسند نہیں۔“ وہ ناک بھوں چڑھا کر کہتی۔ ”یہاں وہاں مت کرو۔ اور باہر جا کر بیٹھو۔“

”ضوفی!“ مہ جیس کی آواز اسے خیالوں کی دنیا سے باہر کھینچ لائی۔ ”تم ذرا پلٹیں وغیرہ نکال کر صاف کرلو۔ اماں نے کچھ چیزیں منگوائی

ہیں۔“

”جی اچھا۔“ وہ کھڑی ہو گئی اور الماری کی جانب بڑھ گئی۔

”اچھی مہمان نوازی ہے۔“ وہ دروازے پر موجود تھا۔ ”مجھے وہاں بیٹھا کر دونوں بہنیں یہاں اپنے کام پٹانے چلی آئیں۔ ارے ذرا سی

دیر کو آئے ہیں نہیں آیا کریں گے زیادہ۔“

”تم مہمان کب سے ہو گئے؟“ مہ جیس نے آنکھیں نکالیں۔ ”مہمان کیا اس طرح پورے گھر میں مڑگشت کرتے پھرتے ہیں؟ اور یہ کم کم آنے کی دھمکی کم از کم مجھ پر تو کارگر ثابت نہیں ہو سکتی البتہ۔“

اس نے شرارت سے ضوئی کو دیکھا۔

”البتہ کیا؟“ وہ جلدی سے پوچھنے لگا۔

”البتہ کچھ لوگ ایسے بھی جو آپ کی طویل غیر حاضری سے پریشان ہو جاتے ہیں کھوئے کھوئے رہنے لگتے ہیں۔ پڑھائی میں ان کا دل نہیں لگتا۔“

”توبہ ہے آپ۔“ ضوفشاں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ کا تو مذاق ہوگا اور وہاں کوئی دل پر لے لے گا۔ ذرا سوچ سمجھ کر بولیں نا۔“

”آہم؟“ وہ شرارت سے کھنکھارا۔ ”ہم نہ کہتے تھے۔“

”غلط فہمی ہے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”ارے چشم دید گواہ ہے میرے پاس۔“ وہ جوش سے بولا۔ ”اور اس نے ابھی ابھی گواہی دی ہے اب لاکھ کرو تم۔“

”تمہیں کیا مل جائے گا! اگر یہ مان بھی جائے تو۔“ مہ جیس نے مسکرا کر پوچھا۔

”بس صبر آ جائے گا کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی ہے۔“ وہ گنگنایا۔

”کتنا بولتے ہو آذر۔“ ضوفشاں نے اسے گھورا۔

”یہی تو دن ہیں میرے بولنے کے۔ بعد میں تو تم بولا کرو گی اور میں سنوں گا۔“ وہ مزے سے بولا۔

چائے بن گئی تو مہ جیس چائے لے کر اندر چلی گئی۔ ضوفشاں وہیں بیٹھی چائے کے گھونٹ بھرتی رہی۔ اس پر کوئی ممانعت تو نہ تھی لیکن اسے آج خود ہی اماں اور پھوپھی کے سامنے آذر کے ساتھ بیٹھنا اچھا نہ لگ رہا تھا۔ یوں بھی ابا بھی آنے والے تھے اور آج تو پھوپھی اماں کے آنے کا مقصد بھی کچھ اور ہی تھا سو وہ مہ جیس کے بے حد اصرار پر بھی اندر نہیں گئی۔

”ضوئی۔ چلو تمہیں پھوپھی اماں بلا رہی ہیں۔“ مہ جیس مسکراتی ہوئی اندر آئی۔

”کیوں؟“

”ارے کیوں کیا؟ معلوم تو ہے تمہیں۔ انگوٹھی پہنائیں گی اور کیوں۔“

”ابا آ گئے؟“ اس نے استفسار کیا۔

”ہاں ناں۔ تب ہی تو بلا رہی ہیں تمہیں۔“

”آذر کہاں ہے؟“ اسے نبھانے کیوں گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

”وہیں بیٹھا باتیں بنا رہا ہے۔“ وہ ہنسی ”اور یہ تمہیں آج کیا ہو رہا ہے۔ وہاں کون پرایا ہے جو تم اتنا گھبرا رہی ہو۔ چلو اٹھو!“

مہ جیس کے پیچھے پیچھے، شرماتی جھجکتی وہ جا کر پھوپھی اماں سے بالکل چپک کر بیٹھ گئی۔ زندگی میں پہلی بار اسے آذر سے بھی شرم آ رہی تھی۔ اور پھر ابا تو وہیں بیٹھے تھے آذر بھی اچانک اٹھا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ غالباً وہ خود بھی انہیں احساسات سے دوچار ہو گیا تھا۔

”ارے اسے کیا ہوا۔“ ابا حیرانی سے بولے۔

مہ جیس کھلکھلا کر ہنس دی۔ ضوفشاں کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھوپھی اماں نے مسکراتے ہوئے اس کی انگلی میں انگوٹھی ڈال دی اور اسے گلے سے لگا کر پیار کیا۔

”خدا مبارک کرے۔“ ابا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور باہر نکل گئے۔

مہ جہیں اطمینان سے بیٹھ کر چیزوں سے انصاف کرنے لگی اور وہ سر جھکائے ہاتھ میں پڑی انگلی کو دیکھنے چلی گئی۔ انگلی کی کیا تھی، ایک خوبصورت احساس تھا جس نے اس کی انگلی کو ہی نہیں اس کے دل کو گھیرے میں لے لیا تھا۔



”دیکھو آذر۔ مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔“ بے حد ناگواری سے اس نے کہا تھا اور وہ بایک اس قدر تیز دوڑا رہا تھا کہ اسے یہ بات چنچ کر کہنی پڑی تھی۔

”یار کزن۔ ذرا کان کو قریب لے آؤ۔ بالکل سنائی نہیں دے رہا ہے۔“
”تمہیں آخر عقل کب آئے گی؟“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”نہ بھی آئے تو کیا حرج ہے؟“ وہ ہنسا ”اور سنو لو کی۔ عقل اگر آگئی نا نقصان تمہارا ہی ہوگا۔ جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح عشق اور عقل کا کوئی میل کوئی جوڑ نہیں ایک آئے تو دوسرا خود بخود رخصت ہو جاتا ہے۔ مجھے عقل آگئی تو سمجھو عشق گیا ہی گیا۔“

”اچھا عشق ہے۔“ وہ چڑ کر بولی۔ ”خود تو خوار ہوتے ہو۔ مجھے بھی کراتے ہو۔ کیا سوچتے ہوں گے ابا۔“
”ارے وہ نئے زمانے کے ابا ہیں۔ جدید اصولوں پر بنے ہوئے۔“ وہ ہنس دیا۔ ”کچھ نہیں سوچیں گے۔“
”شرم کرو۔“

”اجالا۔ یار! رحم کرو۔ میرا اتنا خوب صورت موڈ برباد مت کرو۔“ بایک روکتے ہوئے اس نے کہا۔
”آؤ۔ تمہیں تمہاری پسند کی آئس کریم دلاؤں۔“

”میں یہیں کھڑی ہوں۔ تم لے آؤ جا کر۔“ وہ خفا تھی اس کی اس حرکت پر۔
”اچھا ٹھیک ہے۔“ اس کے بگڑے ہوئے موڈ کے پیش نظر وہ فوراً مان گیا۔ ”یہیں لے آتا ہوں۔“

وہ اس کی بایک سے ٹیک لگا کر بے خیالی میں مختلف گاڑیوں کو سڑک پر دوڑتا دیکھنے لگی جبکہ وہ آئس کریم پارلر میں گھس گیا۔

آج زندگی میں پہلی بار وہ اس طرح آذر کے ساتھ بایک پر بیٹھی تھی۔ وہ خود اس سے بات کرتا وہ صفائی سے منع کر دیتی لیکن اس نے تو پکا کام کیا تھا۔ سیدھا ابا کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور درخواست پیش کی تھی کہ وہ ضوفشاں کو آئس کریم کھلانے کے لے جانا چاہتا ہے۔ جس کے لیے ان کی اجازت درکار ہے اور باعث حیرت امر یہ تھا کہ ابا نے خوش دلی سے اجازت دے دی تھی۔ ہاں اماں ضرور چپ سی ہو گئی اور ضوفشاں کے ذہن میں رہ رہ کر اماں کا چہرہ آ رہا تھا۔

”پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے آذر کو۔“ اس نے جھلا کر سوچا۔

بے دلی سے ایک ایک چیز پر پڑتی نگاہ اچانک ہی تھمی تھی۔ اور اس کا دل یک بارگی زور سے دھڑکا تھا۔ ذرا سے فاصلے پر پارک کی ہوئی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا عالم شاہ اپنی تمام تر حسیات سمت اس کی جانب متوجہ تھا۔

ضوفشاں کی سمجھ میں اور کچھ نہی آیا اور رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ ایسی بات تھی اس شخص میں کہ نگاہ پڑتے ہی اس کا وجود پسینے میں ڈوب جاتا تھا۔ دل پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگتا تھا۔

”اجالا!“

اس نے اپنے پیچھے آذر کی آواز سنی پھر بھی اس طرح سے اچھلی جیسے ایٹم بم پھٹا ہو۔

”ارے۔“ وہ ہنس دیا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

اس نے غور سے آذر کو دیکھا اور نجانے کیوں اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”آذر۔ گھر چلو۔“

”ہاں ہاں چلتے ہیں۔ یہ آسکریم تو کھا لو۔ مہ جیسے باجی کے لیے تو میں نے پیک کر لی ہے۔“

”نہیں بس میں بھی وہیں چل کر کھاؤں گی۔“

”ہوا کیا ہے یار؟“ وہ جھنجھلا گیا۔

”آذر۔ وہ۔“ اس نے ذرا سارخ موڑ کر کن اکھیوں سے پیچھے دیکھا اور جیسے اس کی جان میں جان آئی۔ گاڑی وہاں سے جا چکی تھی۔

”کچھ پھوٹو بھی منہ سے۔“

”آں۔“ وہ چونکی۔ ”ہاں لاؤ دو۔ آسکریم کھاتے ہیں۔“

”امحق۔ موڈ آف کر دیتی ہو۔“ وہ ناراضگی سے اسے گھورنے لگا۔

خوفناں ہنس دی۔ ہر چند کہ اس کا ہنسنے مسکرا نے کو قطعاً دل نہیں چاہ رہا تھا۔

ٹی وی کی اسکرین پر ناچتی تھرکتی تصویروں سے پرے اس کا دماغ کہیں اور موجود تھا۔ مخمور آنکھیں کسی گہری سوچ میں گم تھیں اور چہرے پر

تناؤ کے سے آثار تھے۔

ہاں کچھ ایسی بات تھی اس میں، جو سوچنے پر مجبور کرتی تھی۔ کچھ ایسا تھا جو دماغ کی تہوں میں اس طرح سے جذب ہوا تھا کہ نکالے نہ نکلتا

تھا۔ ورنہ سید عالم شاہ نے کب کسی شے کو اتنی اہمیت دی تھی کہ وہ ناچاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور رہے۔ لڑکیاں تو اس کے لیے

بس ایسے ہی تھیں جیسے بچوں کے لیے تصویروں والے کیمرے میں کھنا کھٹ ایک کے بعد ایک تصویر نظر کے سامنے سے ہتی رہے۔ یہ کیسی تصویر تھی جو

مستقل نظر کے سامنے تھی۔ پیشانی پر ہاتھ پھیر کر اس نے ہتھیلی کو بغور دیکھا۔ اسے سی کی ٹھنڈک رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی اور اس کے باوجود

پینے سے نم ہتھیلی اس کے ذہنی خلجان کی تصدیق کر رہی تھی۔

”تمہاری سوچوں جیسی لگتی ہے نا؟“

کہیں دماغ میں فہد کی آواز ابھری۔ اور پھر گونجتی چلی گئی۔ یہ سوال اس کے دماغ کے ہر حصے پر ہتھوڑے برسانے لگا۔

”تمہاری سوچوں جیسی ہی لگتی ہے نا؟ تمہاری سوچوں جیسی۔ تمہاری سوچوں جیسی۔“

”ہاں۔“ اس نے تڑپ کر اقرار کیا۔ ”ہاں ہاں لگتی ہے میری سوچوں جیسی، میرے تصورات کی تفسیر، میرے ذہن میں بکھرے رنگوں سے

نبی ہوئی مکمل تصور۔ میرے خوابوں کی تعبیر بالکل وہی ہے ویسی ہی ہے۔ لیکن میں نے یہ تصور دل کے صنم خانے میں سجاتے وقت یہ ہرگز نہیں سوچا تھا

کہ کبھی یہ تصور میرا صنم خانے سے نکل کر، سانس لیتی ہوئی میرے سامنے آ کر کھڑی ہو جائے گی۔ بت اگر دل کے معبد خانے میں ہو تو سب سے

چھپ کر اس کی پرستش کر لینا آسان ہے، سامنے آ کر غرور سے کھڑا ہو جائے تو اسے سجدہ کرنا کم از کم سید عالم شاہ کے لیے تو ممکن نہیں۔ میں کیسے کہہ

دوں اس سے، کہ تم نظروں کے سامنے آئی ہو تو دل کا صنم خانہ ویران ہو گیا ہے، عالم شاہ کا دل نہیں رہا، ایک ویران سرائے ہو گیا ہے۔ اور اسے

بسانا، سجانا، سنوارنا تمہارے اختیار میں ہے، عالم شاہ تو بے اختیار ہو گیا ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے سختی سے اپنے ہی خیالات کو رد کر دیا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سید شاہ عالم ایک کم مایہ، بے حیثیت لڑکی کے

آگے بے اختیار ہو جائے۔ سرنگوں ہو کر اپنے دل کو روشن کرنے کے لیے اس کے جلووں کی بھیک مانگے۔“

”بے چینی حد سے سوا ہو گئی تو وہ کھڑا ہو گیا۔ وی سی آر میں لگی فلم کب کی اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی اور اب ٹی وی اسکرین روشن مگر خاموش

پڑی تھی۔

اس نے ٹی وی آف کیا اور کیسٹ نکال کر بے دلی سے قالین پر پھینک دی۔ جب سے اس نے آسکریم پارلر کے باہر ایک لڑکے کے

ساتھ دیکھا تھا۔ اس کا دل دنیا کو توڑ مروڑ کر رکھ دینے کو چاہ رہا تھا۔

”کون تھا وہ لڑکا؟ اور کیوں تھی وہ اس کے ساتھ؟“ یہ سوالات اس کے دل و دماغ کی دنیا تہہ وبالا کیے دے رہے تھے۔ ایک ہی وصف کی تو خواہش تھی اسے۔ کوئی ہو جس کی وفاؤں کے تمام سرے عالم شاہ کی ہستی تک آتے ہوں۔

وہ چاندنی کی ٹھنڈی کرنوں سے بنا پیکر، وہ ابر نیساں کا پہلا شفاف قطرہ، وہ بہار کے پہلے غنچے کے کھلنے کی صدا جیسا وجود، اگر حقیقت میں کہیں تھا تو صرف سید عالم شاہ کے لیے تھا۔ صرف اس سے محبت کرنے کے لیے، اس کو چاہنے کے لیے بنا تھا۔ اس کی تمام تر وفائیں، ساری دعائیں شاہ کے نام ہونی تھیں۔ پھر وہ دوسرا کون تھا؟

اسے یوں لگا جیسے اس کے جسم کا سارا خون جمع ہو کر اس کی کنپٹیوں تک آن پہنچا ہے اور اگر اس نے مزید کچھ سوچا تو اس کا ماتھا ترخ کر چور ہو جائے گا۔ سیڑھیاں پھلانگتا، لمبے ڈگ بھرتا وہ اپنے بیڈ روم تک پہنچا۔ پردے برابر کر کے اسے ی آن کیا۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی اوپری دراز سے ایک شیشی نکالی اور دو گولیاں ہتھیلی پر رکھیں۔ پانی کا گلاس بھرا اور دونوں گولیاں نگل گیا۔

صرف دس منٹ بعد وہ دنیا جہاں سے بے خبر اوندھا لینا سو رہا تھا۔



سید فرمان شاہ اپنے علاقے کے سب سے بڑے وڈیرے اور جاگیردار تھے۔ بچپن اور جوانی انہوں نے لندن میں گزاری تھی۔ والد کی اچانک وفات پر انہیں ملک لوٹنا پڑا۔ اپنے والدین کی واحد اولاد ہونے کے ناتے سے اب سب کچھ ان کا تھا۔ ہزاروں ایکڑ پھیلی اراضی ان کے نام تھی۔ آبائی حویلی کے علاوہ کئی دوسرے شہروں میں بنگلے ان کی ملکیت تھے، تمام بینک بیننس ان کا تھا۔

باہر کی تہذیب کے دلدادہ، عیش پرست فرمان شاہ کے لیے کوئی کمی تو پہلے بھی نہ تھی لیکن اب تو ان پر جیسے جنت کے دروازے کھل گئے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بہانے وہ لندن میں جو عیاشیاں کرتے تھے، باپ کے خوف سے انہیں پس پردہ رکھنے کے جتن بھی کرنے پڑتے تھے لیکن اب انہیں پوچھنے والا کوئی نہ تھا۔

تمام کام اور جائیداد کے انتظام مختلف لوگوں کے سپرد کر کے وہ خود ہمہ وقت عیش پرستی میں گم رہتے محفلیں بھی راتیں۔ مہمان گھر میں بھرے رہتے۔

مینا بیگم سے انہوں نے شادی کی تو کسی کو کوئی تعجب نہ ہوا۔ مینا بیگم طوائف زادی تھیں لیکن بے حد کائیاں اور ہوشیار تھیں۔ سید فرمان شاہ کو انہوں نے اس طرح سے گھیرا کہ ان کے بچ نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہ رہا اور انہوں نے خاندانی قدروں کو پامال کرتے ہوئے انہیں حویلی کی رانی بنا دیا۔

سید عالم شاہ، مینا بیگم کی ہی اولاد تھا۔ اس کی پیدائش کے ڈیڑ سال بعد ہی فرمان شاہ ایک کارائیکسڈنٹ میں دونوں ناگوں سے محروم ہو گئے مینا بیگم پہلے جو بھی تھیں اور جیسی بھی تھیں، فرمان شاہ سے شادی کے بعد انہیں خود میں بہت سی تبدیلیاں لانی پڑی تھیں۔ ایک گھریلو خاتون بن کر رہنے کے لیے اسے اپنے اندر سے ہمہ وقت ایک جنگ لڑنی پڑی تھی۔ فرمان شاہ کے ایکسڈنٹ کے بعد انہیں خود پر مزید اختیار نہ رہا۔ انہوں نے ہمت ہار دی۔ وہ جوان تھیں خوبصورت انہیں اور اس وقت بھی کئی دل، کئی آنکھیں ان کے لیے کھچی ہوئی تھیں، ان کی منتظر تھیں۔

سو ایک دن حویلی کے مکینوں کو علم ہوا کہ مینا بیگم رات کے کسی پہر، ڈیڑھ سالہ بچے اور اچانچ شوہر کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کہیں چلی گئی تھیں۔

”تھی نا آخر کو طوائف“ فرمان شاہ نے تلخ لہجے میں صرف اتنا کہا تھا۔ ”گھر اسے راس نہیں آیا۔“

پھر مختلف آیاؤں کے ہاتھوں ملتے عالم شاہ نے کئی باریہ بات سنی کہ اس کی ماں اسے چھوڑ کر گھر سے بھاگ گئی تھی۔ وہ سولہ برس کا ہوا تو سید فرمان شاہ نے ایک بیس برس کی لڑکی سے شادی کر لی۔ عالم شاہ کو غصہ باپ پر نہیں، اس لڑکی پر آیا تھا جس نے محض دولت کی خاطر خود کو قربان کیا تھا۔ عورت ذات سے اسے چڑھو گئی ہر لڑکی، ہر عورت کو وہ تحقیر بھری نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔

سید فرمان شاہ نے اسے بھی حصول علم کے لیے باہر بھیجا تھا لیکن وہ تعلیم مکمل ہوتے ہی لوٹ آیا۔ وہ گرم اہلنے خون کا مالک تھا، اسے سرد موسم اور سرد مزاج اس نہ آتے تھے۔ واپس لوٹ کر اسے علم ہوا کہ اس کی سوتیلی ماں بھی اس کے باپ کو اکیلا چھوڑ کر کرب کی آزاد فضاؤں میں واپس لوٹ گئی تھی۔

”تھی نا آخر کو ایک عورت۔“ اس نے تنہی سے سوچا تھا۔ ”بے وفائی کا سہل۔“ تب اس نے ملنے والی ہر عورت کو مستر کیا تھا، نظر آنے والی ہر لڑکی کو رنجش کرتا گیا تھا خواہ پہلی نظر میں خواہ چوتھی پانچویں ملاقات کے بعد۔

لیکن اس بات کا اسے علم نہ تھا کہ سب سے چھپ کر جو پیکر اس نے خیالوں میں تراش رکھا تھا۔ اسے لاشعوری طور پر اس کا انتظار بھی تھا۔ کہیں اندر چھپی ہوئی وفا کی خواہش بھی تھی۔

لاشعور سے شعور کی سطح پر ابھر آنے والے ان جذبات نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ ایک لڑکی کو پانے کی اور اس سے وفا چاہنے کی خواہش کا خوف اس کے اعصاب پر طاری ہو گیا تھا۔ وہ اس سے بچنا چاہتا، چھپنا چاہتا تھا۔ اور اپنی ذات کو ہمیشہ کی طرح سر بلند رکھنا چاہتا تھا۔ اگر وہ بھی ہر لڑکی کی طرح اس کی شخصیت سے مرعوب ہو جاتی۔ اس کی گرم نظروں کے سحر میں گرفتار ہو جاتی تو سید عالم شاہ کبھی پلٹ کر اس کی جانب دوبارہ نظر نہ کرتا۔ لیکن وہ اس کے چہرے پر لکھی اس کے کردار کی پاکیزہ اور پیشانی پر جگمگاتی روشنی سے ہار رہا تھا۔ اور جیسے اسے علم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی تمام تر ول پاور کو بروئے کار لا کر بھی اسے پالنے کی خواہش کو شکست نہیں دے پائے گا۔



”اجالا!“ خوشی و انبساط میں ڈوبی آواز پر اس نے سر اٹھایا جگمگاتے، چمکتے چہرے اور تیز سانس کے ساتھ وہ اس کے سامنے موجود تھا۔

”خیریت۔“ وہ حیران ہو گئی۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”موجیں ہو گئی ہیں۔“ وہ ہنسا۔ ”اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کا راستہ مل گیا ہے مجھے۔“

”ہوا کیا ہے۔ بتاؤ بھی۔“ وہ اب بھی۔

”اجالا۔ میں آج بے حد خوش ہوں۔ مجھے جدہ کی ایک فرم میں نوکری مل گئی ہے۔ دو سال کا کنٹریکٹ ہے۔“

خوشنما کی آنکھوں کی چمک یک بارگی ماند پڑ گئی۔ چہرہ مرجھا گیا، ہونٹ بھینچ گئے۔

”جدہ! تم۔ تم چلے جاؤ گے؟“

”تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“ وہ حیران ہوا ”اپنی زندگی سنور جائے گی۔ ذرا تصور کرو۔“

”مجھے نہیں کرنا کوئی تصور۔“ وہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

”سنو تو۔“ وہ پکار کر رہ گیا۔ وہ آنسو بیتی، پلکوں میں چھپاتی باورچی خانے میں چلی آئی۔ کوئی کام نہ سوجھا تو تسلے میں آنا نکال کر گوندھنے

بیٹھ گئی۔ باہر صحن میں اس کی آواز آرہی تھی۔ وہ اماں اور مہ جیس کو جواب کی تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

آنا گوندھتے ہوئے وہ مسلسل آنسو پونچھتی رہی۔ یہ تصور اس کے لیے سوہان روح تھا کہ وہ دو سال کے لیے اس سے جدا ہو جائے گا۔ وہ

اسے دیکھ نہ پائے گی، اس سے مل نہیں سکے گی، اس کی آواز نہ سن سکے گی۔ کتنا جان لیوا تصور تھا۔

وہ سسکی بھر کر رہ گئی۔

اور وہ کتنا خوش لگ رہا تھا۔ دولت پانے کی خوشی، اس سے بچھڑنے کی تکلیف پر غالب تھی۔ محبت کے دعوؤں کی قلعی کس طرح کھل گئی تھی۔

وہ دن اس سے نہ ملنے پر وہ اپنی کیفیات تمام تر جذبات سمیت بیان کرتا تھا اور اب دو سال کے لیے بچھڑنے کی خبر سناتے ہوئے اس کے ماتھے پر ایک

شکں تک نہ تھی۔

”جھوٹے دعوے کرنے والے بے ایمان لوگ۔“ اس نے ناک سکڑی۔

”ضوفی! اساتم نے۔“ مہ جیس خوش خوش اندر داخل ہوئی۔ ”زندگی بن جائے گی تم لوگوں کی!“

”آپا!“ اس نے احتجاج کیا۔ ”زندگی کی خوشیاں کیا صرف آسائشات سے مشروط ہوتی ہیں؟ دولت کے دھاگوں سے بندھی ہوتی

ہیں؟“

”ارے تم رو رہی ہو؟“ وہ حیران رہ گئی۔ ”بے وقوف لڑکی۔ وہ اپنا مستقبل بنانے جا رہا ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے!“

”مستقبل یہاں نہیں بن سکتا؟ اپنے ملک میں کیا کمی ہے؟“ وہ ہنسی۔

”ارے ڈیر کزن جس ملک میں ڈاکٹر اور انجینئر جوتیاں چٹختے پھرتے ہوں وہاں معمولی ایم ایس سی کو کون پوچھے گا؟“ وہ وہیں چلا آیا

اور پھر بھی سرکا کر عین اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

”یہ تو صرف میری لک ہے جو کمپوز کورس کی بیس پر اتنی اچھی جاب ایک نعمت کے طور پر بیٹھے بٹھائے مل رہی ہے۔ اور تم میرے ارادوں

کے پیروں میں اپنے آنسوؤں کی زنجیر ڈال رہی ہو؟ میں تو سوچ کر آیا تھا کہ تم انکرنج کرو گی مجھے۔ حوصلہ بڑھاؤ گی میرا۔ یہ جو میرے اندر کہیں ایک

لرزش سی ہے، اسے دور کر کے مجھے الفاظ سے قوت بخشو گی، میرے عزائم کو مستحکم کرو گی۔ اور تم رونے بیٹھ گئیں۔“

”مت جھاڑو تقریر۔ وہ بگڑ کر بولی“ اپنے زور بیان سے تم میری تکلیف کا مداوا نہیں کر سکتے جو مجھے تم نے یہ خبر سنا کر دی ہے۔“

”کس لیے جا رہا ہوں میں؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ ”بولو جواب دو؟ میرے معاشی وسائل مستحکم ہونے سے کس کا آرام

وابستہ ہے؟ کس کا مستقبل نکتی ہے میرے آئندہ سے؟“

”مجھے کبھی بھی اس سے زیادہ کی خواہش نہیں رہی جتنا تمہارے پاس ہے۔“ وہ نظر چرا کر بولی۔

”لیکن مجھے احساس ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے، وہ تمہارے شایاں شان نہیں۔ میں تمہیں بہت ساری خوشیاں دینا چاہتا ہوں اجالا!

دنیا کی ہر مسرت تمہارے آچل میں ڈالنا میرا خواب ہے۔“

”آذر۔“ اس کا لہجہ بھیگ گیا۔ ”اگر تم یہی چاہتے ہو کہ میں خوش رہوں تو مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ تمہاری قربت ہی میری اصل مسرت

ہے۔ تمہارا ساتھ میری سانسوں کی ضمانت ہے۔ میں مرنے جاؤں آذر۔“

”پاگل لڑکی۔“ وہ اسے حیرانی سے تنکٹے لگا۔ ”اتنا چاہتی ہو مجھے؟ پہلے کبھی کیوں نہیں بتایا؟“

”اب بتا رہی ہوں۔“ اس نے چہرہ گھٹنوں میں رکھ لیا۔

”سوچ لو اجالا۔ ہو سکتا ہے یہ ہمیں ملنے والا پہلا اور آخری چانس ہو پھر ساری زندگی ہمیں یونہی غربت سے جنگ لڑتے گزارنی پڑے۔“

”تم میرے ساتھ ہو تو میں ساری دنیا سے لڑ سکتی ہوں۔ اور جس طرح سے میں ابھی رہتی ہوں، اس طرح سے ساری زندگی گزار دینے پر

مجھے اعتراض نہیں۔ کیا تم مجھے دو وقت کی روٹی اور دو جوتے نہیں دے سکو گے؟ تمہاری قسم اس سے زیادہ کی مجھے خواہش نہیں۔ ہاں البتہ جو کچھ

خدا نے تقدیر میں لکھ دیا ہوگا، وہ تو ہر حال میں مل کر رہے گا۔“

”عجیب لڑکی ہو۔“ وہ ہولے سے ہنس دیا۔

”یہ تو پاگل ہے آذر۔“ مہ جیس چڑ کر بولی۔ ”میرا مشورہ مانو تو ضرور جاؤ۔ بھلا یہاں کیا رکھا ہے؟“

”نہیں آپا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”اگر میرے یہاں رہنے میں اس کی خوشیاں پوشیدہ ہیں تو پھر سب کچھ یہیں ہے۔ اور کہیں کچھ نہیں۔ یہ نہیں

چاہیے گی تو میں کبھی نہیں جاؤں گا۔ خواہ ساری دنیا مجھے بھیج دینے پر مصر ہو۔ میں اس کے چہرے پر مسرتیں دیکھنا چاہتا ہوں، اس کے لبوں پر مسکراہٹیں

دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی ٹپکے، یہ مجھے گوارا نہیں۔ میں نہیں جاؤں گا۔ تم سوچ لینا اجالا!“

”بڑی آہستگی سے مڑ کر وہ چلا گیا مہ جیس بت بنی اسے دیکھتی رہی پھر ضوفشاں کی جانب مڑی۔

”تم تم نے سنا ضوفنی۔ کتنا چاہتا ہے وہ تمہیں پاگل ہے تمہارے پیچھے خیر پاگل تو تم دونوں ہی ہو۔ اور یہ تمہیں اجالا کیوں کہہ رہا تھا؟“

ضوفشاں زور سے ہنس دی۔

”پاگل ہے نابقول آپ کے اس لیے۔ ورنہ میری تو اپنی زندگی کے اجالے اسی کی وجہ سے ہیں۔“



کیاری میں لگے پودوں کو پانی دینے کے بعد اس نے پائپ سے نکلتے پانی کی دھار کا رخ دیوار کی جان کر دیا۔ برسات نہ ہونے کی وہ سے مٹی سارا دن اڑتی تھی اور ہر شے گرد سے چھپ جاتی تھی۔

مہ جیس اور اماں پڑوس میں ہونے والے میلاد میں شرکت کے لیے گئی ہوئی تھیں اور وہ گھر میں اکیلی تھی۔ پڑھائی کا موڈ نہیں بن سکا تو وہ پائپ لگا کر صحن دھونے بیٹھ گئی۔ ہولے ہولے گنگناتے ہوئے وہ ہر شے پر پانی کی دھار ڈال رہی تھی۔

دروازے پر ہولے سے بجا تو اس نے چونک کر پائپ زمین پر ڈال کر کمر کے گرد لپیٹا ہوا دوپٹہ کھولتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ ابا کے آنے کا وقت تھا سو اس نے بے دھڑک دروازہ کھول دیا اور پھر اس کے حلق میں گھٹی گھٹی سی چیخ برآمد ہوئی۔

عالم شاہ دروازہ کھلنے پر اسے دیکھ کر بڑے رعب سے اندر آ گیا تھا۔

”کک۔ کیا بات ہے؟“ سہمی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔

”مغزور بھی ہو اور بزدل بھی۔ اچھی بات ہے۔ لڑکیوں میں یہ دونوں چیزیں ہونی چاہئیں۔“

”میں پوچھتی ہوں۔ آخر آپ اس طرح کیوں آئے ہیں میرے گھر میں؟“ اس نے تمام تر ہمتیں جمع کر کے کہا۔

”تمہیں اعتراض ہے؟“ وہ حیران ہوا۔ ”عجیب لڑکی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے زندگی میں پہلی بار سید عالم شاہ نے اپنی بار تسلیم کی ہے۔

اور تم ناخوش ہو۔؟“

”مجھے آپ کی ہارجیت سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”آپ پلیز یہاں سے چلے جائیں۔ کیوں آپ مجھے بے

عزت کر ڈالنے پر بضد ہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ ”میں عزت ہی تو دینا چاہتا ہوں تمہیں۔ شادی کرو گی مجھ سے؟“

”شش۔ شادی؟“ اس نے تھوک نگل کر سر سے پاؤں تک سامنے کھڑے شخص کو دیکھا۔ سیاہ شلووار قمیص میں ملبوس، کاندھوں پر چادر

ڈالے، پاؤں میں پشاور کی چپل پہنے وہ بڑا رعب بڑا منفرد لگ رہا تھا۔

”میں۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتی ہوں۔ آپ پلیز چلے جائیں۔ کوئی آگیا تو۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز

کا پتے ہوئے لہجے میں بولی۔

اس کا دل اس خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں آذر نہ آ جائے۔

”تو کیا ہوگا؟“ اس نے تیوری چڑھائی۔ کسی ایرے غیرے کے نہیں سید عالم شاہ کے ساتھ کھڑی ہو۔ اور میرے سوال کا جواب دو۔

شادی کرو گی مجھ سے؟“

”نہیں۔“ اس نے خوف سر جھٹکا۔ ”میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ میری منگنی ہو چکی ہے۔“

”سید عالم شاہ کے چہرے پر بہت سے سائے لہرائے۔

”مگنی؟“ اس نے جیسے دانت پیسے ”کس سے؟ اس تلاش سے۔ جس کے پھنچر اسکوٹر کے ساتھ تم اس دن کھڑی تھیں؟“
 ”ہم لوگ ایک ہی جیسے ہیں۔“ اس نے تھوک نگا۔

”آپ۔ آپ۔ اپنے جیسی کوئی امیر زاوی ڈھونڈ لیں۔ مم مجھ میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔“ لیکن سید عالم شاہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کی نگاہ اس کے جزے ہوئے ہاتھوں پر تھی۔ اس کی انگلی میں پڑی انگٹھی پر مرکوز تھی۔
 ”اتار دو یہ انگٹھی۔“ وہ جیسے پھنکارا۔

”نن۔ نہیں۔“ وہ سرکونی میں ہلا کر پیچھے ہٹی۔

وہ آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر انگٹھی کھینچ لی۔ ضوفشاں کی ساری چیخیں اس کے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئیں۔ خوف کے مارے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ دیوار سے سر لگائے وہ وحشت سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی جو اس کے بے حد قریب کھڑا تھا۔

”بہت خوبصورت ہو۔“ وہ اپنی منمور نگاہیں اس پر جما کر کہنے لگا۔ ”جیسے چاندنی سے بنائی گئی ہونے والے تمہارا نام کیا ہے۔ میرے لیے تو تم روشنی ہو۔ میری زندگی کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے اتاری گئی روشنی میں نے تمہارا نام روشنی رکھا ہے۔ اور سنو روشنی! تم صرف میرے لیے بنائی گئی ہو۔ کسی اور کے جیون میں اجالے بکھیرنے کی تمنا اگر دل میں ہے بھی تو اسے نکال پھینکو۔ آج سے تم میری مگنیتر ہو!“

اس کے تھامے ہوئے سرد ہاتھ میں اس نے انگٹھی ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ ضوفشاں کی ساری جان اس کے بدن سے نکل چکی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ بیٹھتی ہی چلی گئی۔ سانس بحال کرنے اور دم میں دم آنے میں اس نے بڑی دیر لگا دی پسینے میں ڈوبی پیشانی کو صاف کر کے اس نے اپنا ہاتھ دیکھا۔ اس کی انگلی میں آذر کی دی ہوئی انگٹھی ہرگز نہیں تھی۔ سات ہیروں سے بچی، چمکتی دمکتی انگٹھی نے اس کے ہاتھ میں روشنیاں بکھیر دی تھیں۔

سنگ مرمر سے تراشا ہوا ہاتھ جیسے بڑا قیمتی، بڑا منور ہو گیا تھا۔

اس نے دیوانوں کی طرح ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، کیاری کے قریب پاپ سے نکلتے پانی میں بھیکتی اسے اپنی انگٹھی نظر آ گئی۔ دوڑ کر وہ اس تک پہنچی اور دو زانو بیٹھ کر اسے اٹھایا۔

پتا نہیں سید عالم شاہ کی پہنائی ہوئی انگٹھی کتنی قیمتی تھی اور آذر کی خریدی ہوئی انگٹھی کی قیمت کیا تھی۔ اسے تو بس اتنا علم تھا کہ اس کے ہونٹ آذر کی انگٹھی پر ثبت تھے اور وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

ہر کسی نے پوچھ کر دیکھ لیا، ہر طریقہ آزمایا، مگر اس کی چپ تھی کہ نوٹے کا نام نہیں لے رہی تھی، ایک ہی دن میں اس کا چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا۔ پیلا ہو گیا، آنکھیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد گیلی ہو جاتی تھیں۔

ایک خوف تھا، جو اس کی رگوں میں سرایت کر گیا تھا ایک وہم اس کے دل میں گھر کر گیا تھا۔

”جو کچھ عالم شاہ چاہتا ہے اگر ایسا ہو گیا تو۔“

اس سے آگے وہ کچھ سوچ ہی نہ پاتی تھی، بس آنکھیں ڈبڈب جاتی تھیں عالم شاہ کی پہنائی ہوئی انگٹھی الماری کی دراز میں مقید کر کے اس نے ہاتھ میں دوبارہ پہلے والی انگٹھی ڈالی لی تھی لیکن دل کہتا تھا کہ اب وہ پہلے والی بات نہیں۔

پہلے وہ صرف ایک انگٹھی نہ تھی، آذر کے جذبات کی ترجمان تھی۔ اس کی چاہتوں کی زبان تھی لیکن اب یوں لگتا تھا جیسے وہ بولتی بات کرتی انگٹھی خاموش ہو گئی ہو بے جان ہو گئی اور وہ دراز میں انگٹھی بس رہی ہو، قہقہے لگا رہی ہو۔ اپنی طاقت پر نازاں اپنی قیمت پر مغرور ہو۔

”ضوفشاں، اب یہی طریقہ رہ گیا ہے کہ میں پڑوس میں جا کر آذر کو فون کروں اور اس سے کہوں کہ وہ آکر تمہارا بوتھا درست کر دے۔“
 مہ جہیں نے اسے اسی حالت میں مجسم دیکھ کر چڑ کر کہا۔

”آپا پلیز۔“ وہ چونک کر بولی۔ اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی ”آپ کو میری قسم، آپ آذر سے کچھ نہیں کہیں گی۔“

”پھر بتاؤ سچ کیا بات ہوئی تھی؟ جس وقت ہم میلا دیں گے تھے تم بالکل ٹھیک تھیں، ہنس بول رہی تھیں اور ہم واپس آئے ہیں تو تمہارا یہ حال دیکھا کہ نہ بول رہی ہو نہ بات کر رہی ہو، چہرہ زرد ہے آخر ہوا کیا ہے ضوفی۔؟“

وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔

وہ آخر کیا بتاتی؟ کس طرح بتاتی اسے علم تھا کہ اس کی پشت پر جو ہاتھ تھے وہ کس قدر کمزور تھے، وہ یونیورسٹی جاتی تھی تو ذرا سی دیر ہو جانے پر اماں کا دل کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح مانند کانپنے لگتا تھا۔ بازار سے واپسی میں تاخیر ہو جاتی تو باپ کے قدم بیٹھک سے برآمدے اور برآمدے سے صحن میں چکراتے رہتے، ان کے کمزور کاندھے مزید جھکے ہوئے لگنے لگتے اور چہرے کی جھریوں میں تغلرات اضافہ کر دیتے۔ وہ بھلا کیسے اتنے کمزور دلوں اور ناتواں کاندھوں کو مزید کمزور اور ناتواں کر دیتی۔

آذر کا خیال دل کی تقویت ضرور دیتا تھا لیکن آذر کو عالم شاہ کے بارے میں بتانا اسے کسی بڑے خطرے سے دوچار کر دینے کے مترادف تھا۔ اس دن آئس کریم پارلر کے باہر کار میں بیٹھے عالم شاہ کی پچھلی نشست پر بیٹھے خوفناک مونچھوں والے گارڈ کی شکل اور اس کے ہاتھوں میں موجود رائفل اب تک اس کے ذہن میں محفوظ تھی۔ وہ آذر کے جذباتی پن سے بھی واقف تھی۔ ان حالات میں اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ وہ کیا کرے۔ کسے ہمارے بنائے کس سے حال دل کہے اسے شدت سے ایک بڑے بھائی کی کمی محسوس ہوئی۔ کبھی اس نے سوچا ہی نہ تھا کہ بھائی کتنا بڑا سہارا ہوتے ہیں۔ کیسا گھناور دخت ہوتے ہیں۔ آج سوچوں کی اس تپتی دھوپ میں وہ خود کو بالکل بے سائبان محسوس کر رہی تھی۔

کال بیل کی آواز نے اسے اس خیالات سے باہر اکھڑا کیا۔

”میرا خیال ہے آذر ہے، کافی دنوں سے نہیں آیا ضرور وہی ہوگا“

مہ جبین بولتی ہوئی اٹھ کر باہر چلی گئی۔ ضوفی اس جلدی سے اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ کتنھا اٹھا کر بالوں میں پھیرا۔ آنکھوں میں کاہل ڈالا اور دوپٹا درست کرتی ہوئی باہر کی جانب چل دی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ آذر اس کی بجھی ہوئی آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے کا سبب پوچھنے بیٹھ جائے یہ اس کی اپنی آگ تھی وہ کسی بھی دوسرے شخص کو اس میں جھلتا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ دروازے تک اسی دھیان میں چلتی ہوئی آئی تھی کہ آذر سے سامنا ہوگا لیکن اندر آتے نوکرے اٹھائے دو افراد کو دیکھ کر وہ بت بن کر کھڑی مہ جبین کے پیچھے دوسرا بت بن گئی۔ دونوں نے چند لمحوں میں ہی چھوٹے سے صحن میں مٹھائی، پھلوں اور پھولوں کے نوکروں کا ڈھیر لگا دیا۔ ایک بڑے سے سنہری منقش تھال میں نبجانے کیا تھا۔ اس پر ٹمبلیس کپڑا پڑا ہوا تھا۔

”جبین، ضوفی بیٹا کون تھا؟“ اماں بھی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی وہیں آگئیں اور تیسرا بت بن گئیں۔

”یہ کیا ہے یہ سب کچھ؟“ پھر وہ فوراً حواسوں میں بھی آگئیں ”کون ہو بھائی تم لوگ اور یہ کیا لائے ہو؟ کس نے بھیجا ہے، یہ سب کچھ؟ کس کا سامان ہے؟“ پے در پے انہوں نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے۔

”ہمارے شاہ صاحب نے یہ سامان روشنی صلابہ کے لیے بھجوایا ہے، مٹگنی کی خوشی میں۔“ ایک ملازم نے مودب کھڑے ہو کر سوالوں کا جواب دیا۔

”روشنی؟“ اماں متعجب ہوئیں ”کوئی روشنی؟ یہاں تو کون روشنی نہیں رہتی اور میرا تو خیال ہے اس پوری گلی میں اس نام کی کوئی خاتون نہیں، بیٹا تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے غلط پتے پر آگئے ہو۔“

”شاہ صاحب کل خود یہیں آئے تھے۔ میں ان کا ڈرائیور ہوں میں نے یہاں پہنچایا تھا کل انہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”آخر یہ شاہ صاحب ہیں کون؟“ اماں پریشان ہو گئیں۔

”سید عالم شاہ، سید فرمان شاہ کے بیٹے۔“

”مہ جبین، ضوفی۔“ اماں ان دونوں کی جانب مڑیں ”تم جانتی ہو کیا اس نام کے کسی شخص کو؟“

مہ جیس کا سر بے اختیار نفی میں ہلا جب کہ وہ چور بنی، سر جھکائے اپنے پیروں کو گھورے جارہی تھی۔ اماں کے سامنے اس کا جھکا ہونا سر، ان کے سوال کا اثبات میں جواب بن گیا۔

”ضوفشاں کون ہے یہ شاہ؟“ ان کے لہجے میں دوسو سے تھے۔ عجیب سی سختی تھی، تعجب تھا، اس کی آنکھیں اشکوں سے لبریز ہو گئیں۔ برسوں کی محنت سے تعمیر کیا گیا اعتبار کا بت دھڑام سے منہ کے بل گرنے کو تھا۔ وہ بے قصور تھی لیکن اس عجیب سے موقع پر جیسے خود بخود قصور وار لگنے لگی تھی۔

”ضوفشاں، میں کیا پوچھ رہی ہوں؟“ اماں نے دکھ سے اسے یکھا۔

”اماں مجھے نہیں معلوم، میرا یقین کریں۔“ اس نے اشکوں بھری نگاہیں ان پر جما کر التجا کی۔

”یہ ان کا کارڈ ہے۔“ ملازم نے ان دونوں کے درمیان ہونے والے مکالمات کے دوران ایک کارڈ مہ جیس کو تھما دیا۔ ”انہوں نے کہا تھا روشنی بی بی کو دینا۔“

دونوں کھلے دروازے سے باہر نکل گئے۔

”ارے سنو بھائی۔“ اماں ہڑبڑا کر ان کی جانب مڑیں۔

”ارے بھئی، یہ لیتے جاؤ یہ ہمارا سامان نہیں۔“

”ضوفشاں بیٹا یہ کیا گتھی ہے؟“ اسے روتا دیکھ کر اس بار وہ کچھ نرم لہجے میں مخاطب ہوئیں۔ ”مجھے کچھ بتاؤ ورنہ گھبراہٹ سے میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ تمہارے ابا آتے ہوں گے میں کیا جواب دوں گی انہیں؟“

”اماں، میں اسے نہیں جانتی۔“ اس نے آنسو پونچھ کر رندھی ہوئی آواز میں بتایا۔ ”دو دن اس نے میرا پیچھا کیا کل آپ لوگوں کی غیر موجودگی میں آکر کہہ گیا کہ میں خود کو اس کی منگیتر سمجھوں۔“

”ہائے اللہ۔“ اماں نے دل تھام لیا اور وہیں بیٹھ گئیں۔

”اماں، اماں۔“ دونوں بوکھلا کر ان کی جانب بڑھیں۔ ان کا چہرہ ایک لخت بے حد زرد ہو گیا تھا۔

”آپا، آپ اماں کو اندر لے کر چلیں میں گلو کو زبنا کراتی ہوں۔“ وہ جھٹ پٹ باورچی خانے کی سمت دوڑ پڑی۔

اماں کو گلو زبلا کر، ہوا میں لٹا کر دونوں ان کے ہاتھ تھام کر ان کے پاس بیٹھ گئیں۔

”ضوفی کیسا شخص ہے۔ یہ شاہ۔“ انہوں نے نحیف آواز میں پوچھا۔ ”کیا بہت بااثر ہے؟ امیر ہے؟ ہاں ہوگا تو ضرور وہ تو اندازہ ہی ہو رہا ہے۔ ارے بیٹا ایسے لوگ تو بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ پیچھا لے لیں تو چھوڑتے نہیں، کالے سانپ کی طرح، تو نے کہاں سے یہ مصیبت پیچھے لگالی ضوفی؟“

”اماں، میں کیا کرتی۔“ وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

”میرا کوئی قصور نہیں ہے اماں، میں بالکل بے قصور ہوں۔“

”ارے مجھے پہلے کچھ بتاؤ دیتی، تیرا یونیورسٹی جانا تو بند کروا دیتی میں، نوبت یہاں تک تو نہ پہنچتی۔“

”اماں! ابا آتے ہوں گے۔“ مہ جیس فکر مندی سے بولی ”اس سامان کا کیا کریں؟“

”بیٹا ان کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے وہ تو مزید مڈھال ہوں گے۔ یوں کرو پہلے وہ سامان اندر اپنے کمرے میں رکھ والو۔ چار پائیوں کے نیچے کر دو، جاؤ بیٹا جلدی کرو تمہارا باپ پہلے ہی بے حد کمزور دل کا مالک ہے ویسے ہی تم دونوں کی فکر میں گھلتا ہے۔“ اماں نے بولنا شروع کیا تو بولتی ہی چلی گئیں۔

ضوفشاں اور مہ جیس بھاگ بھاگ صحن میں آئیں اور سامان اندر لے جانے لگیں۔ پہلے دونوں نے مل کر منٹھائی کی ٹوکری اندر رکھائے پھر باہر آئیں تو مہ جیس رک گئی۔

”اس میں کیا ہے؟“ اس نے تھال پر پڑا کپڑا ہٹا دیا۔

دونوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں لشکارے مارتا آتش گلابی سوٹ نظروں کے مقابل تھا۔ نہایت بیش قیمت کام سے مزین سوٹ میں سے جیسے آگ کے شرارے نکل رہے تھے۔ نظر ٹھہرتی ہی نہ تھی سوٹ کے ساتھ دھڑ دھڑ بے تھے۔

مہ جہیں نے ہی آگے بڑھ کر مٹلیس ڈبہ کھولا اور بے اختیار ”ہائے“ کر کے رہ گئی سونے کا خوبصورت اور قیمتی ملتان سیٹ تھا۔ دوسرے ڈبے میں لشکارے مارتے کڑے تھے، جن کی مالیت کا اندازہ کرنا ہی ان دونوں کے لیے ناممکن تھا۔

”ضوئی۔“ مہ جہیں کی تھر تھرائی آواز برآمد ہوئی۔

”یہ..... یہ..... کون پاگل شخص ہے؟ کیا چاہتا ہے؟“

ضوفشاں کے پاس اس سوال کا جواب تھا تو لیکن وہ دینے کے قابل نہ تھی۔ پتھرائی ہوئی نظروں سے وہ محض کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔

”چلو ضوئی جلدی کرو، ابانہ آ جائیں۔“

مہ جہیں جیسے نیند سے جاگی، دونوں پھر جلدی جلدی کام پٹانے لگیں۔

ابا کی آمد سے قبل ہی دونوں نے صحن صاف کر دیا۔ سارے نوکرے انہوں نے کمرے کی چار پائیوں کے نیچے چھپا دیے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی تاکہ پھولوں اور پھلوں کی خوشبو بھید نہ کھول دے۔ ابا کے آجانے کے بعد بھی تینوں ماں بیٹیوں نے جذبات پر قابو پائے رکھا مبادا انہیں ان کے چہروں سے کسی پریشانی کا احساس نہ ہو جائے۔

”ضوئی۔“ باورچی خانے میں روٹی بیلتے ہوئے مہ جہیں نے دھیرے سے اسے پکارا۔ ”اب کرنا کیا ہے؟“

”وہ بھی تو ہمارے اپنے ہیں، اور پھر ہم بھلا کہیں بھی کس سے؟ اور ہے کون ہمارا۔؟“

”اللہ ہے ناں ہمارا، وہی بہتری کرے گا۔“

”پھر بھی ضوئی وسیلہ بھی تو ہونا چاہیے ابا کو ہم بتائیں نہیں، آؤ راور عاصم کو بے خبر رکھیں، پھر بھلا ہم عورتیں کیا کریں گی؟ کر کیا سکتے ہیں ہم؟ اور پھر مزید کچھ گزر ہوئی اور اس کے بعد ان کا پتا چلا تو قیامت مچا دیں گے۔“

”قیامت تو اب برپا ہوئی ہی ہے آپا۔“ اس نے افسردگی سے سر جھکا لیا۔ ”لیکن میں چاہوں گی کہ جہاں تک ہو سکے اس قیامت کو دور رکھا جائے، آؤ راور عاصم بھائی کا اس معاملے میں پڑنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے، اور پھر کیا کر لیں گے کیا بگاڑ لیں گے اس شخص کا؟“

”پھر اب ہوگا کیا۔؟“ وہ فکر مندی سے بولی۔

”خدا بہتر کرے گا۔ وہ ملازم آپ کو کارڈ دے رہا تھا ناں۔؟“

”ہاں ہے میرے پاس کیوں۔؟“

”مجھے دے دیجیے گا۔“ وہ سوچ میں گم تھی۔

”کیوں۔؟“ وہ چونکی ”تم کیا کرو گی۔؟“

”اس کی چیزیں واپس بھجواؤں گی۔“ وہ آہستگی سے اٹھ گئی اور باہر نکل کر صحن میں پچھی چار پائی پر لیٹ گئی



انگلیوں کے درمیان کپکپاتے، لرزتے کارڈ پر اس نے ایک نگاہ ڈال کر سامنے کھڑی بلند، پر شکوہ عمارت کو دیکھا۔

کارڈ پر ”سید عالم شاہ“ کے نام کے نیچے اسی عمارت کا پتہ درج تھا۔

چادر کو سر پر درست کرتی وہ آگے بڑھی۔ گھر سے نکلی تھی تو دل میں نفرت اور غصے کا ایک سمندر سامو جزن تھا، جس میں سارا راستہ وہ ڈوبتی اور ابھرتی رہی تھی۔ اور اسی لیے اس خوف کا احساس نہ کر پائی تھی جو اس سمندر کی تہوں میں کہیں تھا۔ مگر تھا ضرورتاً ہی تو یہاں پہنچ کر اچانک ہی اس طرح سے عود کر آیا تھا کہ اس کا پورا وجود اس خوف کے سائے تلے دب رہا تھا۔

دل اس بری طرح سے دھڑکنے لگا تھا کہ اس نے کئی بار سوچا، واپس لوٹ جائے لیکن دماغ کہتا تھا کہ فیصلہ ابھی ہو جائے تو اچھا ہے آج اگر وہ واپس لوٹ گئی تو عالم شاہ کے بڑھتے قدم پھر کبھی نہیں رکیں گے۔

لبوں پر زبان پھیر کر وہ آگے بڑھی اور کال بیل کا بٹن پیش کیا۔ چند لمحوں کے بعد مکمل سنانا چھایا رہا اس پاس بھی دور دور تک ہو کا عالم تھا۔ دور دور بنے تمام مکان اس طرح خاموش کھڑے تھے جیسے ان میں کوئی ذی روح نہ بستا ہو۔

”جی بی بی کیا کام ہے؟“

اس آواز پر وہ بے طرح چوکی، چونکہ گیٹ نہیں کھلا تھا اس لیے ہڑبڑا کر ادھر دیکھا جہاں سے آواز آئی تھی۔ گیٹ کے دائیں جانب دیوار میں بنی چھوٹی سی کھڑکی کھلی تھی اور اس میں سے ایک خاصا خوفناک شخص جھانک رہا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں سے اس کے چہرے کا تاثر مزید بھیانک ہو رہا تھا۔ سرخ آنکھیں بڑی بے رحمی سے اس پر مرکوز تھیں۔

”وہ۔“ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”مجھے سید عالم شاہ سے ملنا ہے، یہ۔ یہ ان کا کارڈ“ اس نے کارڈ اس کی جانب بڑھایا جو اس نے نظر انداز کر دیا۔

”آپ کا نام؟“

”میرا نام، ان سے کہنا۔“ وہ الجھ کر رہ گئی ”ان سے کہنا وہ آئی ہیں جنہیں آپ روشنی کہتے ہیں۔“

کھڑکی کا تختہ کھٹ سے واپس گرا۔

چند لمحوں بعد گیٹ کھل گیا۔

”آئیے جی بی بی۔“ ایک باورچی ملازم بڑے عزت و احترام کے ساتھ مخاطب تھا سہمی ہوئی اور پھر تھوڑی دیر کے لیے بھول گئی کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔

وہ جیسے مغلیہ دور کے کسی محل میں آگئی تھی۔ گیٹ کے دائیں بائیں دور دور تک پھیلے سرسبز لان تھے جو خوبصورت حوضوں، مرمریں مجسموں اور حسین پھولوں سے مزین تھے۔ شفاف پانی میں تیرتی سفید بطخیں دور سے سفید پتھر کی بنی ہوئی لگتی تھیں۔ گیٹ سے لے کر مرکزی عمارت تک سرخ بجری کی روش بچھائی گئی تھی۔ روش کے اختتام پر لمبی چوڑی ماربل سے بنی، ہر طرف سیڑھیاں تھیں۔

ملازم کی ہمراہی میں وہ کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی سیڑھیاں پار کرنے لگی۔ آگے ننھڑا گاڑ سے سے بنا محرابی دروازہ تھا۔

”آپ اندر چلی جائیں، شاہ صاحب آپ کے منتظر ہیں۔“ ملازم نے دروازہ کھول کر اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

ضوفشاں نے ایک بار سیڑھیوں کے کناروں پر ایستادہ سنگ مرمر کے ستونوں سے لپٹی سرسبز بیلوں کو اور نیچے پھیلے لان کے منظر کو دیکھا اور اندر داخل ہو گئی۔ دروازہ اس کے پیچھے بے آواز بند ہو گیا۔

اندر بڑے ہال میں اسے سی کی خنکی اور نیم تار کی چھائی ہوئی تھی۔ ضوفشاں نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری اور آنکھیں بار بار جھپک کرتا حد نظر دیکھا۔ کارپٹ ہال کے سامنے عین وسط میں اوپر جاتی سیڑھیاں تھیں میروں کارپٹ سے ڈھکی سیڑھیوں پر سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہ سب سے اوپر سیڑھی پر کھڑے سید عالم شاہ پر جارکی دونوں ہاتھ کمر پر رکھے نائلیں قدرے پھیلائے وہ بڑی شان سے کھڑا تھا۔ لبوں پر بڑی مدھم بڑی خوبصورت مسکراہٹ کھیل رہی تھی، بلکی سی چمک دیتے گرے رنگ کے کپڑوں میں اس کا دراز قد نیچے سے بہت نمایاں لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے لیے ضوفشاں کو لگا جیسے وہ کوئی مجسمہ ہو پتھر کا بے جان مجسمہ، جو کبھی سانس نہیں لے گا۔ کبھی حرکت نہیں کرے گا۔ لیکن پھر

پتھر کے جسے میں حرکت پیدا ہوئی اس نے ہاتھ کمر پر سے ہٹا لیے اور رینگ پکڑ کر آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔

”یوں تو ہمارے ہاں منگنی کے بعد اور شادی سے پہلے لڑکی کا یوں سسرال آنا کافی معیوب جانا جاتا ہے لیکن یقین کرو تمہارا آنا مجھے بالکل برا نہیں لگا بلکہ میں بہت خوش ہوں، تمہیں دیکھوں یا اپنے گھر کو۔؟“

وہ اس کے قریب آ کر دھیرے سے ہنسا ضو نشان سہم کو پیچھے ہٹی۔

”مجھ سے ڈرامت کرو روشنی۔“ اس نے مخمور آنکھیں بند کر کے کھولیں ”کم از کم تمہارے وجود کے لیے میں بالکل بے ضرر ہوں۔“

”میں..... کچھ کہنے آئی ہوں آپ سے۔“ اس نے تمام تر ہمتیں مجتمع کیں۔

”اچھا.....!“ وہ ہنسا ”ضرور کہو، سامان پسند نہیں آیا کیا؟ واصل وہ سب کچھ کرم کے سپرد تھا نجانے اس نے کیا بھیجا ہو۔“

”آخر آپ سمجھتے کیا ہیں خود کو۔؟“ وہ تمام تر خوف بالا کے طاق رکھ کر پھٹ پڑی ”کس نے حق دیا ہے آپ کو یوں دوسروں کی زندگیوں

سے مذاق کرنے کا، دوسروں کی عزتوں سے کھیلنے کا ہوں؟“

”آپ نے وہ سامان میرے گھر کیوں بھیجا؟“ وہ دبی دبی آواز میں چیخی۔ ”کیا مل گیا آپ کو یوں اپنی دولت کی نمائش کر کے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں زبردستی ایک انگوٹھی پہنا دینے سے آپ میرا جود اپنے نام لکھوا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، میں تھوکتی ہوں آپ کی دولت پر۔“ ہاتھ میں تھامی انگوٹھی اس نے عالم شاہ کے سامنے دھری شیشے کی میز پر پھینکی۔

”میری منگنی ہو چکی ہے اور میں کسی اور کی امانت ہوں سید عالم شاہ، آپ میری قیمت لگانے کا کوئی اختیار، کوئی حق نہیں رکھتے۔“

وہ اسی طرح بیٹھا ایک ٹک اسے دیکھتا رہا یوں جیسے اس کے آگے کوئی ایسا تماشا ہو رہا ہوں جسے نہ تو وہ پسند کر رہا ہو اور نہ ہی ناپسند، بس دیکھ رہا ہو۔

”آپ کا باقی سامان بھی جلد ہی پہنچتا ہوگا اور برائے مہربانی اب میرا پیچھا مت کیجیے گا میں ایک شریف، عزت دار لڑکی ہوں، اس طرح

کھیلنے کو آپ کو کوئی اور چیزیں یقیناً دستیاب ہو سکتی ہوں گی۔“ وہ واپس جانے کو مڑی۔

”سنو۔“ عقب میں وہ کھڑا ہو گیا ہے۔ ”صرف اپنی کہو گی سنو گی کچھ نہیں۔“

”کیسے؟“ وہ مڑی نہیں اسی طرح اس کی جانب پشت کیے کیے بولی۔

مضبوط قدم رکھتا وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

”غور سے دیکھو مجھے، سر سے پاؤں تک، پھر اس گھر کو دیکھو، ایک ایک چیز پر غور کرو اور پھر بتاؤ مجھے کہ کئی کہاں ہے؟ تمہارے انکار اور اس

رویے کی وجہ کہاں پیدا ہوتی ہے، میں وہ وجہ تو مناسکتا ہوں روشنی، لیکن تمہارے حصول کی خواہش نہیں اور اب یہ خواہش بھی کہاں رہی ہے جنون بن گئی ہے۔“

”میں نے کب آپ کی ذات میں نقص نکالا ہے یا آپ کی زر و دولت کو اپنی طمع کے ترازو میں تول کر کم پایا ہے ایسی تو کوئی بھی بات نہیں، بات تو صرف اتنی ہی ہے کہ میں آپ کے لیے نہیں ہوں اور یہ بات میں خود کہہ رہی ہوں۔“ دل کی گہرائیوں سے، کیا یہ بات آپ کو سمجھانے کے لیے کافی نہیں۔“

”ہرگز نہیں۔“ اس کے لہجے میں سفاکی درآئی۔

”میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ اگر کسی دوسرے کے جیون میں اجالے بکھیرنے کی تمنا ہے بھی تو اسے دل سے نکال پھینکو۔“

”آپ خود کیوں میری تمنا اپنے دل سے نہیں نکال دیتے۔“ وہ ایک بار پھر چیخ کر الجھ کر بولی۔

”سیدی عالم شاہ صاحب دل مند رہتا ہے سرائے نہیں، اس مندر پر کوئی ایک شخص جلوہ گر ہوتا ہے صرف ایک دفعہ، اور پھر اس کا دروازہ

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا ہے۔“

”تم مجھے اس لفاظی سے قائل نہیں کر سکتیں۔“ اس نے پیر زور سے مارا اور پلٹ کر چند قدم دور چلا گیا۔

”تم، تم جانتی نہیں ہو کہ عالم شاہ نے کیا مقام دیا ہے تمہیں، تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو مٹ چکا ہوتا اس کا وجود، یوں میرے سامنے زبان کھینچ لیتا، میں اس کی، اور تم۔“

وہ پلٹ کر دوبارہ اس تک آیا ”تم ٹھکرار ہی ہو، اس نعمت کو؟ کبھی غور کیا ہے اپنے دو کمروں کے اس بوسیدہ مکان پر جسے مکان کہنا اور اس میں رہنا تمہاری تو بین ہے، میں تمہیں یہاں لانا چاہتا ہوں، یہاں، اس محل میں، اور تم انکار کر رہی ہو۔“

”مجھے آپ سے اور آپ کے اس محل سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ اپنی تحقیر پر وہ سن ہو کر سرد لہجے میں بولی تھی۔

”آپ کو آپ کا یہ عظیم الشان گھر مبارک ہو میرے لیے دو تو کیا ایک کمرے کا مکان بھی کافی ہے، اگر میں اس میں اپنے من پسند لوگوں کے ساتھ زندگی گزاروں تو۔“

”بس۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا ”بہت ہو چکا، بہت ہو چکا، میں صرف ایک بار فیصلہ کرتا ہوں بار بار نہیں، زندگی میں بہت پہلے تصور میں ایک تصویر بنائی تھی اور فیصلہ کیا تھا کہ زندگی میں کبھی بھی، کہیں بھی وہ تصویر پائی تو اسی کو اپناؤں گا، ورنہ ساری عمر اسی طرح گزار دوں گا اکیلے، تنہا اب وہ تصویر میں نے پالی ہے، تو اسے وہیں بچھا ہوگا، جہاں میں چاہوں گا، ورنہ سارے رنگ بکھر جائیں گے۔“ اس کے لہجے کی تہہ میں سرد مہری تھی، دھمکی تھی۔

”میں..... صرف..... اپنے منگیتر سے شادی کروں گی، صرف اسی کے دل اور گھر میں بچوں گی۔ سمجھے آپ۔“ اس نے ایک ایک لفظ رک رک کر ادا کیا اور آگے بڑھی۔

”سنو روشنی بی بی، اگر کچھ غیر متوقع ہو تو پلٹ کر یہیں آ جانا، تمہارے تمام راستے اب یہیں تک آئیں گے۔“ پیچھے سے وہ تسخرا نہ لہجے میں بولا تھا اس کے بڑھتے قدم ایک بار پھر تھم گئے۔

”اور ہاں، اب میں تمہارے در پر نہیں آؤں گا، تم سے کچھ کہوں گا بھی نہیں، جتنا کہنا سننا تھا وہ سب کہہ سن لیا، لفظوں کو ضائع کرنا مجھے پسند نہیں اب اقرار کرنے آؤ گی تو تم۔“

”ہونہ۔“ اس نے سر جھکا اور باہر نکل گئی۔

سیڑھیوں سے لے کر روش اور روش سے گیٹ تک کا طویل فاصلہ اس نے محض ایک سانس میں طے کیا۔ گیٹ پر متعین چوکیدار کو شاید انداز سے آرڈر آیا تھا، اس نے لپک کر گیٹ کھول دیا۔

وہ گیٹ سے نکل کر باہر آئی تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اس سوز و کی والے کو وہ گھر کا پتا لکھوا کر آئی تھی وہ سامان سمیت حیران و پریشان کھڑا تھا۔

”بی بی جی شکر ہے آپ نکلیں تو کب سے کھڑا ہوں یہاں۔“ اس نے وہائی دی۔

”ہاں بھائی معاف کرنا۔“ اس نے چادر سے پسینہ صاف کیا اور مڑ کر کھڑکی کی بجائی۔

”جی۔“ رائفل بردار نے فوراً سر نکالا۔

”یہ تمہارے صاحب کا سامان آیا ہے اندر رکھوا لو۔“

”جی بہتر، میں پوچھتا ہوں شاہ صاحب سے۔“ کھڑکی بند ہوئی۔

”سنو بھائی۔“ وہ سوز و کی والے کی طرف مڑی ”یہ لوگ سامان لینے سے انکار کریں تو تم لے جانا بھلا ہو جائے گا تمہارا۔“

کھٹ کھٹ کرتی وہ آگے بڑھ گئی۔ سوز و کی والا حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ ایسا آرڈر اسے زندگی میں پہلی بار ملا تھا۔



مہ جیس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

”ضوئی تو اتنی بہادر کب سے ہو گئی۔“

”آپا ہر شخص ایک خاص حد تک بزدل ہوتا ہے اس کے بعد بہادری کی حد خود بخود شروع ہو جاتی ہے، صرف بزدلی اور بہادری کی ہی بات نہیں بلکہ ہر دو متضاد جذبے اسی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔“

وہ بڑی گہری سوچ سے واپس آ کر بولی تھی۔

”اگر وہ پکڑ کر قید کر لیتے تھے، اتنا سا خوف بھی نہ آیا دل میں کہ تیرے پیچھے ہمارا کیا حال ہو جاتا، کم از کم مجھے ہی بتا کر جاتی۔“ مہ جیس نے جھرجھری لی ”مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا کہ تم نے یہ کام کیا ہے، شیر کی کچھار میں آنکھیں بند کر کے چلے جانا، بہادری نہیں حماقت ہوتی ہے سمجھیں تم؟ مجھے تو اتنا غصہ آ رہا ہے کہ جی چاہتا ہے اماں کو بتا دوں۔“

”پلیز آپلی۔“ اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا ”اور پھر یہ سب کچھ تو کرنا ہی تھا ناں، میں نے نہ سہی کوئی اور جاتا کسی اور کے جانے سے کیا شیر کی کچھار بدل جاتی بلکہ ہو سکتا ہے الٹا نقصان ہو جاتا۔“

”اماں سے سامان کی بابت کیا کہو گی۔“

”وہی جو سچ ہے کہوں گی سوز و کی میں رکھ کر سوز و کی والے کو پتا بتا دیا تھا چھوڑ آیا وہ خود۔“

”اچھا، جیسے تمہاری مرضی۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ویسے کیا کہا اس نے؟“

”خود کو رسم زمان سمجھتا ہے، بڑا غرور ہے اپنی وجاہت کا، دولت کا، طاقت کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔ کہنے لگا غور سے دیکھو مجھے اور میرے گھر کو اور پھر بتاؤ تمہارے انکار کی وجہ کہاں ہے؟“

”پھر.....؟“

”پھر کیا؟ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں آپ میں اور آپ کے گھر میں رتی برابر دلچسپی نہیں رکھتی۔ یہ شان، یہ نمائش کسی اور کو دکھائیں، جو دیکھنا پسند بھی کرے۔“

”اچھا۔“ مہ جیس ڈر گئی ”غصہ نہیں آیا اسے؟“

”ہاں آیا تو تھا۔“ وہ سوچ کر بولی ”لیکن کچھ کہا نہیں اس نے، بس اتنا بولا کہ اب میں تمہارے در پر کوئی درخواست لے کر نہیں آؤں گا۔“

”شکر ہے خدا کا۔“ مہ جیس نے گہرا سانس لیا۔

”اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑ دیا اس نے، ورنہ اماں تو کہہ رہی تھیں کہ ایسے لوگ کالے ناگ کی طرح ہوتے ہیں پیچھا لے لیں تو چھوڑتے نہیں۔“

”بس اب انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ اطمینان سے بولی ”اسے تو پکا یقین ہے کہ میں اس کی وجاہت اور دولت سے متاثر ہو کر ایک دن ضرور اس کی جانب پلٹوں گی۔ بس اسی یقین میں عمر گزر جائے گی اس کی۔“

دونوں بہنیں ہنس دیں۔



بڑے دن بعد وہ آیا تھا۔ بلیک جنیز کے ساتھ اسکاٹی بلیو شرٹ پہنے بڑا تروتازہ اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔

ضوفشاں صحن میں سے گزرتے گزرتے رک کر اسے دیکھنے لگی۔

”ہیلو کزن۔“ وہ ہلکے سے مسکرایا۔

ضوفشاں کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی اس کو دیکھ کر دل اطمینان اور سکون کے جذبات سے لبالب بھر جایا کرتا تھا۔
 ”نظر لگاؤ گی۔؟“ اماں کی موجودگی کے باوجود معصومیت سے پوچھنے لگا۔
 وہ جھینپ کر آگے بڑھ گئی۔۔۔۔۔

”چائے چاہیے۔“ پیچھے سے وہ زور سے بولا تھا۔

وہ کچن میں آکر چائے بنانے لگی۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ ابھی چند لمحوں میں ہی وہ دروازے پر موجود ہوگا اور اس کا یقین درست نکلا۔
 ”کیا بات ہے بڑی خاموش خاموش ہو۔“ حسب معمول دونوں ہاتھ دروازے کے دونوں جانب جمائے وہ کھڑا تھا۔
 ”اتنے دن بعد آئے ہو۔“ وہ شکوے کرنے کی عادی تو نہ تھی پھر بھی نجانے کیوں اس کے لبوں سے فقرہ پھسل گیا۔ شاید اس لیے کہ پچھلے
 کافی دنوں سے وہ بڑی پریشان اور الجھی ہوئی تھی۔ ایسے میں انسان نہ چاہتے ہوئے بھی شکایت کر بیٹھتا ہے۔
 ”اوہو۔“ اسے شدید حیرت ہوئی۔ ”یہ آپ فرما رہی ہیں۔“

بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں

دل کی بربادی کے آثار نظر آتے ہیں

وہ ہنس پڑی۔

”میں تو خود اسی لیے نہیں آ رہا تھا کہ ملکہ عالیہ کو روز بروز آنا ناگوار گزرتا ہے، مجھے کیا علم تھا کہ یہاں کوئی دیدہ و دل فرس راہ کیے ہوئے

ہے۔“

”اف۔“ اس نے لب دانتوں میں دبایا، ”اسٹارٹ لے لیا آپ کی خوش فہمیوں نے؟“

”ارے یہ خوش فہمیاں تو مزید مستحکم ہو گئی ہیں محترمہ اور اس استحکام میں آپ کی ذرہ نوازیوں کا پورا پورا ہاتھ ہے۔۔۔۔۔“
 ”وہ کیسے؟۔“

”وہ اس دن بھلا کیا کہہ رہی تھیں تم؟۔۔۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے شرارت سے پوچھنے لگا۔

”کیا؟.....“

”یہی کہ میری قربت ہی تمہاری اصل مسرت ہے اور یہ کہ میرے دور جانے سے.....“

”آذر.....“ اس نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی اور منہ پھیر لیا۔

”کیوں، اب منہ کیوں چھپاتی ہو؟ اپنے ہی الفاظ سے شرماتے تو میں نے پہلی بار کسی کو دیکھا ہے.....“

”تم جاتے ہو یہاں سے یا اماں کو بتاؤں کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ اس نے دھمکایا۔

”جاتا ہوں بھئی۔“ اس نے سہنے کی اداکاری کی..... ”میری چائے تو دے دو۔“

چائے بن چکی تھی۔ اس نے کپ اس کو تھما دیا۔

”جار ہے ہیں ہم۔“ وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔

”جائیے۔“ وہ مسکرائی۔

”اب کبھی نہیں آئیں گے ہاں۔“ وہ آگے بڑھ گیا۔

”آذر!۔“ اس کا دل دہل کر رہ گیا۔

”پہلے ہی نجانے کیوں اس کا دل کہیں اندر ہی اندر ڈوبا ہوا تھا آذر کے ذرا سے مذاق پر چند لمحوں کو رک سا گیا۔

”خدا نہ کرے“ اس نے بڑبڑا کر کہا۔ آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں.....

کام سے فارغ ہو کر وہ نکلی تو دیکھا وہ منہ جہیں سے محو گفتگو تھا ضوفشاں کا دل ان دونوں کو یوں سنجیدگی سے باتیں کرتے دیکھ کر سہم گیا۔

”کہیں آپا نے اسے عالم شاہ کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا۔“ وہ پریشانی سے سوچنے لگی۔

”یہ ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں چہرے پر؟“ وہ غور سے اسے دیکھنے لگا۔

”نن..... نہیں تو۔“ وہ چہرہ دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے بیٹھ گئی ”آپ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں؟“

”یہ منہ جہیں باجی پٹیاں پڑھا رہی ہیں مجھے۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”کیسی پٹیاں؟.....“

”کہتی ہیں اس بے وقوف کے آنسوؤں پر مت جاؤ اور قسمت سے ملنے والا اتنا اچھا موقع گنوانے کے بجائے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤ

واضح رہے وہ بے وقوف لڑکی تم ہو۔“

”پھر؟“ وہ بے نیازی سے پوچھنے لگی۔

”پھر۔“ اس نے سرد آہ بھری ”پھر کیا؟ ظاہر ہے میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں، وہ لڑکی کتنی ہی بے وقوف سہی اس کی مسکراہٹیں مجھے

عزیز ہیں۔“

”نہیں، اگر تم جانا چاہو تو بے شک چلے جاؤ۔“ اس کے سرد آہ بھرنے پر وہ غصے سے بولی۔

”اچھا، واقعی؟ واقعی روؤ گی تو نہیں؟“

”رونایا مسکراتا تو میرا اپنا معاملہ ہے، تمہیں اس سے کیا۔“ وہ تنک گئی۔

”ارے۔“ وہ ہنس دیا۔ ”یہ یکا یک لڑنے جھگڑنے پر کیوں اتر آئیں خیریت تو ہے؟“

”وہ چپ چاپ بیٹھی پاؤں کے ناخن دیکھتی رہی عجیب سی حالت ہو رہی تھی اس سے مل کر خوشی بھی ہو رہی تھی۔ اس پر بگڑنے کا، لڑنے کا

دل بھی چاہ رہا تھا پتا نہیں اسے کیا ہو رہا تھا۔

”آذر، یہ عالم شاہ کون ہے؟“ منہ جہیں نے اچانک پوچھ لیا۔

”ضوفشاں نے گھبرا کر اسے دیکھا نظروں ہی نظروں میں سرزنش کی۔ لیکن وہ بے نیاز بن گئی۔

”عالم شاہ کون؟“ وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔

”سید عالم شاہ، میں بھی جانتی تو نہیں بس نام سنا ہے پتا نہیں کون ذکر کر رہا تھا۔“

”سید عالم شاہ“ وہ سوچنے لگا ”نام تو جانا پہچانا سا ہے غالباً یہ سید فرمان شاہ کے بیٹے کا نام ہے۔“

”وہ کون صاحب ہیں؟“

”ہیں نہیں تھے، بڑی قد آور شخصیت تھی جناب کی، سیاست وغیرہ میں ملوث رہے تھے اسی لیے مشہور بھی ہوئے کافی، اب تو انہیں وفات

پائے بھی تقریباً دو تین سال ہو گئے ہیں ان کا بیٹا مشہور ہو رہا ہے بڑے حلقوں میں غالباً شاہ ہی ہے اس کا نام، آپ نے کہاں سن لیا اس کے بارے میں؟“

”پتا نہیں کون ذکر کر رہا تھا۔“ وہ لائق سے کندھے اچھکا کر بولی۔ ”ویسے بڑا بااثر ہوگا ہے ناں؟“

”ظاہر ہے۔“ وہ ہنس دیا ”ایسے لوگ بھی بااثر نہیں ہوئے تو کیا ہم اور آپ جیسے ہوں گے، اس کے بااثر ہونے کو تو اس کے باپ کا نام

ہی کافی ہے۔“

”یہ کیا فضول قسم کی باتیں لے کر بیٹھ گئے ہو۔“ ضوفشاں جو خاموشی سے دونوں کی گفتگو سن رہی تھی، جھنجھلا کر بول پڑی ”کرنے کو کوئی اور

بات نہیں رہ گئی کیا۔“

”اے کیا ہوا ہے؟“ وہ حیرانی سے پوچھنے لگا ”ذرا اسی بات پر بلی کی طرح جھپٹتی ہے۔“

”ہاں کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے اسے۔“ مہ جبین نے اسے دیکھا۔ ”تم فکر مت کرو، خود ٹھیک ہو جائے گی۔“

”ویسے تو میں بھی کافی عرصے سے جانتا ہوں اسے۔“ وہ بدستور حیران تھا ”میں نے تو یہ دورہ پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔“

”کیا ہے آذر؟“ وہ شرمندہ ہو گئی۔ ”تم تو پیچھے پڑ جاتے ہو ہر بات کے۔“

”تم لوگ بیٹھو میں کھانا نکالتی ہوں۔“ مہ جبین اٹھ کر باہر چلی گئی۔

”اجالا۔“ وہ اس کی جانب پورے حواسوں کے ساتھ متوجہ ہوا ”کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ نظریں چرا گئی۔

کتنا مشکل تھا اس سے جھوٹ بولنا، جنہیں دلوں میں بسا کر خاموشی پرستش کی جائے انہیں معمولی سا دھوکا دینا بھی کتنا اذیت بخشتا ہے،

اسے اندازہ ہوا۔

”اجالا۔“ اس کے لہجے میں دکھ در آیا۔ ”مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو؟ مجھ سے۔“

”کون سا جھوٹ؟“ اس نے حیرانی کی ایکٹنگ کی۔ ”کیا کہہ رہے ہو، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“

”تم پریشان ہو، بے حد پریشان۔“ وہ اس کی آنکھوں میں ایک ٹک دیکھتا ہو بولا ”کوئی بات ہے جو تمہارے اعصاب پر اس بری طرح

سے سوار ہے کہ تمہیں خود اپنی حرکات کا اندازہ نہیں ہو رہا ہے، اس بری طرح سے الجھا ہوا میں نے تمہیں کبھی بھی نہیں دیکھا۔ اور..... اور..... وہ بات تم

مجھ سے بھی چھپا رہی ہو، حیرت ہو رہی ہے مجھے۔“

”معلوم نہیں آذر تم کیا سمجھ رہے ہو۔“ وہ اضطرابی طور پر انگلیاں چٹانے لگی ”میرے ساتھ اگر کوئی مسئلہ ہوتا تو کیا میں چھپاتی تم سے،

اور پھر بھلا کیا بات ہو سکتی ہے تم خود سوچو۔“

”معلوم نہیں۔“ آہستگی سے بولا اور خاموش ہو گیا۔

صاف ظاہر تھا کہ اسے ضوفشاں کی بات کا اعتبار نہیں تھا وہ محض اس کے زروں ہونے پر چب ہو گیا تھا۔

وہ تھوڑی دیر گھنٹوں پر سر رکھے بیٹھی رہی پھر اٹھ کر باہر چلی گئی۔



کئی دن بڑی خاموشی سے چپ چاپ گزر گئے زندگی معمول پر آگئی، مہ جیس اور اماں بظاہر بڑی مطمئن ہو گئی تھیں، جیسے جو کچھ پیش آیا تھا وہ محض ایک معمولی سا ناگوار واقعہ تھا اور وہ واقعہ چند ہی دنوں میں ذہنوں سے اتار پھینکنے میں وہ دونوں کامیاب ہو گئی تھیں۔

اس کی حالت البتہ بڑی مختلف تھی۔ وہ چپ تھی۔ خاموش تھی، بظاہر مطمئن بھی تھی اور خود میں مگن لگتی تھی، لیکن اندر سے وہ کتنی الجھی ہوئی تھی، کتنی پریشان، کتنی نا آسودہ تھی، یہ وہی جانتی تھی۔

سید عالم شاہ کے گھر سے نکل کر اسے یوں لگا تھا جیسے زندگی کا وہ چھوٹا سا گمراہم اور کافی ناخوشگوار باب وہ ہمیشہ کے لیے بند کر آئی ہے، اس نے خود کو تسلیاں بھی دی تھیں اور مطمئن بھی ہوئی تھی۔ مگر محض ایک قلیل عرصے کے لیے اچانک ہی اس کا دل ایک نئے سرے سے بے چین ہوا تھا۔ ایک دبا دبا لا شعوری خوف یکدم شعوری سطح پر ابھر کر چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ اس کے اندر طوفان برپا ہو گئے تھے۔ چھنا کے سے ہوتے رہتے تھے جیسے کچھ ٹوٹا ہو لیکن ہاتھوں سے پھسل گیا ہو۔ زمین سے ٹکرانے والا ہوا اور شعور پہلے سے اس کے گرنے کی، ٹوٹ کر بکھرنے کی صدا سن لے۔ اسے لگتا تھا کہ کچھ ہوا تو نہیں ہے لیکن ہونے والا ہو، اس کی زندگی کی آسودگی اور خوشیاں بکھرنے والی ہوں، فضا میں تحلیل ہونے لگی ہوں، وہ سہمی ہوئی تھی، ڈری ہوئی تھی لیکن خود پر قابو رکھتی تھی۔ اتنی پریشانیاں دوسروں میں تقسیم کرنے کے ہنر سے وہ قطعاً واقف نہ تھی۔ نہ ہی ہونا چاہتی تھی، سو مہ جیس کی طرح وہ آسودہ بھی نظر آتی تھی اور اماں کی طرح مطمئن اور بے نیاز تھی۔

اماں نے اسے یونیورسٹی جانے سے قطعاً منع کر یا تھا۔ افسوس تو اسے بے حد ہوا تھا لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ اس کے حق میں کتنا بہتر تھا، اپنی عزت اسے ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھی۔

اس دن وہ صبح ہی کپڑے اکٹھے کر کے دھونے بیٹھ گئی تھی۔ دو تین دن کے بعد آسمان پر سے بادل غائب ہوئے تھے اور سورج چمک رہا تھا سوا اس نے انگریزی کے محاورے کے مطابق سورج کے چمکنے کا پورا پورا افادہ اٹھاتے ہوئے کپڑے دھونا مناسب جانا۔

جس وقت دروازے کی بیل بجی، مہ جیس، باورچی خانے میں روٹی پکا رہی تھی اور اماں ظہر کی نماز کی نیت باندھے ہوئے تھیں۔ ضو فشاں نے ہاتھ بالٹی میں کھنگالے اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

”ارے عاصم بھائی آپ۔“ اسے دروازے پر کھڑے عاصم کو دیکھ کر جا بجا طور پر حیرت ہوئی کہ وہ ان کے گھر بے حد کم آتے تھے۔ اور پھر یوں بے وقت،

”واپس چلا جاؤں۔“ وہ مسکرائے لیکن بڑی عجیب طرح سے۔

”ارے نہیں، نہیں اندر آئیں ناں! انہیں ساتھ لیے وہ اندر آ گئی۔

”آپ بیٹھیں، میں آتی ہوں اماں نماز پڑ رہی ہیں بس پڑھ چکی ہوں گی۔“

”وہ یہ غور کیے بغیر کہ وہ کتنے پریشان اور الجھے ہوئے لگ رہے تھے فافٹ کچن میں چلی آئی۔

”آپا ذرا بتاؤ تو کون آیا ہے۔“

”کون؟ آذر ہوگا۔“ اس نے روٹی سینکتے ہوئے لا پرواہی سے کہا۔

”اوں ہوں۔“ اس نے شرارت سے نفی میں سر ہلایا ”غلط لیکن صحیح سے قریب قریب“ مہ جیس کا ایک سمجھ گئی۔

”وہ آئے ہیں۔“ وہ شرمیلے پن سے بولی ”کیوں؟“

”وہ، ہی آئے ہیں اور آنے کا مقصد فی الحال واضح نہیں۔“ وہ ہنسی ”آپ فافٹ کھانا تیار کریں، اور ہاں پہلے شربت بنالیں، میں تب تک

ان کے پاس بیٹھتی ہوں، اکیلے بیٹھے ہیں، وہ واپس کمرے میں چلی آئی۔

”جی جناب۔“ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے وہ بولی ”اب سنائیں کیسے مزاج ہیں“

”ٹھیک ہی ہیں۔“ انہوں نے ہتھیلیاں رگڑیں ”ضوفا آیا تھا کیا؟“

”کل، پرسوں، نہیں۔“ وہ سوچتے ہوئی بولی۔

”آج تو بدھ ہے ناں وہ ہفتے کے دن آیا تھا، خیریت؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”ہفتے کے دن آیا تھا۔“ انہوں نے اس کا سوال نظر انداز کیا ”کچھ کہہ رہا تھا کیا؟ کہیں جانے کے بارے میں؟“

”کہیں جانے کے بارے میں؟“ وہ الجھ کر رہ گئی۔

”کہیں چلا گیا ہے کیا؟ کہاں گیا ہے، بتا کر نہیں گیا کیا؟“

پے درپے اس نے کئی سوالات کر ڈالے۔

”کون گیا ہے؟ کہاں گیا ہے۔“

اندر آتی اماں اس کے انداز سے سمجھ گئی کہ مسئلہ گہیرا ہے۔

”السلام علیکم۔“ عاصم کھڑے ہو گئے۔

”وعلیکم السلام، جیتے رہو بیٹھو بیٹا، کیا بات ہے تم لوگ کیا باتیں کر رہے تھے۔“

”وہ ممانی جان آذر۔“

”کیا ہوا آذر کو؟“ اماں بے طرح گھبرا گئیں۔

”وہ دو دن سے گھر نہیں آیا ہے۔“

”ضوفشاں کے اوپر ہزاروں سمندروں کا پانی پھر گیا۔ وہ جامد وساکت بیٹھی رہ گئی۔

”گھر نہیں آیا۔“ اماں کو تعجب ہوا ”لیکن کیوں، کہاں گیا ہے؟“

”یہی تو علم نہیں، گھر سے کسی دوست کے ہاں جانے کا کہہ کر نکلا تھا رات کو نہیں لوٹا تو ہم لوگ سمجھے کہ دوست نے روک لیا ہوگا، عموماً وہ

یونہی کرتا ہے لیکن وہ دوسرا دن بھی گزر گیا اور پھر رات بھی، میں آج صبح سے اس کا پتا کر رہا ہوں، ہر دوست سے پوچھ لیا وہ کسی کے گھر نہیں گیا تھا۔ ہر

اس جگہ جہاں اس کے ملنے کی امید تھی، میں ہوا آیا ہوں خدا نے وہ کہاں رہ گیا۔“

”وہ اضطراب میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

”خدا خیر کرے۔“ اماں نے دل تھام لیا ”اپنے حفظ و امان میں رکھے، میرے بچے کو، کہاں رہ گیا ضوفا بیٹی، ذرا پانی لا دے مجھے۔“

وہ کسی بت کی طرح وساکت تھی، رو بوٹ کی طرح اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

”ضوفا۔“ کچن سے نکلتی مہ جیوں نے اس کا سفید چہرہ دیکھا اور رک گئی ”خیریت تو ہے؟“

”جی۔“ وہ زیر لب بولی ”آذر“

”کیا ہوا آذر کو؟“

”خدا نہ کرے اسے کچھ ہو۔“ وہ شدید کرب کے عالم میں بولی تھی ”بس وہ دو دن سے گھر نہیں لوٹا۔“

”دو دن سے گھر نہیں لوٹا؟ کیوں؟ کسی سے لڑائی ہو گئی کیا اس کی؟“

”نہیں تو۔“ اس نے نفی میں سر ہلا کر لب کاٹے۔ ”وہ کب لڑتا ہے کسی سے۔“

پانی لے کر وہ لوٹی تو اماں کو صوفے پر نیم راز پایا ان کا بلڈ پریشر لوہو گیا تھا۔

”ضوفی تم ممانی کا خیال رکھو نمک ملا پانی دو۔“ عاصم نے اسے ہدایات دیں ”میں چلتا ہوں۔“

”کہاں جا رہے ہیں عاصم بھائی؟“ اس نے تڑپ کر پوچھا۔

”میں۔“ وہ تذبذب سے رک کر بولے ”ہاسپٹل شعبہ حادثات“

پانی کا گلاس کے ہاتھوں سے نکل کر زمین سے ٹکرایا اور ایک چھنا کے کے ساتھ ریزہ ریزہ ہو گیا لیکن یہ آواز تو وہ بہت پہلے سن چکی تھی۔
دو پہر ڈھل گئی، جلاتی سلگاتی، ہزاروں دسو سے دل میں جگاتی شام اتری تو اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”ضوفشاں، مہ جہیں، بیٹا میری چادر لے آؤ۔“ وہ چار پائی سے اترتے ہوئے بولیں۔

ضوفشاں برآمدے کی دیوار سے ٹیک لگائے ایک ٹک سیدھ میں دیکھ رہی تھی، اماں کی آواز پر اس نے خالی خالی نظروں سے ان کی جانب دیکھا اور ایک سرد آہ بھر کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اماں۔“ مہ جہیں نے فکر مندی سے کہا۔

”ٹھیک ہے میری طبیعت، میرا بچہ ساتھ خیریت سے گھر لوٹ آئے تو شکرانے کے نفل پڑھوں گی نجانے کہاں رہ گیا، ایسا کبھی کیا تو نہیں پہلے اس نے، ارے ضوفی بیٹی چادر لا دے میری۔“

”کہاں جا رہی ہیں اماں؟“ اس نے لب کاٹے۔

”کہاں جا رہی ہوں؟“ انہیں تعجب ہوا ”ارے تیری پھوپھی کے ہاں اور کہاں، دو پہر سے تو میرے ہاتھ پیروں میں دم رہا نہیں تھا جو اٹھتی بیٹھتی اب ذر دل ٹھہرا ہے تو جا کر خیر خبر تو لاؤں، تیری پھوپھی کا جانے کیا حال ہوگا، خدا کرے بچہ ساتھ خیریت کے لوٹ آیا ہو۔“

ضوفشاں کا دل ایک بار پھر تیز تیز دھڑکنے لگا۔ آذر کے متعلق یہ باتیں اس کا دم گھونٹ رہی تھیں جان کھینچ رہی تھیں۔

”میں بھی چلو گی اماں۔“ اس نے آنسو پیٹتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”اماں میں بھی۔“ مہ جہیں نے بھی کہا، جب سے اس کی منگنی عاصم کے ساتھ طے پائی تھی وہ پھوپھی اماں کے گھر نہیں جاتی تھی عاصم سے بھی پردہ کیا کرتی تھی، لیکن فی الوقت معاملے کی نوعیت سراسر مختلف تھی۔

اماں نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور خاموش ہو رہیں۔

دروازے پر تالا ڈال کر انہوں نے برابر والی خالہ کو ابا کے لیے منیج دے دیا کہ وہ بھی پھوپھی اماں کے گھر پہنچ جائیں۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے ضوفشاں کے اندر کتنے ہی موسم تبدیل ہوئے تھے کبھی خیال آتا کہ وہ لوٹ آیا ہوگا اور صحن میں بیٹھا چائے کے ساتھ ساتھ پھوپھی اماں کی جھڑکیاں اور سخت ست سن رہا ہوگا۔ اور ہنستا جاتا ہوگا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر پھول کھل جاتے سکون و اطمینان کی لہریں موجزن ہو جاتیں۔ پھر اچانک ہی خیال کا دوسرا رخ ابھرتا اور اس کا دل سہم جاتا۔ آنکھیں بھر آتیں، اگر وہ کہیں بھی نہ ملا ہو تو، پھر اس کے اندر ایک شور برپا ہو جاتا۔ طوفان مچ جاتے۔ سائیں سائیں کا شور ہر سوچ، ہر آواز کو دبا دیتا۔

تمام راستہ وہ اسی کیفیت سے گزرتی رہی۔ اماں اور مہ جہیں دونوں خاموش تھیں مہ جہیں کا چہرہ بھی غمازی کر رہا تھا کہ وہ بھی ضوفشاں کی ہی کیفیت سے دوچار ہے۔ البتہ اماں کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا، ان کے لب و قنف سے ہلتے تھے۔

پھوپھی اماں کے گھر کی بیل بجاتے ہوئے اس کے ہاتھ واضح طور پر کانپ رہے تھے۔ دروازہ پھوپھی نے کھولا تھا۔

”السلام علیکم۔“ وہ اور مہ جہیں ایک ساتھ بولی تھیں۔

”وعلیکم السلام جیتی رہو“ ان کے لب محض ہولے سے ہلے، کپکپاتا ہاتھ انہوں نے باری باری دونوں کے سروں پر دھرا، ان کے چہرے سے ان سب کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اب تک نہ لوٹا تھا۔

”پھوپھی اماں۔“ سب سے پہلے ضوفشاں ان سے لپٹ گئی، ”کیوں نہیں لوٹا وہ اب تک“ اس کی آواز میں لرزش اور نمی تھی۔

”دعا کرو بیٹی۔“ انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ خود کو بھی دلا سا دیا ”میرا بیٹا جہاں کہیں ہو خیریت سے ہو۔“
 ”عاصم چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے تھے ان کے چہرے پر تفکرات کا جال تنا ہوا تھا۔ لب بھٹے ہوئے تھے۔“
 ”عاصم بھائی۔“ وہ ان سے مخاطب ہوئی۔

”کچھ پتا نہیں چلا صوفی۔“ وہ بے بسی سے بولے۔

”ہر جگہ، ہر جگہ چھان ماری میں نے۔“ اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

”سب چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی جس سے سب گزر رہے تھے انتظار کا کرب تھا۔ امید کی کرنیں بھی تھیں وسوسوں کے سائے بھی تھے۔“

”تھوڑی ہی دیر میں ابا بھی چلے آئے انہیں سرے سے کسی بات کا علم نہ تھا۔ گفتگو نے سرے سے شروع ہوئی تو وہ مزید کرب سے بچنے کے لیے اوپر چلی آئی۔“

اس کا کمر ایسا ہی تھا، ہمیشہ کی طرح صاف ستھرا اور سادہ، کتابیں میز پر جمی ہوئی تھیں۔ کونے میں بچھے پلنگ کی چادر بے شکن تھی۔ دیوار پر لگی کھونٹی پر اس کے استری شدہ کپڑے لٹکے ہوئے تھے ہر شے کو دیکھتے ہوئے، بے خیالی میں ہر شے کو انگلیوں سے چھوتے ہوئے نجانے اسے کیا ہوا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”آؤر، آؤر، کہاں چلے گئے تم کس آگ میں جھونک گئے ہو کیوں امتحان لینے پر تلے ہو، یہ امتحان تو بے حد جان لیوا ہے، لوٹ آؤ آؤر۔“
 اس کے بستر پر جھکی وہ مسلسل روتی رہی پھر اچانک اس نے سر اٹھایا اور تحیر سے سامنے کی دیوار کو گھورنے لگی۔ لیکن درحقیقت وہ کہیں اور دیکھ رہی تھی۔ کسی اور جگہ پر تھی اور کچھ آواز اس کے کانوں میں سیسے کی طرح اتر رہی تھیں۔

”سنو روشنی بی بی اگر کچھ غیر متوقع ہو تو یہیں لوٹ آنا تمہارے تمام راستے اب یہیں آئیں گے۔“

”وہ تصویر میں نے پالی ہے تو اسے وہیں بٹھا ہوگا جہاں میں چاہوں گا ورنہ سارے رنگ بکھر جائیں گے۔“

”ہاں درست کہا تھا اس نے، تصویر کے رنگ بکھر رہے تھے، نمکین آنسوؤں کے ساتھ گھل گھل کر بہہ رہے تھے، تصویر بے رنگ ہو رہی تھی اجڑ رہی تھی۔“

”تو... کیا... سید عالم شاہ نے۔“

”میکا کی انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے اس نے جیسے خود سے سوال کیا۔“

”ہاں، ایسا ہی ہے ایسا ہی ہوا ہے۔“ اس کے دل نے گواہی دی۔

تب اس پر ادراک ہوا کہ جن لفظوں سے وہ مطمئن ہو کر لوٹی تھی وہ درحقیقت اس کی زندگی کا سب سے بڑا اطمینان لوٹنے کے لیے ادا ہوئے تھے۔

وہ تو سمجھی تھی کہ اس کے الفاظ میں ربائی کا پروانہ تھا۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ زبان تو اسے عرقید کا پیغام بنا رہی تھی۔

”سید عالم شاہ، تم اس درجے بھی گر سکتے ہو۔“ دیوار کو مسلسل گھورتے ہوئے، شدید حیرانی کے احساس تلے وہ صرف یہی سوچ رہی تھی۔



ایک بار پھر وہ وہاں کھڑی تھی جہاں اس نے زندگی بھر دوبارہ قدم نہ رکھنے کا عہد کیا تھا۔ انسان کے نہایت عزم و استقامت سے تعمیر کیے گئے عہد بھی بسا اوقات کتنے بودے اور کھوکھلے ثابت ہوتے ہیں اس نے سوچا۔

سید عالم شاہ میزھیوں پر کسی مطلق العنان حکمران کی طرح کھڑا تھا۔ سرخ بوجھل آنکھوں میں تیرتے ڈورے اپنی طاقت کے احساس سے

دو آتش ہو رہے تھے، اس کے چہرے پر اپنی جیت کا احساس فتح کا شمار تھا۔

”میں نے کہا تھا ناں۔“ ایک ایک سینرھی اترتے ہوئے وہ بول رہا تھا ”کہ اب لوٹ کر آؤ گی تو تم“

”کاش کہ آپ اس وقت اپنے اوجھے ہتھکنڈوں کے بارے میں بھی بتا دیتے تاکہ میں بھی اپنے پلٹنے کی تصدیق کر سکتی۔“ اس کا لہجہ سرد سا تھا۔

”جنگ اور محبت میں ہر حربہ جائز ہوتا ہے“ وہ مسکرایا، پل بھر کو ”اصل حقیقت تو صرف فتح کی رہ جاتی ہے، اب کہو ہار مانتی ہو؟“ وہ جیسے چند کڑوے گھونٹ نکل کر رہ گئی۔

”آذر کہاں ہے؟“

”جہاں اسے ہونا چاہیے جہاں تمہاری خواہش کرنے والے کسی بھی احمق کو ہونا چاہیے۔“

”اپنے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟“

”زبردست، اپنے بارے میں کچھ کہے یا نہ کہے، زبردست ہی رہتا ہے۔“

”میں نے پوچھا تھا آذر کہاں ہے۔“

”میرے ہی پاس ہے۔“ وہ بے نیازی سے بیٹھ گیا۔

”کیا قصور ہے اس کا؟“ وہ پھٹ پڑی۔

”کیا جرم ہوا ہے مجھ سے؟ کیا بگاڑا ہے آپ کا ہم لوگوں نے؟ آخر آپ ہماری خوشیوں کے دشمن کیوں بن گئے ہیں۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ خاموشی سے بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

”روتے ہوئے بھی اچھی لگتی ہو۔“ بڑی دیر بعد وہ بولا۔

وہ یکدم چپ ہو گئی۔ سرخ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اگر آذر کا بال بھی بیکا ہوا عالم شاہ صاحب تو میں قتل کر دوں گی آپ کو۔“

بہت محبت کرتی ہو اس سے؟“ وہ چیخ کر بولا تھا لہجے میں استفہام سے زیادہ حسد کے بھڑکتے ہوئے شعلے تھے۔

”ہاں، بے انتہا، بے اندازہ۔“ وہ چلائی۔

وہ بھڑک کر اٹھ کھڑا ہوا، اس کا چہرہ اس شدت سے سرخ ہوا کہ وہ ہم کر رہ گئی لیوں کو سختی سے بھیجنے وہ اسے تھوڑی دیر گھورتا رہا پھر آگے بڑھ

کر اس کا بازو سختی سے جکڑ لیا، ضوفشاں کے لبوں سے چیخ نکل گئی۔

”کہو روشنی۔“ اس نے اسے ایک جھٹکا دیا ”کہو کہ تم میری ہو، صرف میری، تم مجھ سے محبت کرو گی، اتنی ہی، اس سے زیادہ ہر حال میں

چاہو گی مجھے، ہر موسم میں پرستش کرو گی میری بولو۔“ وہ چیخا۔

وہ زور زور سے رونے لگی۔

”خدا کے لیے رحم کرو، فرعون نہ بنو، یوں کر رہے ہو یہ ظلم۔“

وانت پیس کر اس نے ضوفشاں کا بازو چھوڑا اور پلٹ کر دوڑ چلا گیا۔

”میں ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے پیر پڑتی ہوں، میرے آذر کو چھوڑ دو، وہ تو بہت معصوم ہے بے قصور ہے، اس کا کوئی جرم نہیں جس کی سزا

تم اسے دے رہے ہو یقین کرو، بے تحاشا آنکھیں ہیں جو اس کے لیے آنسو بہا رہی ہیں، بے شمار دل ہیں جو اس کی، اس طرح گمشدگی سے فگار ہیں،

کیوں اتنے دلوں کی بددعا لے رہے ہو سید عالم شاہ۔“

”ہاں یقین ہے مجھے۔“ وہ مڑ کر بولا تو اس کے لہجے میں تندہی و تیزی نہ تھی عجیب حسرت تھی، شکستگی تھی۔

”یقین ہے مجھے کہ بے شمار آنکھیں ہوں گی جو اس کے لیے اٹک بار ہوں گی کئی دل اس کی جدائی سے پریشان ہوں گے۔ روشنی“ وہ اس کے قریب آ گیا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان آنکھوں میں سے صرف یہ دو آنکھیں میری ہو جائیں ان کی ہنسی، ان کے آنسو میرے لیے وقف ہو جائیں، ایسا نہیں ہو سکتا روشنی کہ ان بے شمار دلوں میں سے صرف تمہارا دل مجھے مل جائے، میرے لیے دھڑکنے لگے۔ میری خاطر کھلے میرے خاطر مرجھائے، بولو، بولو؟“ اب اس کے لہجے میں التجائیں تھیں۔ تمنائیں تھیں۔

”نہیں عالم شاہ۔“ آنسو پونچھ کر وہ مضبوط لہجے میں بولی تھی ”دل صرف ایک بار کسی ایک شخص کے لیے وقف ہوتا ہے پھر ہمیشہ اسی کا رہتا ہے آنکھوں کا رشتہ صرف ایک مرتبہ کسی سے جڑتا ہے پھر تمام آنسو، تمام مسکراہٹیں اسی شخص کی ہو جایا کرتی ہیں۔“

”اور وہ شخص مرجائے تو؟“ اس کی پوری بات سن کر اس نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

خوفشاں کا دل پوری شدتوں سے دھڑکا، آنکھیں پھیل گئیں۔ ایک ٹک وہ اسے دیکھنے لگی۔

”نہیں۔“ پھر اس کا سرفی میں ملنے لگا، ”نہیں عالم شاہ، نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے، تم ایسا نہیں کرو گے۔“

”اگر مجھے تمہارے کھودینے کا ذرا سا بھی وہم ہوا، تو میں ایسا کر سکتا ہوں روشنی۔“ وہ بے حد اطمینان سے بولا۔

”کیسے شخص ہو تم۔“ آنکھیں میچ کر اس نے تمام آنسو گرا دیے ”صرف اپنی ذات سے محبت کرتے ہو؟ صرف اپنی خوشیوں کے لیے زندہ

ہو۔“

”کون ہے میرا جس کی خوشیوں میں اپنی خوشیاں تلاش کروں؟“

”خود محروم ہونے کا مطلب دوسروں کے دامن اجاڑنا نہیں ہوتا عالم شاہ۔“

”میں ہر شے سے محروم ہونے کے لیے تیار ہوں سوائے تمہارے۔“

”تم یقین کرو اگر میں تمہاری بات مان بھی جاؤں تو اپنے دل پر مجھے یہ اختیار ہرگز نہ ہوگا کہ میں اسے تمہارے نام کر دوں تم ایک خالی،

کھوکھلا وجود لے کر کیا کرو گے؟“

”اسے اپنی تمناؤں سے سجاؤں گا، اپنی محبتوں اور چاہتوں سے سپنوں کا روشنی عالم شاہ کو اتنا غلط سمجھو، میں تمہیں اس شخص سے زیادہ

محبت دوں گا اتنا چاہوں گا تمہیں کہ تم دنیا کی ہر شے کو بھول جاؤ گی۔“

”محبتیں مشروط نہیں ہوا کرتیں۔“

”خُدمت کرو، خُدمت میں تمہارا اپنا نقصان ہے۔“

”کیا چاہتے ہو؟“ اس نے تڑپ کر پوچھا۔

”تمہارا ساتھ، تمہاری رفاقت، ہر موسم میں ہر عالم میں۔“

”میں انکار کر دوں تو۔“ سب سے سبب انداز میں اس نے پوچھا۔

”تو..... تو انکار کی وجہ کو مٹا دوں گا۔“

اس کے لہجے میں سفاکیاں تھیں، مضبوطی تھی۔

”اف۔“ بے تحاشا چکراتے ہوئے سر کو اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

”مجھے خدائی کا دعویٰ نہیں ہے روشنی۔“ اس کی حالت کو بغور دیکھتا ہوا وہ صوفے پر جا بیٹھا۔

”لیکن اتنا یاد رکھو، کہ فی الوقت میں ہی وہ شخص ہوں جو آخری فیصلے کا اختیار رکھتا ہوں ہاں البتہ میرا فیصلہ تمہارے فیصلے سے مشروط ہوگا،

بے شک فی الحال تم لوٹ جاؤ جا کر اگر کہیں سے مدد مانگنا چاہو تو مانگ دیکھو، تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ تمہارے لیے کون طلب گار ہے۔“

”وہ جانتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ درست تھا۔ خدا کی ذات پر اسے مکمل بھروسہ تھا لیکن اسے علم تھا کہ خدا اپنے بندوں کو آزمائشوں سے گذرتا ہے بھی سو وہ گزر رہی تھی۔ سید عالم شاہ کی طاقت کے متعلق اسے رتی برابر شک نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ زمانہ ہمیشہ دولت اور طاقت کا ساتھ دیتا آیا ہے اور دیتا رہے گا۔ وہ سڑک پر کھڑی ہو کر پوری دنیا کو مخاطب کر کے چیخ چیخ کر بتائے بھی تو کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ اور عالم شاہ کو معتبر جانا جائے گا۔ بالفرض اس کی بات تسلیم کر بھی لی جائے تو کسی کو اتنی ہمت نہ ہوگی کہ وہ عالم شاہ کے مقابلے میں اس کی کمزور ہستی کا ساتھ دے۔ ایک ایک کر کے بے شمار چہرے اس کی نظروں میں سے گزرنے لگے۔ آذر کا چہرہ، پھوپھی جان کا چہرہ، پھوپھا اور عاصم بھائی کے چہرے، عاصم بھائی سے وابستہ مہ جہیں، اماں، ابا، کتنے لوگ تھے، فی الوقت جن کی تمام خوشیوں کا دار و مدار آذر کی واپسی پر تھا۔ کتنی نظریں اس کی منتظر تھیں۔ اور فیصلہ اس کے ہاتھ میں تھا اس کی زبان کی ایک جنبش میں پنہاں تھا۔

”لیکن آذر۔“ اس نے سوچا ”کیا وہ جی پائے گا“ اور اس کی زندگی میں وابستہ کئی زندگیاں تھیں وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھی اور اس کے قدموں میں گر گئی۔ اس کا ماتھا عالم شاہ کے گھٹنے سے جا لگا۔

”اسے چھوڑو عالم شاہ اسے چھوڑ دو مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔“ سسکتے ہوئے اس نے کہا تھا، عالم شاہ کے لبوں پر بڑی آسودہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

”ہاں کیوں نہیں، تمہیں پالینے کی خوشی اتنی خوبصورت ہے کہ میں اپنے رقیب کی زندگی بھی گوارا کر سکتا ہوں تم نے کتنا بدل دیا ہے عالم شاہ کو، عالم شاہ کو بھی وعدہ کرتا ہے کہ وہ تمہیں بدل دے گا، تمہارا دل بدل دے گا، تمہاری محبتوں کا مرکز بدل دے گا۔“



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہسپتال کے کمرانمبر آٹھ میں وہ سب جمع تھے پلنگ پر لیٹے آذر کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اسے گلوکوز کی بوتل چڑھ رہی تھی۔
”آہ.....“ وہ کراہا۔

”امی۔“

”ماں صدقے، میرے بیٹے۔“ پھوپھی اماں لپک کر اس تک پہنچیں ”بول“
”امی، اجالا۔“

”ہاں بیٹے اجالا ہی تو ہے، ساری بتیاں جلی ہوئی ہیں۔“

ضوفشاں خاموشی سے اٹھ کر اس تک جا پہنچی۔

”آذر۔“ مدھم سروں میں اس نے اسے پکارا۔

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“

”وہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگا ضوفشاں نے لب کاٹ کر اٹھتے ہوئے آنسوؤں کو روکا اور نظریں چرائیں۔
”ضوفنی۔“

”ہاں آذر کہو۔“

”کل کیوں نہیں آئی تھیں۔؟“ نحیف آواز میں اس نے پوچھا۔

”کل!“ وہ خاموش ہو گئی۔

وہ اسے کیسے بتاتی، کیسے بتاتی کہ کل کا سارا دن وہ اس محبت کا ماتم کر رہی تھی جسے ایک مدت سے وہ دونوں مل کر بڑے پیار سے پروان چڑھا رہے تھے، وہ کیسے بتاتی کہ کل وہ اپنی تمام تر ہمتوں کو مجتمع کرتی رہی تھی۔ خود کو سمجھاتی رہی تھی۔ اس قربانی کے لیے آمادہ کرتی رہی تھی جو وہ دینے کی حامی پھر چکی تھی۔ اور پھر اسے خود پر قابو بھی رکھنا تھا، خود کو منائے بھی رکھنا تھا۔ اس لیے کہ اپنے حصے کی آگ میں کسی اور کو کھلسانے کی وہ کبھی بھی قائل نہ رہی تھی۔ وہ دوسروں کی پریشانیاں بھی اپنے نام کروالینے والے لوگوں میں سے تھی۔ بھلا خود پریشانیاں کیسی بانٹتی پھرتی۔

سواس واقعے کا اس نے کسی کو علم نہ ہو لے دیا تھا حتیٰ کہ مہ جیس کو بھی نہیں اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ اسے علم تھا کہ کوئی بھی اس کی بات نہ سمجھتا نہ مانتا، آذر، عاصم بھائی، ابا، پھوپھا جان، ان میں سے کوئی بھی اس قربانی پر راضی نہ ہوتا۔ اور انہیں سمجھانا بھی ناممکن ہوتا، سواس نے دل ہی دل میں تمام فیصلے خود کر لیے تھے اسے اپنے پیاروں کی خوشیاں اور ان کی زندگیاں عزیز تھیں۔ اس کے لیے اسے سب کی نظروں میں گرنا بھی پڑتا تو وہ سودا سے منظور تھا۔

عالم شاہ کی حرکات اور اس کی عائد کردہ شرائط سب کے علم میں آتیں اور پھر اس کی شادی عالم شاہ سے ہوتی تو اسے ساری زندگی اس قربانی کے صلے میں عقیدتوں کے ہار پہننے پڑتے۔ ترحم اور ہمدردی کے جذبات سمیٹنے پڑتے، یہ اسے منظور نہ تھا۔ سواس نے ہر الزام اپنے سر لے لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”بولو ضوفنی۔“ آذر کی آواز اسے خیالوں سے کھینچ لائی۔

”آں۔“ وہ چونکی ”میں، میں بس تمہاری خیریت کی دعا مانگتی رہی۔ تم ٹھیک تو ہونا آذر۔“

”ہاں۔“ وہ دھیرے سے ہنس دیا ”جس کے نام تمہاری دعائیں ہوں اس کا بھلا کوئی کچھ بگاڑ سکتا ہے۔“

”وہ لوگ کون تھے آذر۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”نا معلوم کون تھے میں تو کسی کو بھی جانتا تھا انہوں نے مجھے کیوں پکڑا، کہاں لے گئے، کیوں مارا پیٹا، میں کچھ نہیں جانتا ضوفنی مجھے علم نہیں ہے کہ وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے۔“

”آہ۔“ اس نے ایک سر آہ بھری ”صد شکر کہ تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ تم سے کیا چاہتے تھے۔“
 ”پھر تیسرے دن انہوں نے مجھے خود ہی گھر پر چھوڑ دیا عجیب پاگل تھے۔“ وہ بو لے گیا۔
 ”اچھا بس، تم زیادہ باتیں مت کرو، آرام کرو۔“ اس نے آذر کا ہاتھ دھیرے سے دبایا۔
 ”میں کل پھر آؤں گی۔“

”تم جارہی ہو؟ اتنی جلدی۔“ اسے حیرانی ہوئی۔

”ہاں آذر۔“ اس کے لہجے میں شکستگی تھی ”میں جارہی ہوں۔“
 ”کچھ دیر رک جاؤ۔“ وہ ہنستی ہوا۔

”میں نے کہاناں میں کل آؤں گی۔“ وہ آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر مر گئی۔
 ”چلیں ابا۔“ اس نے ابا کو دیکھا ”مجھے کچھ ضروری کام یاد آ گیا ہے۔“
 ”اچھا، چلو۔ ابا بھی اس کے رویے پر حیران تھے۔



”ضوئی۔“ مہ جہیں نے اسے پکارا اور جو گہری سوچوں میں گم تھی چونک اٹھی۔

”جی آپ؟“

”ایک بات کہوں۔“

”ضرور۔“

”میرا خیال ہے ضوئی آذر کو عالم شاہ نے قید کیا ہوگا۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”یہ خیال کیسے آیا آپ کو۔“

”اور کون ہو سکتا ہے بھلا، وہی دشمن بنا ہے ہمارا۔“

”ہمارا ناں، آذر کے متعلق اسے کیا علم، آپ تو بے وجہ کی باتیں کر رہی ہیں آپا، اور پھر اگر وہ اسے پکڑتا، تو پھر چھوڑتا کیوں؟“

”ہاں، بس یہی بات سمجھ میں نہیں آتی میری۔“

”چھوڑیں آپا، بلا وجہ کی غلط فہمیاں نہ پالیں میرا خیال ہے آذر کسی بدگمانی کا شکار ہوا ہے وہ جو کوئی بھی ہوں گے کسی غلط فہمی کی بنیاد پر لے

گئے ہوں گے اسے، غلط فہمی دور ہوگئی تو چھوڑ دیا، آذر کی ورنہ کسی سے کیا دشمنی۔“

”ہاں، شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”اور عالم شاہ وہ بڑا ڈسینٹ بندہ ہے اس سے ایسی توقع رکھنا فضول بات ہے۔“ مہ جہیں نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

”یہ..... تم کہہ رہی ہو ضوئی؟“

”ہاں سچ تو سچ ہوتا ہے آپا، ہم بے وجہ اسے غنڈہ، بد معاش سمجھنے پر تلے ہیں بھلا اس بے چارے نے کیا ہی کیا ہے۔ پسند ہی تو کیا تھا

مجھے۔“

”کہیں تم تو اسے پسند نہیں کرنے لگیں؟“ اس نے آنکھیں نکالیں، تو وہ دھیرے سے ہنس دی۔



وہ جھمکاتے، مسکراتے چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ اس نے نظریں چرائیں۔

”دیکھ رہا ہوں کہ میرے طالع کا چمکتا ستارہ کتنا روشن، کتنا خوبصورت ہے، بہت اچھی لگ رہی ہو ان کپڑوں میں۔“

وہ خاموش بیٹھی ناخن پر لگی نیل پالش دیکھتی رہی۔

”اجالا، جانتی ہو، یہ صرف تمہاری دعائیں ہیں، جو میری زندگی کے ہر موڑ پر میرا ساتھ دیتی ہیں، ہر بلا کو مجھ سے دور رکھتی ہیں۔ جب ان

لوگوں نے مجھے پکڑنا اجالا تو مجھے یوں لگا جیسے اب میں کبھی اس دنیا میں واپس نہ لوٹ سکوں گا جو میری اپنی ہے، جس میں میرے اپنے بستے ہیں، تم بستی ہو لیکن دیکھو، میں لوٹ آیا، صحیح سلامت، تو یہ سب کچھ کیا ہے؟ دعاؤں کا اثر ہے نا اجالا۔“

”ہاں آذر۔۔۔“ اس نے سر آہ بھری ”صرف میری ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگوں کی دعائیں ہیں جو تمہارے گرد ہیں، تمہیں اپنے حصار

میں لیے ہوئے ہیں۔“

”تم اداس کیوں ہو؟“ اس نے بالآخر چوری پکڑ لی۔

”میں؟“ وہ چونکی اور مسکرائی ”نہیں تو اتنا خوشی کا موقع ہے میں بھلا کیوں اداس ہونے لگی۔“

”ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

پھوپھی نے آذر کے بخیر و عافیت لوٹنے پر ان لوگوں کی دعوت کی تھی۔ جس میں نہ صرف وہ بلکہ مدہ جیں بھی آئی تھی۔ آذر کے بے حد اصرار

پر۔

”دعوت تو ہمیں کرنی ہے نگار۔“ اماں بولی تھیں۔ ”اپنے بچے کو اپنے گھر بلاؤں گی میں۔“

”ضرور بلاؤ شوق سے، فی الحال تو تم کو آنا ہے۔“ وہ خوشدلی سے بولی تھیں۔

ایک وقت تھا جب محبتوں کے اظہار ضوفاں کو بڑے بھلے معلوم ہوا کرتے تھے وہ خود کو دینا کی کی سب سے خوش قسمت ترین لڑکی تصور کرتی تھی اور سوچا کرتی تھی کہ شاید ہی کہیں دو گھر ایسے ہوں جہاں سارے دل اس طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوں، لیکن اب یہ سب کچھ ہوتا دیکھ کر اس کا اندر مرنے لگتا تھا۔ کوئی اس کے اندر چیخنے لگتا تھا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے کر اس دھوکے کو اپنے اندر سے نکالنے کی کوشش کیا کرتی جو اچانک ہی اس کے اندر بھرنے لگتا تھا۔

”اجالا۔“ آذر نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا وہ چونک اٹھی۔

”کہاں گم ہو یا رہی؟“

”کہیں نہیں۔“ وہ ہولے سے بولی ”آذر میں سوچتی ہوں ہم بھی کیسے لوگ ہیں عام لوگ چیونٹیوں جیسے، جنہیں جب جو چاہے مسل دے

ختم کر دے۔“

”ارے۔“ وہ ہنس دیا ”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں، آدمی کو کم از کم تھوڑا سا امیر، تھوڑا سا بااثر ہونا چاہیے۔“

”یہ تم کہہ رہی ہو؟“ وہ حیران رہ گیا ”وہ لمبے لمبے وعظ، وہ تقریریں کیا ہوئیں؟“

”ہاں، غلطی پر تھی میں، پاگل پن تھا میرا، بھلا غریبی میں بھی کوئی انٹرکشن ہے، کیا دھرا ہے، میرا تو خیال ہے آذر اس دور میں آدھی سے

زیادہ خوشیاں دولت کی مرہون منت ہوتی ہیں۔“

”وہ خاموش ہو گیا، اس سے نظریں ہٹا کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔

”جس وقت تم غائب ہوئے ناں آذر۔“ وہ بولتی رہی ”میں نے سوچا تھا کہ کاش ہم بھی کچھ بااثر ہوتے، تھوڑی دولت ہمارے پاس بھی

ہوتی تو کم از کم تمہاری تلاش کا کام ہی ذرا بڑے پیمانے پر شروع ہو جاتا۔ اب علم ہوا کہ ہم تو بڑے مسکین لوگ ہیں، ہے ناں آذر۔“

”معلوم نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”اپنے کم مایہ ہونے کا احساس بڑی شدتوں سے ہوا ہے مجھے۔“ اس نے کن آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”چلو، نیچے چلتے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا ”کھانا لگنے والا ہوگا۔“

وہ آنکھوں میں بھرتا، لرزتا پانی اس سے چھپائے اٹھ کھڑی ہوئی، وہ جانتی تھی کہ اس موقع پر وہ اس سے کوئی خوبصورت سی بات سننے کا متمنی تھا۔ چند الفاظ ایسے چاہتا تھا وہ اپنی سماعتوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر سکتا۔ اور وہ دل توڑ رہی تھی اس کا، اسے اس کی کم مائیگی کا احساس دل رہی تھی۔ لیکن یہ ضروری تھا اس کی سلامتی، اس کی بقاء کے لیے اور آذر کی سلامتی اور بقاء اسے ہر شے سے زیادہ عزیز تھی حتیٰ کہ آذر اور اپنی خوشیوں سے بھی زیادہ کھانے کے دوران وہ خود پر مصنوعی خوشدلی کا خول چڑھائے سب سے باتیں کرتی رہی ہنستی بولتی رہی۔ لیکن اسے علم تھا کہ وہ بے حد خاموش ہو گیا تھا سب کی باتوں پر معمولی سی ہوں ہاں کر رہا تھا۔

”آذر۔“ وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے دکھ سے اسے دیکھ کر سوچا تھا ”آئی ایم سوری، کبھی کبھار کسی کو ذرا سی خوشی بخش دینا بھی ہمارے اپنے اختیار میں نہیں ہوا کرتا۔“

”خدا حافظ آذر۔“ وہ اس کے پاس آ کر بولی تھی بظاہر مسکرا کر۔

”خدا حافظ۔“

”اس نے آہستگی سے کہہ کر سر جھکا لیا تھا وہ کسی سوچ میں گم تھا۔“



دوسرے دن شام کو وہ آ پہنچا تھا۔

ضوفشاں بظاہر کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی لیکن درحقیقت ان ہی لامتناہی سوچوں میں گم تھی جو اسے مسلسل اضطراب کیفیت بخشتے ہوئے تھیں۔

”ہیلو کزن۔“ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”تم۔“ اس نے رسالہ بند کر دیا ”کب آئے۔؟“

”بس ابھی۔“ وہ مسکرایا۔

اس کی مسکراہٹ مختلف تھی۔ ویسی ہلکی پھلکی اور فریض نہ تھی جیسے عام طور پر ہوا کرتی تھی۔

”کیا پڑھ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں، ایسے ہی فضول سی کہانی تھی۔“ اس نے رسالہ ایک جانب ڈال دیا۔

”ضوفنی پتا ہے آج ایک سر پرانز ہے تمہارے لیے، نامعلوم تم خوش ہوگی یا اداس۔“

”اچھا، بتاؤ تو بھلا کیا بات ہے۔“

”پتا ہے وہ جو جدہ والی آفر تھی ناں، وہ اب تک برقرار تھی۔ میں نے آج ہی معلوم کیا ہے۔“

”پھر؟“ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

اسے جیسے خود بخود ہر بات کا علم ہو گیا کہ اب وہ کیا کہے گا۔

”پھر!۔“ وہ اداسی سے مسکرایا ”میں نے آفر منظور کر لی ہے، ایک ہفتے بعد جا رہا ہوں۔“ جانے کس حوصلے سے کام لیا تھا ضوفشاں نے کہ

نہ وہ چینی، نہ روٹی، نہ احتجاج کیا، بس خاموشی سے اس کی بات سن لی، حالانکہ وہ جانتی تھی کہ آذر اسے جدائی کی نوید سن رہا تھا۔ ہمیشہ کے لیے پھرنے کا

مردہ دے رہا تھا۔ اور یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

”اچھا۔“ اس نے محض اچھا کہہ کر سر جھکا لیا۔

”خوشی نہیں ہوئی۔“ وہ پوچھنے لگا۔

”معلوم نہیں۔“

”دیکھو ناں، آخر ہم ذرا سے امیر، ذرا سے ہار تو ہو ہی جائیں گے ہیں ناں صوفی۔“ صوفشاں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں نے سوچا ٹھیک ہی کہتی ہو۔“ وہ نظریں چرا کر کہنے لگا ”بلکہ میں احمق تھا مجھے تو یہ آفر پہلی مرتبہ میں ہی قبول کر لینی چاہیے تھی۔ مجھے

سوچنا چاہیے تھا کہ لڑکیاں کتنی گھامز اور جذباتی ہوتی ہیں، ذرا ذرا سی بات کا مسئلہ بناتی ہیں اور پھر بعد میں اپنے ہی کیے گئے فیصلوں پر پچھتاتی ہیں،

ہاں البتہ کل تم نے بالکل درست کہا تھا، بالکل صحیح تجزیہ کیا اپنا، ہم لوگ واقعی اس قدر مسکین ہیں کہ جو چاہے چیونٹی کی طرح مسل دے، اس لیے میں

نے سوچا ہے کہ مجھے قسمت سے ملنے والے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کم از کم چیونیوں کی صف سے نکل کر ذرا تو بڑے جانوروں میں شمار

ہونے لگیں کیوں؟“

بہت سائنمکین پانی اس نے چپ چاپ حلق سے نیچے اتار لیا ایک نگاہ، بڑی خاموش نگاہ اس پر ڈالی اور اٹھ کر باہر چلی گئی۔

وہ اس کی جانب سے بدگمان ہو رہا تھا، یہ بات اس کی منصوبہ بندی میں شامل تھی۔



ایئر پورٹ پر وہ سب کے ساتھ مل کر اسے رخصت کرنے گئی تھی۔

نجانے کیا بات تھی اسے نہ رونا آ رہا تھا اور نہ ہی اس کا دل پیچنے کو چاہ رہا تھا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ شاید اسے جدا کرتے وقت وہ خود پر قابو

نہ رکھ پائے گی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دے گی۔ اس سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگے گی اور کہے گی ”آذر مجھے چھوڑ کر مت جاؤ، مجھے اس دنیا سے کہیں

دور لے چلو جہاں عالم شاہ جیسے عفریت بستے ہیں، مجھے اس آسیب زدہ زندگی سے چھٹکارا دلا دو مجھے پھر پہلے والی اجالا بنا دو“

لیکن کچھ بھی نہ ہوا، وہ خشک آنکھوں اور خالی دل کے ساتھ چپ چاپ کھڑی رہی سب سے مل کر وہ اس تک آ گیا۔ چند لمحے اس کا چہرہ

دیکھتا رہا وہ نظریں جھکائے کھڑی رہی۔

”اجالا۔“ بڑی محبتوں سے، بڑے جذبوں سے اس کا پکارا تھا۔

ہر چند کہ کچھ دیر پہلے تک وہ بڑا کھڑا کھڑا، ناراض ناراض سا رہا تھا لیکن اب لگتا تھا کہ وہ جانے سے پہلے تمام لڑائیاں تمام ناراضگیاں، ختم

کر کے ہنستے مسکراتے ہوئے رخصت ہونا چاہتا تھا۔

صوفشاں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، بڑی شدتوں کے ساتھ وہ اسے تک رہا تھا۔

”خدا حافظ آذر خدا تمہیں اپنی اماں میں رکھے۔“

”تم جانتی ہوناں، میں صرف تمہاری خاطر، تمہاری خوشیوں کے لیے جا رہا ہوں؟“

”ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”روکو گی نہیں۔“ وہ شرارتی ہوا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا ”کیونکہ میں جانتی ہوں تم واقعی میری خوشیوں کے لیے جا رہے ہو۔“

”کیا ہیں تمہاری خوشیاں۔“ وہ ذرا سا آزر دہ ہو کر پوچھنے لگا۔

”اتنی دولت لے آنا آذر کہ ہم ساری عمر آسودگی سے گزار دیں ذرا ذرا سی چیزوں کے لیے نہ ترسیں۔“

”خوشیاں دولت سے مشروط کر دیں تم نے؟“ اس نے لب کاٹے۔

”کیا کریں۔“ اس نے سر جھکا لیا ”دستور ہے زمانے کا“

”اس کا مطلب ہے جس کے پاس زیادہ دولت ہو، وہ زیادہ خوشیاں دے سکتا ہے، خود سے وابستہ لوگوں کو؟“

”ہاں، بالکل۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

آذر کا چہرہ تھوڑی دیر کے لیے بجھ گیا۔ پھر یکدم وہ خوشدلی سے مسکرا اٹھا۔

”اچھا، اب میرا انتظار ضرور کر لینا ایسا نہ ہو کہ کوئی بہت سی خوشیاں دینے والا شخص نکلے تو مجھے بھول ہی جاؤ۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا ”اور

عاصم بھائی اور مہ جبین باجی کو شادی میں میرے حصے کی باتیں بھی تم کر لینا، ہر دم میں میری جانب سے حصہ لینا سمجھیں؟“

اس کا سر پیار سے ہلا کر وہ عاصم بھائی اور پھوپھا جان سے گلے ملنے لگا، ہر کسی کی آنکھیں لبریز ہو رہی تھیں سوائے اس کے۔

وہ شاید اپنے حصے کے تمام آنسو ایک ساتھ بہا دینے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔

عجیب یاسیت کی لہر تھی جس نے شہر دل کو اپنی لپیٹ میں اس طرح سے لیا تھا کہ اسے ہر شے اداس، دل گیر اور مرجھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ ہر خوشی دسترس سے باہر محسوس ہوتی تھی۔

مستقبل، کبھی جس کا خیال اس کے دل کی تمام کلیاں کھلا دیا کرتا تھا اب اس کے لیے محض ایک اندیشہ ایک خوف بن کر رہ گیا تھا۔

ذرا سی آہٹ پر اس کا دل بے اختیار ہو کر جسم میں جیسے کوئی دوسری پناہ گاہ تلاش کرنے لگتا تھا۔ ہاتھ برف کی سل کی طرح تنگ رہتے، چہرہ مرجھایا ہوا رہتا محض چند دنوں میں وہ موم بتی کی طرح گھٹی تھی۔

اماں اور مہ جبین اس کی حالت پر اندر ہی اندر کڑھ رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی وجہ آذر سے دوری تھی۔ سو وہ دونوں سوائے اسے خوش رکھنے کی کوشش کرنے کے اور کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ یہ بھی اس کے لیے غنیمت تھا کہ انہیں اصل صورت حال کا علم تھا۔ اور نہ اس کی حالت کے غیر ہونے کا سبب وہ دونوں کچھ اور تلاش کرتی تھیں۔

”ضوئی۔“ مہ جبین کے پکارنے پر وہ بری طرح سے چونکی تھی ویسے بھی آج کل وہ ہر آہٹ پر اس طرح سے چونکتی تھی کہ اگلے کئی لمحے اس کے حواس اس کے اپنے قابو میں نہیں آتے تھے۔

”جی، آپا۔“ بڑی دیر بعد وہ بولی۔

”آذر کو خط کیوں نہیں لکھ دیتیں؟“ اس نے بغور اسے دیکھا۔

”خط؟ کیوں.....؟“ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیوں کا کیا مطلب بھی اگر وہ تمہیں یاد آ رہا ہو اس سے ملنے کا یا بات کرنے کا جی چاہ رہا تو خط لکھ دو خط بھی تو آدھی ملاقات ہی ہوتی

ہے۔“

”نہیں میرا دل اسے ملنے کو نہیں چاہ رہا۔“ اس نے سر جھٹک کر کہا۔

”ضوئی۔“ مہ جبین پہلے حیران ہوئی پھر جیسے کچھ سمجھ کر ہنس دی ”اور اب سمجھی۔“

”کیا سمجھیں؟“ وہ ہولے سے بولی۔

”یہی کہ تم اس سے ناراض ہونا؟“

”کیوں میں بھلا اس سے کیوں ناراض ہونے لگی۔“

”اس لیے کہ وہ تمہاری مرضی کے خلاف جدہ چلا گیا۔ اور اس کو گئے آج دسواں دن ہے اس نے کوئی خط کوئی فون بھی نہیں کیا۔“

”مصرف ہوگا۔“ وہ بے نیازی سے بولی ”اور گیا تو وہ میری ہی اجازت سے ہے، میں نے خود اسے جانے کے لیے کہا تھا۔“

”کس دل سے بھلا؟“ مہ جیس شوخ ہوئی۔

”جانے دیجئے آپ!“ وہ تمہنی سے ہنسی ”اب ان جذباتی باتوں کی عمر گزر گئی۔“

”ہاں۔“ مہ جیس نے حیرانی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا ”عمر گزر گئی؟ یہ کب کی بات ہے بھی۔“

”عمر گزرنے کے لیے سالوں کا یا صدیوں کا گزرننا ضروری نہیں ہوتا آپ!“ وہ دکھ سے بولی ”کبھی کبھی محض ایک پل میں انسان صدیوں کا فاصلہ طے کر لیتا ہے سچ کی ساری عمر رائیگاں ہو جاتی ہے وہ سب پل جو گزرتے بھی نہیں، ہتھیلیوں سے پھسل کر کہاں چلے جاتے ہیں، کسی کو خبر نہیں ہوتی“ مہ جیس ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔

اس کے لہجے میں شبنم اتر آئی تھی۔ آواز بھیگ چلی تھی۔ آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔ خاموش ہو کر اس نے سر جھکا لیا تھا۔

مہ جیس اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اور اس کے کاندھوں کے گرد اپنا بازو جامل کر دیا۔

”ضوئی! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے محبت تو بہت سے لوگ کرتے ہیں جدا بھی ہوتے ہیں، نہ صرف کچھ عرصے کے لیے بلکہ کچھ بد نصیب تو ہمیشہ کے لیے پھڑ جاتے ہیں لیکن یہ سوگ یہ ماتم یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے چندا، خود سے ہٹ کر بھی کچھ سوچو مجھے دیکھو اماں کو دیکھو ابا پر غور کرو، کیا ہم سب تمہیں خوش اور نارمل نظر آتے ہیں؟ غور کرو گی تو تمہیں علم ہو گا کہ ہم سب خوش نہیں ہیں، ہم سب اداس ہیں، پریشان ہیں جانتی ہو کیوں؟ تمہاری وجہ سے تمہاری فکر میں ہم سب گھل رہے ہیں۔“

”آپ!“ اس نے سر اٹھا کر بے یقینی سے اسے دیکھا ”آپ... آپ سچ کہہ رہی ہیں؟“

”ہاں۔“ وہ ہولے سے بولی ”تم اپنی فکروں میں اتنی محو ہو کہ تمہیں کچھ پتا نہیں چلتا۔“

مہ جیس کے لہجے میں چھپے شکوے اس سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ اور اپنے طور پر وہ جائز شکایت کر رہی تھی اور اس کی شادی کی تاریخ ٹھہرائی جا چکی تھی محض چند مہینے رہ گئے تھے ایسے میں تو ان کے گھر میں خوشیوں کی امانوں کی ایک بھیڑ ہونی چاہیے تھی ہنسی اور قہقہوں کے طوفان امنڈنے چاہیے تھے۔ میلے لگنے چاہیے تھے۔ لیکن فی الوقت تو جیسے سارے ماحول نے اداسی کی دبیز چادر اوڑھی ہوئی تھی سناٹا سا چھایا رہتا۔ جس میں محض اندیشوں اور واہموں سے بوجھل دلوں کے دھڑکنے کی صدا کیں گونجا کرتی تھیں۔

”اور اس ماحول کی وجہ میں ہوں، میری اداسی میری خاموشی۔“ اس نے آزر دگی سے سوچا ”اور یہ سب کیا سوچتے ہوں گے کیا سمجھتے ہوں گے۔ یہ کہ کس قدر خود غرض لڑکی ہے، اپنی ذات میں گم اپنی خوشیوں کی تلاش میں سرگرداں، اپنے دل پر ذرا سا کڑا وقت گزرا تو سب کو بے کل کر دیا۔ آپا کیا سوچتی ہوں گی میں اپنی فکروں میں غطاں و پیچاں ان کے حصے کی خوشیاں بھی ان کی دسترس میں نہیں آنے دیتی۔“

”آپ!“ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کہو۔“

”آپ پرسوں کہہ رہی تھیں ناں مارکیٹ چلنے کا، کیا لینا تھا آپ نے ہاں، وہ کام کے سوٹ ملنے تھے ناں۔“

”میں پرسوں نہیں ہفتے کو کہہ رہی تھی۔“ وہ مسکرائی۔

”آج بدھ ہے۔“

”سوری آپ!“ وہ شرمندگی سے بولی ”آپ یاد دہانی تو کراتیں، چلیں آج چلتے ہیں۔“

”اچھا پھر میں کھانا جلدی پکالوں گی۔“ وہ خوش ہو گئی۔

اس کے خوش ہونے کے ہی دن تھے۔ خوبصورت سپنوں کی دنیا میں کھوئے رہنے کے دن، انتظار کی لذت آمیز کک میں مبتلا رہنے کے دن، چہرے پر دلکش، رنگین، خیالوں کی دھنک بکھرائے رہنے کے دن۔

”ضوفشاں نے اس کے چہرے پر بکھری دھنک کو حیرانی اور دلچسپی سے دیکھا پھر مسکرا دی۔“

”رہنے دیجئے کھانا آج میں بناؤں گی۔“

”تم۔“ وہ ہنسی۔

”جی میں! بے فکر رہیے اتنی بھی پھوہڑ نہیں ہوں، کم پکاتی ہوں لیکن اچھا پکاتی ہوں، اور ویسے بھی آپ کے آرام کرنے کے دن ہیں، بے فکری سے خیالوں کے جھولے میں جھولتے رہنے کے دن۔ اب آپ زیادہ تر کام میرے سپرد کر دیا کریں اور پھر آپ چلی جائیں گی تو اچانک سر پر پڑنے والا ڈھیر سارا کام مجھے بوکھلا کر رکھ دے گا۔ بہتر یہ ہے کہ ابھی سے پریکٹس شروع کر دی جائے۔“

”ابھی تو بہت دن ہیں۔“ مہ جبین کھلکھلائی۔

”جی ہاں، آپ کو تو بہت ہی لگیں گے۔“ وہ مصنوعی غصے سے بولی ”ہم سے پوچھیں کتنے کام سر پر پڑے ہیں کرنے کو۔“

”اور محترمہ ہیں کہ جناب آذر صاحب کے خیالوں میں کھوئی رہتی ہیں۔“

”آپا پلینز۔“ مہ جبین ہنس دی۔

اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ سکون و طمانیت کے احساس سے جو جھل یہ نام کبھی دل پر کسی کوڑے کی طرح پڑا کرے گا سنتے ہی آئیں، باہر نکلنے کو بے تاب ہو جایا کریں گی۔

”زندگی بھی کیا کیا رنگ بدلتی ہے۔“ اس نے سوچا۔

”پھر انسان کس خوشی پر خوش ہو، مسرت اور شادمانی کے کن لمحوں کو اپنا سمجھے۔“

”آپا میں کھانا پکا رہی ہوں آپ ان چیزوں کی لسٹ تیار کر لیں جو آج لینی ہیں اور نہادھو کر تیار ہو جائیں۔“

چہرے پر تیزی سے پھیلتے دھوئیں کو مہ جبین کی نظروں سے بچانے کے لیے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں آ گئی۔

کھانا پکاتے ہوئے بھی اس کا دماغ عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بنا رہا اسے عالم شاہ کا دھڑکا دے کی بیماری کی طرح سے چپک گیا تھا سانس ہر وقت اکھڑا رہتا وہ یہ نہ کر دے، وہ کچھ یوں نہ کر بیٹھے، وہ گھر نہ چلا آئے وہ اسے اٹھوانے لے وہ ابا کو عاصم بھائی کو.....

اس کا دماغ الجھا الجھ کر بے حال ہو جاتا وہ جانتی تھی کہ اتنے دن گزر جانے کے بعد وہ یقیناً کچھ نہ کچھ جاننے کو بے تاب ہوگا اور عالم شاہ کے بے تاب ہونے کا خیال اس کے روئیں روئیں میں خوف کا زہر بھردیتا تھا۔

”مجھے خود اس سے رابطہ کرنا ہوگا۔“ اس نے روٹی کو جلتے دیکھا اور جلدی سے پلٹ دیا ”تو تم مجھے اس موڑ پر لے آئے ہو عالم شاہ کہ میں تم

سے از خود رابطہ کرنا چاہتی ہوں، اے خدا! تو ایسے بندوں کو اتنی طاقت کیوں دیتا ہے۔“

پلکوں کو جھپک کر اس نے آنسوؤں کو واپس اندر دھکیلا اور دوسری روٹی جلانے لگی۔



”ضوئی یہ دیکھو کس قدر خوبصورت ہے۔“ مہ جبین نے اسے کہنی مار کر متوجہ کیا۔

وہ اسے چاندی کا ایک خوبصورت سیٹ دکھا رہی تھی۔

”جی آپا اچھا ہے۔“

”اماں نے کہا تھا ایک سیٹ چاندی کا بھی ہوگا۔“

”جی، جی کہا ہوگا۔“

اس کی نگاہ سامنے والی کان پر لگے بورڈ پر تھی ”خواتین کے لیے فون کا علیحدہ انتظام“ کا بورڈ آویزاں تھا۔

”چلو ناں اندر قیمت پوچھتے ہیں۔“

”آپ اندر چلیں میں ذرا وہ سیب لے لوں دیکھیں ناں کتنے اچھے ہیں اماں کو جوس نکال کر دوں گی، کتنی کمزور ہو رہی ہیں وہ۔“

”چلو پھر پہلے سیب لے لیتے ہیں۔“ وہ راضی ہو گئی۔

”نہیں، نہیں میں لاتی ہوں، آپ اس سیٹ کی قیمت پوچھیں میں بس ابھی آئی۔“

”اچھا زیادہ دیر مت لگانا۔“

نجانے کون سا لمحہ تھا جو وہ اس کی بات خلاف توقع مان کر دکان میں داخل ہو گئی، صوفشاں لپک کر دوسری دکان کی جانب بڑھی تھی۔

دکان والے نے پردے کے پیچھے تک اس کی رہنمائی کر دی کپکپاتے لرزتے ہاتھوں سے اس نے ہینڈ بیگ سے سید عالم شاہ کا کارڈ ڈھونڈ کر نکالا اور نمبر ڈائل کیے۔

جب تک دوسری جانب تیل جاتی رہی وہ اپنی بے ترتیب سانسوں کی آواز سنتی رہی۔

”جی ہیلو۔“ اس نے تھوک اگلا ”یہ سید عالم شاہ صاحب کا گھر ہے۔“

”جی ہاں۔“

”مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“

”وہ تو جی گھر پر نہیں ہیں۔“

”اوہ۔“ اس نے گہرا سانس چھوڑا ”کس وقت ہوتے ہیں۔“

”کوئی مخصوص وقت نہیں ہے آپ پیغام چھوڑ دیں انہیں مل جائے گا۔“

”ان سے کہیے گا میں انہیں کل شام پانچ بجے فون کروں گی وہ انتظار کریں۔“

”آپ کا نام؟“

”نام۔“ اسے دھچکا لگا ”روشنی۔“

مری مری آواز میں اسے نام بتا کر اس نے فون بند کر دیا۔ کیا قیامت تھی کہ وہ اپنا تعارف اس کے بخشے ہوئے نام سے کرواتی تھی۔

فون کر کے وہ باہر نکلی تو سیب والے کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس نے رسٹ وایچ دیکھی صرف دو منٹ گزرے تھے۔

”لے لیے سیب۔“ مہ جبین نے اسے دیکھا اور پھر اس کے خالی ہاتھ دیکھے۔

”مہنگے دے رہا تھا آپ۔“ کھوکھلے سے لہجے میں اس نے جھوٹ بولا اور اس کے برابر بیٹھ گئی۔

”دفع کرو۔“

”وہ پھر سیٹ کے بھاؤ تاؤ میں مصروف ہو گئی۔“



اماں کے سر میں تیل کی مالش کرتے کرتے اس نے چور نظروں سے کوئی پانچویں مرتبہ نام دیکھا پونے پانچ بج رہے تھے۔

”اماں۔“ اس کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے ”میں آپا کی شادی کے لیے کیسے کپڑے بنواؤں؟“

”جیسی تمہاری مرضی بیٹا، میں بھلا آج کل کا فیشن کیا جانوں، یہ تو تم لڑکیوں کے اپنے کام ہیں۔“

”اماں، وہ مختلف ہے ناں، اس نے اپنی بہن کی شادی میں بڑا ہی خوبصورت کڑھائی کا سوٹ پہنا تھا، اس نے تو وہ کڑھائی ڈیڑھ ہزار میں

کروائی تھی مگر میں خود کر سکتی ہوں۔“

”ارے دفع کرو بیٹی ڈیڑھ ہزار میں جو کڑھائی کروائی جائے بھلا کتنی مشکل اور باریک ہوگی کا ہے کو اپنی آنکھیں کمزور کر دوں گی، کوئی آسان

سا کام کر لینا۔“

”اماں وہ بہت ہی خوبصورت سوٹ تھا اگر نمونہ مل جائے تو میں آج سے ہی بنانا شروع کر دوں ابھی تو شادی میں کافی دن ہیں، جب تک آہستہ آہستہ بنالوں گی۔“

”اچھا، پھر کبھی جاؤ تو لے آنا اس سے نمونہ۔“

”اس کا گھر تو بہت دور ہے اماں میں تو بس فون کروں گی اور اپنے بھائی یا ابا کے ہاتھ بھیج دے گی۔“

”اچھا یونہی سہی چلو اب بس کرو عصر کی نماز کا وقت ہونے والا ہے۔“ اس نے ان کے بال سمیٹ کر جوڑا بنا دیا ورتیل کی بوتل بند کرنے لگی۔

”اماں میں ذرا آشفہ کے گھر سے ایک فون کراؤں۔“

”کسے؟“ وہ حیران ہوئیں۔

”ارے ابھی کیا داستان زلیخا سنار ہی تھی آپ کو۔“ برابر بیٹھی مہ جییں ہنس دی۔

”جاؤ کراؤ، جلدی آ جانا۔“

وہ لپک جھپک ہاتھ دھو کر آئی اور چادر اوڑھنے لگی۔

”میں ساتھ چلوں؟“ مہ جییں نے اپنی خدمات پیش کیں۔

”ارے نہیں آپا۔“ وہ گھبرا گئی۔ ”بس ابھی آئی۔“

”نمبر تو لے آؤ۔“

”مجھے یاد ہے۔“ بڑی غلات میں وہ گھر سے نکل گئی۔

”کتنا کھوکھلا کر دیا ہے تم نے مجھے عالم شاہ کتنا بے اعتبار، میں تو بڑی مغرور تھی خود پر کہ سرخرو ہوں اپنے ماں باپ کے سامنے، بڑانا تھا

مجھے کہ میں نے کبھی ان سے جھوٹ نہیں بولا انہیں دھوکا نہیں دیا اور اب۔“

نمبر ڈائل کر کے اس نے غم و غصے سے سب کچھ سوچا اور پھر دوسری جانب سے ابھرتی مخمور نشیلی آواز نے اس کی سوچوں کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

”عالم شاہ مخاطب ہے۔“

”میں ضوفشاں ہوں۔“ وہ ہولے سے بولی۔

”ہوں، مجھے خوشی ہوگی اگر تم خود کو روشنی کہا کرو۔“

”جو دوسروں کی خوشیاں روندتے ہوں انہیں دوسروں کی جانب سے اتنا خوش گمان نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گئی۔

وہ ہنس دیا۔

”دوسروں کو اگر علم ہو جائے کہ ہم اپنے دامن میں ان کے لیے کتنی خوشیاں لیے ان کے منتظر ہیں تو ان کے لب یہ شکوے بھول کر پھول

برسانے لگیں۔“

وہ خاموش رہی۔

”کچھ کہنا تھا؟“ وہ چند لمحے اس کی جانب سے کسی بات کے ہونے کا منتظر رہ کر بولا۔

”جی۔“

”ہوں۔“ اس نے ہنکارا بھر کر گویا اسے بولنے کی اجازت دی۔

”وہ، میں یہ کہنا چاہتی تھی“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیا بتانے آئی تھی ”وہ..... اب آپ نے کیا سوچا ہے؟“
اپنی بات بھول کر وہ خود اس سے پوچھنے لگی۔

”میں نے؟“ وہ حیران ہوتا نہیں تھا ہو کر بڑا عجیب لگا ”سنوگی میں نے کیا کیا سوچا ہے؟“

”جی..... جی نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی ”عالم شاہ صاحب، کیا آپ اب بھی اپنی ضد پر قائم ہیں؟“

”ضد نہیں، محبت اور جو لوگ محبتوں پر قائم رہیں جھوٹے اور کھوکھلے ہوتے ہیں۔ میں بڑا سچا اور مضبوط آدمی ہوں۔“

”جو لوگ خود سچے اور مضبوط ہوں وہ دوسروں کو جھوٹا اور کھوکھلا کیوں کرنا چاہتے ہیں۔“

”مجھے بار بار اس بات کا احساس مت دلایا کرو کہ تمہاری محبتیں کسی اور کے نام ہیں۔“ وہ اچانک غرایا۔

”اسے مٹا ڈالنے کی خواہش اور اس خواہش پر عمل کے درمیان اگر تم نہ آتیں تو دنیا کا کوئی شخص اسے میرے ہاتھوں سے نہیں بچا سکتا تھا۔“

”بچانے والا کوئی شخص نہیں خدا ہوتا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی ”اور اس بے قصور شخص کا ذکر اس انداز سے مت کیا کریں۔ وہ تو چلا بھی

گیا۔“

”جانتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں اطمینان در آیا۔

”جانتے ہیں۔“ اسے حیرت ہوئی ”آپ۔“

”ہاں۔“ وہ ہنسا ”تم کیا سمجھتی ہوں میں بے خبر رہتا ہوں تمہاری دنیا سے تمہارے پل پل کر خبر مجھے رہتی ہے۔“

وہ سلگ کر چیخ کر رہ گئی۔

”آپ کو ڈر ہو گا میں کہیں بھاگ نہ جاؤں۔“

”ڈرتے تو بھاگنے والے ہیں۔“ اس کی آواز میں عجیب مسکراہٹ اتر آئی ”ہم ڈرتے نہیں، ڈراتے ہیں۔“

”اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔“ وہ زچ ہو کر بولی۔

”کب آؤں تمہارے گھر۔“

ایک گہری سانس اس کے سینے سے آزاد ہوئی۔

اس کی عمر قید کے آغاز کا وقت وہ اسی سے پوچھ رہا تھا۔

”ابھی نہیں، میں نے آپ سے یہی کہنے کے لیے فون کیا ہے، آپ جانتے ہیں وہ میری پھوپھی کا بیٹا ہے اس کے بھائی سے میری بہن کی

شادی طے ہے تین ماہ بعد میں چاہتی ہوں یہ شادی بنا کسی اختلاف کے بغیر کسی بد مزگی کے ہو جائے۔“

”ہوں۔“ اس نے ہنکار بھرا۔

”آپ مجھے اتنی مہلت تو دیں گے ناں؟“ یہ پوچھتے ہوئے اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

”مہلت تم مجھ سے دس سال کی مانگ لوروشنی، سید عالم شاہ تمہارے ایک وعدے پر اپنی عمر بتا سکتا ہے، بس ایک بات ذہن میں رکھنا کبھی

بھی مجھ سے دھوکا مت کرنا، عورت کی بے وفائی میرے لیے ناقابل برداشت ہے، میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں، تمہاری ہر خطا آنکھ بند کر کے

معاف کر دوں گا بس اپنی وفا کس میرے نام رکھنا۔ مجھ سے ہر حال میں سچ بولنا اور نہ سید عالم شاہ خود بھی مٹ جائے گا اور تمہیں بھی مٹا دے گا۔“

کبھی کبھی اس کے لہجے میں وہ تاثر ابھرتا تھا جو اس کی اندر تک سرور کرتا تھا۔

”میں، میں دھوکا نہیں دوں گی آپ کو، اس مقصد کے لیے تو میں نے کسی اور کا انتخاب کیا ہے۔“ وہ جیسے خیالوں میں گم ہو کر بولی۔

”ایک بات مانو گی۔“

”جی کہیے۔“

”میرے سامنے اس کا ذکر مت کیا کرو۔“

اس جملے میں ایک حکم بھی تھا ایک خاموش التجا بھی تھی۔ ایک عجیب فرمائش سی تھی۔

”جی بہتر، کوشش کروں گی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”پھر کیا میں امید رکھوں کہ آپ کی شادی تک آپ کوئی پیش قدمی نہیں کریں گے۔“

”سید عالم شاہ وعدہ کرتا ہے۔“ وہ فراخ دلی سے بولا۔

”اور کسی چیز کی ضرورت ہو؟۔“

”شکریہ۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی ”یقین جانیے آپ میری کوئی ضرورت پوری نہیں کر سکتے۔“ اپنی بات مکمل کر کے اس نے فون بند

کر دیا۔



بڑی محویت سے وہ مشین پر جھکی مہ جبین کے جہیز کا ایک سوٹ سی رہی تھی۔ جب مہ جبین ہنستی مسکراتی کھلکھلاتی اندر آئی۔

”ضوئی۔“

”جی کہیے۔“

”سر پرانز ہے۔“

”کس کے لیے۔“ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

اس کے ہاتھ میں دو لفافے تھے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔ چند لمحوں کے لیے وہ سب کچھ بھول گئی۔ سید عالم شاہ کا

بھوت اس کے ذہن میں کہیں دور چلا گیا۔ وہ وضو فشاں سے اجالا بن گئی۔

”آذر..... آذر کا خط ہے ناں آپ؟۔“ لہجے سے تمام تر مسرتیں عیاں تھیں۔

”اوں ہوں۔“ اس نے شرارت سے نفی میں سر ہلایا۔

”آپا پلینز۔“ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی ”نہ ستاؤ نا پلینز آپا۔“

”یہ لو کیا یاد کرو گی کس نخی دل آپا سے پالا پڑا تھا۔“ اس نے حاتم طائی بن کر آخر سے خط سے نواز دیا ”بڑا چالاک ہے یہ آذر دو خط بھیجے

ہیں ایک ہم سب کے نام اور ایک صرف تمہارے نام۔“

”بے تابی سے اس نے لفافہ چاک کیا اور سطروں پر نظریں دوڑانے لگی۔ اس نے لکھا تھا۔

اپنی اجالا کے نام

جس کے نام سے میری زندگی میں اجالے ہیں۔

دعا ہے کہ بہت سی خوشیاں تمہارے ارد گرد رقصاں ہوں، بہت سی روشنیاں تمہیں اپنے ہالے میں لیے رہیں۔

پیاری اجالا مجھے علم ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو گی۔ کئی دنوں سے میرے خط کی منتظر ہو گی، لیکن کیا تمہیں اس بات کا عمل ہے کہ میں اتنے دن

سے خفا رہا ہوں، سوچتا رہا کہ بے چین ہو کر تم از خود مجھے یاد کرو گی مجھے خط لکھو گی۔ پتا تو تم امی سے لے سکتی تھیں ناں، آفس آتا تو یقین ہوتا کہ ابھی

تمہارا خط پہنچتا ہو گا۔ اسی انتظار میں پورا دن گزار دیتا۔ واپس لوٹتے ہوئے خیال رہتا کہ شاید تم نے رہائش گاہ کے پتے پر خط لکھا ہو اور میری میز پر سجا

سارا دن تمہارا خط میرا انتظار کرتا رہا ہو، اس خیال میں ایسی خوشی ہوتی جیسے خط نہیں بلکہ تم میرے آفس سے لوٹنے کی منتظر ہو، لیکن ایک ایک کر کے

بہت سے دن بوجھل، تھکے اداس قدموں سے لوٹ گئے، تم نے اپنی ضد نہیں چھوڑی سوچا کسی ایک نے تو ہار مانی ہے ناں تو پہل میں کیوں نہ کر لوں،

چلو نہ تم خفا نہ میں، اب تو راضی ہوناں، اجالا میرا دل یہاں نہیں لگتا دل ہو تو لگے بھی کبھی کبھی جی میں آتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان کا ٹکٹ کنفرم کرا لوں لیکن پھر سوچتا ہوں کہ تم نے آتے سے ایک فرمائش کی تھی اگر تمہاری ایک فرمائش بھی پوری نہ کر سکا تو وہ یہ وجود کس کام کا، مجھے یقین ہے جب میں سرخرو ہو کر لوٹوں گا تو تمہارا ہنستا مسکراتا وجود مجھے خوش آمدید کہے گا۔ تم میری منتظر رہو گی۔ ہر حال میں، ہر موسم میں۔

اگر لڑائی ختم ہو گئی ہو تو اب مجھے جلدی سے خط لکھ دینا۔ تمام تر شدتوں سے منتظر ہوں۔

اپنی ہر دعا تمہارے نام لکھتا۔

آذر

اس نے خط پڑھا، پھر پڑھا بار بار پڑھا۔ اور پھر طمانیت کے بھرپور احساس کے ساتھ ہنس دی۔

”آذر۔“ اس نے زیر لب کہا ”آذر..... آذر“

اور پھر..... اس کی مسکراہٹوں نے دم توڑ دیا خوف، وہم، اندیشوں کے بے شمار ناگ اس کے ذہن کی ہر گ سے لپٹ گئے، اور سید عالم شاہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کی نگاہوں کے پردے پر نمودار ہو گیا۔

خط اس کے ہاتھوں میں پھر پھر ایا اور قید سے آزاد ہو کر دور چلا گیا۔ دیوانوں کی طرح بھاگ کر اس نے خط اٹھایا اور اسے چوم کر بولے ہوئے رونے لگی۔



دن اتنی تیزی سے گزرتے چلے گئے جیسے کسی نے پنجرے کا دواڑہ کھول دیا اور پرندے باہر نکل نکل کر آسمان کا رخ کر رہے ہوں، ضوفشاں کو یوں لگتا جیسے اس کی دونوں مٹھیوں میں ریت بھری ہے جو لمحہ بہ لمحہ پھسل رہی ہے اور اس کی مٹھیاں خالی ہوتی جا رہی ہیں۔

اس نے خود کو ہر ممکن کوشش سے کاموں میں الجھایا ہوا تھا۔ ہر لمحہ مصروف تر رہنے کی سعی کیا کرتی لیکن دماغ کے پردے پر از خود ایک فلم سی چلتی رہتی کبھی وہ عالم شاہ کو دیکھتی، دیکھتی ہی چلی جاتی، اور کبھی ایسا ہوتا کہ ریل الٹی چلنے لگتی۔ پھر وہ آذر کے ساتھ ہوتی۔

پھولوں میں، خوشبوؤں میں بسی چاندنی میں جگنوؤں سے بچی، وہ اجالا بن جاتی اور آذر کی ہمراہی میں ایک دنیا کی سیر کر آتی۔ اسے لگتا اپنی سوچوں کو اب وہ کبھی بھی ایک مرکز پر جمع نہیں کر پائے گی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انتشار کا شکار ہو گئی ہے۔

پھوپھی جان بڑے دن بعد آئی تھیں ضوفشاں ان سے لپٹی تو اس کا الگ ہونے کو جی نہ چاہا۔

”کیسی ہے میری بچی۔“ انہوں نے پیار سے اس کی پیشانی چومی۔

”آپ کیس ہیں پھوپھی ٹھیک ہیں نا۔“ اس نے جواباً ان کا ہاتھ تھام کر چوما۔

”مزے میں ہوں اپنی بچیوں کے انتظار میں ہوں۔“ خوش دلی سے بولیں۔

اماں نے اسے چائے بنانے کا کہا مگر وہ ڈھیٹ بنی پھوپھی جان سے چپکی بیٹھی رہی اسے ان کا وجود اتنا اچھا اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ اس کا دل چاہ رہا تھا ایک عمران کے پہلو میں ہی گزار دے۔

”آذر کا خط آیا تھا۔“ اماں نے پھوپھی کو بتایا۔

”ہاں، وہاں بھی دو تین خط بھیج چکا ہے۔“ وہ ہنسیں ”عاصم نے فون کی درخواست تو دے دی ہے دیکھو اب کچھ دنوں میں لگ جائے گا پھر آرام سے فون پر بات ہو جایا کرے گی اور اس لڑکے کا پاگل پن دیکھو، خط میں لکھتا ہے کہ جب پہلا فون کروں تو ضوفنی کو ضرور بلوا لینا اس سے ضرور بات کروں گا۔“

اماں اور پھوپھی ہنس دیں۔ وہ بھی سب کچھ بھول کر مسکرا دی تھی۔

”بچپن سے ہی کہاں رہتا تھا وہ اس کے بغیر۔“ اماں مسکراتے ہوئے بتانے لگیں ”یاد ہے نگار تمہیں، سارا سارا دن اسے گود میں لیے بیٹھا رہتا تھا۔“

”ہاں اور میں نے تب ہی تم سے کہا تھا کہ دیکھنا میرا بیٹا ایک دن اسے اپنے ساتھ ہی لے جائے گا تب تک تو مدہ جہیں اور عاصم کی بھی کوئی بات نہ ہوئی تھی۔“

”ضوفشاں اٹھ کر باورچی خانے میں آگئی، عالم کا خیال اب اسے زیادہ دیر خوش نہیں ہونے دیتا تھا وہ ذرا ہنستی مسکراتی اور پھریوں سہم جاتی جیسے کسی عفریت کو سامنے دیکھ لیا ہو۔“

”کیا ہوا یہ شکل پر بارہ کیوں بجنے لگے؟“ مدہ جہیں نے اس کا ستا ہوا چہرہ حیرانی سے دیکھا ”ابھی تو باہر تم ہنس رہی تھیں۔“

”کچھ نہیں آیا۔“..... وہ چائے کے لیے پانی لینے لگی ”آپ تو ایکسرے مشین بن جاتی ہیں۔“

”کس کے ساتھ آئیں پھوپھی اماں؟“ وہ چہرہ اچھیر کر بظاہر بے نیازی سے پوچھنے لگی۔

”ضوفشاں نے چولہا جلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور اسی سے مسکرائی۔“

”آپ کے“ وہ“ چھوڑ گئے ہیں۔“

”اندر نہیں آئے؟“

”نہیں واپسی میں شاید آئیں اور یہ سوال جواب اتنی بے نیازی سے نہ کیا کریں۔ میں اتنی پاگل تو نہیں ہوں کہ آپ کے دل میں ہوتی کھد بد سے ناواقف بچوں کی طرح جواب دے دیا کروں۔“ اپنی پریشانی بھول کر مسکراتے ہوئے اسے چھیڑنے لگی۔ مدہ جہیں کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”تم تو ہر بات میں گونا گونا کناری سجالیتی ہو، اس کا کیا علاج۔“

”گونا گونا کناری اب آپ اپنے کپڑوں میں سجا ئیں، اور ذرا جلدی جلدی، جانتی ہیں ناں ڈیر ھ مہینہ رہ گیا ہے پیادیس سدھار نے میں۔“

”یہ اپنے پیار کی بات کی گئی ہے یا میرے۔“ مدہ جہیں ہنس دی ”کہیں میرے پردے میں اپنا دل تو خوش نہیں کر رہی ہو؟“

”ضوفشاں بھی ہنس دی پھر اگلے ہی پل خاموش ہو گئی اس کے ذہن میں وہ تمام راستے بنے اور بن کر مٹے جو آذر کے گھر تک جاتے تھے۔“

”تم نے آذر کے خط کا جواب نہیں دیا ضوفنی۔“ کچھ دیر بعد مدہ جہیں نے پوچھا۔

”جی۔“ اس نے گہرا سانس لیا ”دے دوں گی جلدی بھی کیا ہے۔“

”ضوفنی۔“ مدہ جہیں کچھ دیر بعد بولی تو اس کی آواز میں ایک گہری سوچ تھی۔ ”ایک بات پوچھوں برا تو نہیں مان جاؤ گی۔“

”کمال کرتی ہیں آپ۔“ وہ چائے چھانتے ہوئے بولی۔

”کبھی آپ کی بھی کسی بات پر برا منایا ہے میں نے کہیے۔“

”تم، تم کچھ بدل سی گئی ہو۔“

”وہ کیسے۔“ اس نے بغور اسے دیکھا۔

”تمہیں اب پہلے کی طرح آذر کی پروا نہیں رہی۔ ایسا لگتا ہے تم جان بوجھ کر اسے انکسور کرنے کی کوشش کرتی ہو، نہ وہ تمہیں یاد آتا ہے، نہ تم اس سے بات کرنا چاہتی ہو، نہ اس کے خط کا جواب دینا تمہیں ضروری لگتا ہے، کیا ہوا ہے تمہیں؟ ادھر اس کا حال یہ ہے کہ جو خط اس نے مجھے اور اماں کو مخاطب کر کے لکھا ہے وہ آدھے سے زیادہ تمہارے ذکر پر مبنی ہے۔“

ضوفشاں نے میں کپ رکھتی رہی اور اس کی بات سنتی رہی۔ وہ اپنی بات مکمل کر چکی تو اس نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

”آپا کبھی کبھی انسان کسی سے اتنی محبت کر ڈالتا ہے کہ دل خالی خالی لگنے لگتا ہے جیسے کچھ کہنے کو کچھ کرنے کو بچا ہی نہ ہو، میں نہیں چاہتی کہ

میرے ساتھ ایسا ہی ہو وہ کہا ہے ناں شاعر نے کچھ باتیں ان کہی رہے دوسب باتیں دل کی کہہ لیں اگر، پھر باقی کیا رہ جائے گا۔“
 ٹرے اٹھا کر وہ باورچی خانے سے نکل آئی۔



کال بیل کی آواز پر وہ چونکی اور سوئی ڈوپٹے میں الٹا کر کپڑے درست کرتی دروازے کی سمت چل دی۔ اماں اور مہ جہیں آج پھوپھی
 اماں کیساتھ مارکیٹ گئی ہوئی تھیں۔

پھوپھی اماں نے مہ جہیں کی پسند سے اس کا عروسی جوڑا لینا تھا۔
 ’کون ہے۔‘ تجربات نے اسے دروازہ کھولنے سے قبل استفسار کرنا سکھا دیا تھا۔
 ’جی پوسٹ مین۔‘

پوسٹ مین کی مخصوص آواز سنتے ہی اس نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔ حسب توقع دو لفافے تھے جن میں سے ایک پر اس کا نام درج
 تھا آذر کی وہی مخصوص ہینڈ رائٹنگ تھی۔

اس نے جلدی جلدی لفافہ چاک کیا اور بے تابی سے خط پڑھنے لگی، لکھا تھا۔
 پیاری اجالا!

کیا حوصلے اس طرح آزمائے جاتے ہیں؟

پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ تمہاری اس چپ کی وجہ کی ہے کیا تم میری محبتوں کو آزمانا چاہتی ہو یا تمہاری اپنی محبتوں میں کمی ہو گئی ہے، سنا تھا
 جدائی محبت کی کسوٹی ہوتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں اس کسوٹی پر۔۔۔۔۔ خیر جانے دو۔ ایسی کوئی بات میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ لیکن اتنا بتا دو اس گریز کی وجہ
 کیا ہے۔ میں نے کتنے ارمانوں سے گھر فون کیا تھا۔ سوچا تھا کہ اتنے دن بعد تمہاری مدھم تانوں سے نئی آواز اپنی سماعتوں میں اس طرح سے جذب
 کراؤں گا کہ اگلے کئی دن سکون و اطمینان سے سرشار رہوں گا۔ لیکن علم ہوا کہ تم نے مجھ سے فون پر بات کرنے سے انکار کر دیا ہے اجالا!۔۔۔۔۔!

میں کیا سمجھوں مجھے اتنا تو سمجھا دو

اپنی ہر دعا تمہارے نام لکھتا

آذر

اس نے افسردگی سے کئی بار خط پڑھا پھر لفافے میں رکھ کر اس کے باقی خطوط کے ساتھ رکھ دیا۔

’تمہیں کیا سمجھاؤں آذر، میرے تو اپنے ارد گرد سوالیہ نشان بکھرے ہوئے ہیں۔‘

’آذر کا خط آیا ہے۔‘ مہ جہیں مارکیٹ سے لوٹ کر بڑی مسرت سے میز پر رکھا لفافہ اٹھایا تھا۔

’تمہارے نام بھی تو آیا ہو گا ناں۔‘ لفافہ چاک کرتے ہوئے وہ پوچھنے لگی۔

’نہیں۔‘ اب وہ بڑی آسانی سے جھوٹ بول لیا کرتی تھی ’صرف ایک ہی خط تھا۔‘

’حیرت ہے۔‘ وہ خاموش ہو کر اس کا خط پڑھنے لگی۔

’کیا لکھا ہے۔‘

ضوفشاں کے پوچھنے پر اس نے خط اسے دے دیا۔ وہی عام سی باتیں تھیں۔ اپنا حال بتایا تھا۔ سب کا پوچھ لیا تھا۔ مہ جہیں سے کچھ مذاق
 کیے تھے۔

’اس دفعہ اس نے تمہیں خط کیوں نہیں لکھا؟‘ مہ جہیں کو حیرانی تھی۔

”ناراض ہو گیا ہے شاید۔“ وہ ہولے سے ہنسی۔

”ہاں شاید اور ہونا بھی چاہیے تم نے کتنا ظلم روا رکھا ہے بے چارے کے ساتھ نہ اسے خط لکھتی ہونہ فون پر بات کرنا چاہتی ہو، چاہتی کیا ہو آخر۔“ وہ غصے سے پوچھنے لگی۔

”آپ نے کیسا جوڑا پسند کیا؟“ اس نے بات بدل دی۔

”ارے ہاں ضوفی میں نے گہرے لال رنگ کا جوڑا پسند کیا ہے۔ ہر بار ڈر ہے اور بھاری کام ہوا ہے اس پر، ویسے کے لیے فیروزی اور آف وہائٹ کنٹراسٹ بتایا ہے ٹھیک ہے ناں۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرا دی ”آپ ویسے بھی ہر رنگ میں تجتی ہیں۔“

”اب بناؤ مت۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”میں نہیں، عاصم بھائی کہہ رہے تھے۔“

”کب؟“ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی اور پھر اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی شرارت دیکھ کر شرمندہ ہو گئی ضوفشاں ہلکا سا تہقہ لگا کر اس سے لپٹ گئی۔

”ارے ضوفشاں۔“ مہ جہیں کو جیسے کچھ خیال آیا۔

”ایک بات تو بتائی ہی نہیں۔“

”ایسی کون سی خاص بات ہے“

”اس کے لہجے میں اشتیاق محسوس کر کے وہ بولی۔

”یاد ہے وہ جوڑا جو عالم شاہ نے تمہیں بھیجا تھا آج میں نے دیکھا بالکل ویسا ہی رنگ ویسا ہی کام ایک بڑی سی دکان کے شوکیس میں لگا تھا میں نے قیمت پوچھی اور بے ہوش ہوتے ہوتے بچی، چالیس ہزار کا جوڑا ہے وہ۔“

”چالیس ہزار۔“ ضوفشاں کے ہوش اڑ گئے ”کیا سونے سے بنا ہوا تھا؟“

”بہت قیمتی اور نازک کام ہے اس پر، کپڑا نظر ہی کہاں آتا ہے شید جھلکتا ہے۔“

اور ضوفی وہ ملتان سیٹ اسی سے ملتا جلتا قدرے ہلکا سیٹ تیس ہزار کا ہے۔ تو سوچو وہ بھاری سیٹ کتنا قیمتی ہوگا۔ اور پھر وہ کڑے پورا لاکھ روپیہ خرچ کر ڈالا تھا تم پر تمہارے سید عالم شاہ نے۔“

”ہم نے کون سا رکھ لیا اس کا لاکھ روپیہ۔“ وہ چڑ گئی۔ ”منہ پر تو دے مارا اور آپ کیا مارکیٹ میں عالم شاہ کی مارکیٹ ویلیو معلوم کرتی پھر رہی تھیں۔“ مہ جہیں کو ہنسی آ گئی۔

”نہیں بھئی، اتفاقاً نظر پڑ گئی چیزوں پر تو میں نے قیمت پوچھ لی ہمیں کیا اس سے اور اس کی دولت سے۔“

”ویسے آپ ایک بات ہے۔“ وہ کچھ سوچ کر بولی۔

”امیر آدمی سے شادی کرنے میں بھی ایک الگ ہی چارم ہے اب دیکھیں ناں منگنی میں ایک لاکھ کا سامان اس پورے محلے میں بھی کسی لڑکی کا آیا ہوگا۔“

”ہیں۔“ مہ جہیں نے اسے غور سے دیکھا ”ہوش میں تو ہو زیادہ چارم تلاش مت کرو اور اتنی ہی دولت کو کافی سمجھو جو محترم آذر صاحب تمہارے لیے دن رات ایک کر کے کمپائے گا۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”آذر ساری عمر لگا دے ناں آپا، تو عالم شاہ کی دولت کا دستواں حصہ بھی نہیں کمپائے گا۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”پھر لکھ دوں اسے؟“ اس نے دھمکی دی ”کہ کمانا و مانا چھوڑ دو اور پہلے یہاں آ کر اپنی منگیتر سنبھالو جس کا دل سید عالم شاہ کی دولت کھینچ

رہی ہے۔“

”صرف دولت نہیں، وہ ہینڈسم بھی بہت ہے۔“ وہ شرارت سے بولی۔

مہ جبین نے اسے تکیہ کھینچ مارا۔

”میرے معصوم دیور کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو حشر کروں گی تمہارا۔“

”ارے واہ ابھی تو شادی میں بھی پورے بیس دن ہیں اور بہن کو بھول بھال دیور کی ہو گئیں۔ یہ لڑکیاں ہوتی ہی ایسی ہیں بے وفا۔“ اس

نے تکیہ کھینچ کیا۔

”ضوئی۔“ پھر وہ یکاخت اشتیاق سے بولی ”واقعی بہت ہینڈسم ہے وہ شاہ؟“

”ضوفشاں ہنس دی۔

’ہاں ہے تو‘ کیوں آپ کو کیوں تجسس ہوا؟۔“

”شوق تو ہے مجھے اس کو دیکھنے کا لیکن خدانہ دکھائے۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔

”خدانہ دکھائے۔“ اس نے زیر لب اس کی بات کو دہرایا اور سوچنے لگی ”ہاں واقعی کیا ایسا نہیں ہو سکتا عالم شاہ کہ تم مر جاؤ، اچانک ہی کوئی

مہیب حادثہ تمہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لے، گاڑی تیزی سے چلاتے ہوئے اچانک ہی تمہاری آنکھوں میں دھند اتر آئے، تمہارا راستہ اندھیروں

میں ڈوب جائے۔ تم کسی گہرے کھڈ میں جا گرو اور کوئی تمہاری لاش بھی وہاں سے نہ نکالے۔ اے خدا ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔“ اس نے دل کی

گہرائیوں سے دعا مانگی۔

”کیا سوچنے لگیں؟۔“ مہ جبین اسے دیکھنے لگی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔



بڑی محنتوں، بڑی محبتوں، بڑی دعاؤں کے ساتھ اس نے مہ جبین کو تیار کیا تھا۔ اور جب مکمل تیار کر کے اس نے اس کی پیشانی پر اپنے

ہونٹ رکھے تو سارے ضبط حوصلے جواب دے گئے۔

دونوں بہنیں ایک دوسرے سے لپٹ کر تمام تر شدتوں سے رو دیں۔

’آپ میری پیاری آپا۔‘ وہ کہے جا رہی تھی۔

”ضوئی ضوئی۔“ ادھر سے بھی ایک ہی تکرار تھی۔ کتنے لمحے تھے جو ساتھ دیے تھے ہنستے ہوئے مسکراتے ہوئے، کتنی خوشیوں کو بانٹا تھا کتنے

غموں میں ایک دوسرے کے کاندھوں کو سہارا دیا تھا۔

”ضوفشاں بہت بری بات ہے۔“ مینا نے دونوں کو علیحدہ کیا۔ ”اسے تو رونا آنا ہی آنا ہے، تم بجائے اسے حوصلہ دینے کے، چپ کرانے

کے خود دیوانوں کی طرح رو رہی ہو۔“

”مجھے رونے دو۔“ وہ بگڑی ”میری آپا ہمیشہ کے لیے پرانی ہو گئیں میں روؤں بھی نہیں۔“

”اچھا بے شک روؤ اسے بھی رلاؤ اور اپنی تین گھنٹے کی محنت مٹی کر لو دیکھو اس کا کا جل پھیل رہا ہے۔“

”ضوفشاں نے اسے غور سے دیکھا اور جھٹ آنسو پونچھ ڈالے۔

”بس آپا اب رونا نہیں تمہارا تو کچھ نہیں جائے گا عاصم بھائی میری گردن پکڑ لیں گے کہ میری معصوم صورت بیوی کو چڑیل کیوں بنا ڈالا۔“

مہ جبین روتے روتے ہنس دی۔

”دیش گڈ“ مینا نے دونوں کو شاباش دی۔

”چلو صوفی اب تم بھی فٹ تیار ہو جاؤ بارات آتی ہوگی۔“

وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ یہاں دوسرے حصوں کی نسبت سکون تھا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے وہ بستر پر بیٹھ گئی اور ایک بار پھر رونے لگی۔

مہ جبیں سے پچھڑنے کا دکھ، آذر سے پچھڑنے کا دکھ، عالم شاہ کی بخشی مہلت ختم ہونے کا خوف، ہر کسی کا سامنا کرنے کا ڈر، بے شمار مرحلوں سے گزرنے کا ڈر، اس کی تنہا کیلی جان پر کتنے اندیشے سوار تھے۔ کسی کو اندازہ تک نہ تھا اسے بیٹھے بیٹھے لگتا کہ بس اب وہ مرجائے گی پورا دن اندھے واہموں سے لرزے لگتا اندر جسم کی عمارت ٹوٹ ٹوٹ کو جھڑنے لگتی۔ وہ بکھرے لگتی۔

”آہ۔“ اس نے درد سے چپختے کاندھوں اور گردن کو ہاتھوں سے دبایا ”کون سی منحوس گھڑی تھی عالم شاہ جب تم سے سامنا ہوا تھا، میری ذات کو اس سے وابستہ خوشیوں کو کس بے دردی سے کچلا ہے تم نے، اپنی زندگی کے بے رنگ خانوں میں رنگ بھرنے کے لیے مجھے مہندی کی طرح سے پس ڈالا ہے۔ اپنی ہستی کو فنا کر کے تمہیں رنگینیاں دوں، کیوں کس لیے؟“

اپنے آپ سے سوال کرتے کرتے وہ تھک گئی پھر اٹھ کر تیار ہونے لگی۔

کتنا خوش ہونا چاہیے تھا اسے اس موقع پر، کتنی بڑی خواہش پوری ہو رہی تھی اسکی، اس کی آپا دلہن بنی تھیں، عاصم بھائی اس کے پیارے بھائی کتنا خوبصورت رشتہ بن رہا تھا ان سے، اور آذر! ان کے دل مزید کتنے قریب ہو جاتے۔

لیکن وہ کیسے خوش ہوتی، خوشیوں اور اس کے بچ عالم شاہ اپنے پورے غرور کے ساتھ کھڑا تھا۔

وہ تیار ہو کر خود کو آئینے میں دیکھتی رہی۔ اس نے اور آذر نے اس موقع کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ بڑی باتیں کر رکھی تھیں۔ بڑی منصوبہ بندیاں کی تھیں۔

”عاصم بھائی اور مہ جبیں کی شادی میں میرے حصے کی باتیں بھی تم کر لینا ہر رسم میں میری جانب سے حصہ لینا۔“

”میرا تو تمہاری زندگی ہی میں کوئی حصہ نہیں رہا آذر۔“ سر آہ بھر کر اس نے سوچا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

سب کچھ سکون کے ساتھ طے پا گیا۔ مہ جبیں اس کی اماں کی ابا کی بے شمار دعائیں سمیٹ کر عاصم بھائی کے سنگ چل دی۔ وہ دہلیز پر سسکتی اماں کو سمجھاتی، چپ کراتی، ساتھ اپنے آنسو بھی پونچھتی رہی۔

”بیٹا! اپنی اماں کو اندر لے جاؤ لٹا دو اسے۔“

”ابا اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر چلے گئے وہ اماں کو سہارا دے کر اندر لے آئی اور انہیں پانی پلا کر ان سے باتیں کر کے ان کا دھیان بنانے لگی۔ لیکن اس کا اپنا دھیان کسی اور فضا میں تیر رہا تھا۔



دوسرے دن وہ اماں، ابا کے ساتھ مہ جبیں سے ملنے گئی تھی۔

ابا پھوپھا کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھے اور اماں، پھوپھی کے ساتھ، وہ موقع پا کر مہ جبیں کو تنگ کر رہی تھی۔

”سچ بتائیں آپا کیا کیا باتیں کیں عاصم بھائی نے، مجھے یقین ہے ان کے پیٹ میں پوری گز بھر کی داڑھی ہے اوپر اوپر سے معصوم بننے ہیں اندر پورے ہوں گے۔ بتائیں ناں اظہار عشق کیسے فرمایا۔“

”توبہ ہے صوفی تم تو بڑی بے شرم لڑکی ہو۔“ وہ چڑ گئی۔

”ارے واہ، انہوں نے باتیں بگھاریں، آپ نے سنیں اور بے شرمی کا لیبل مجھ پر۔“ وہ اچھلی، مہ جبیں کو ہنسی آگئی۔

”ارے ضوفی چندا کیا پوچھنا ہے تم ڈائریکٹ مجھ سے کیوں نہیں پوچھ لیتیں۔“ عاصم بھائی اندر آتے ہوئے بولے۔
وہ سر کھجا کر رہ گئی۔

”اب بولو۔“ مہ جبین نے اسے کہنی ماری۔

”عاصم بھائی کیسا تیار کیا تھا میں نے؟“ اپنی کارکردگی پر داد وصول کرنے کا موقع ملا۔
”ہائیں تو وہ تم تھیں۔“ انہوں نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا ”بولو کیا سزا دوں۔“ وہ حیران ہوئی۔
”یعنی مجھے رات کو ڈرانے کا منصوبہ بنایا تھا دونوں بہنوں نے۔“
مہ جبین کھلکھلا کر ہنسی جب کہ وہ ناراض ہو گئی۔

”اچھا تعریف کے دو لفظ تو کہے نہیں گئے! انہیں مجرم ٹھہرا دیا۔ کوئی بات نہیں آج شام ویسے میں دیکھتی ہوں کیسے تیار ہوتی ہیں آپ کی بیگم اطلاع عرض ہے کہ انہیں لپ اسٹک پکڑنی بھی نہیں آتی۔“

”ارے..... رے..... رے ناراض ہو گئی ہماری بہن، ابھی تم نے ایسا غضب کا سجا یا تھا انہیں کہ جب انہوں نے منہ دھویا تو میری تو چیخ نکل گئی۔ ایسے ڈراتھا میں تمہارے کیے گئے میک اپ کو انزام تھوڑا ہی دیا تھا میں نے۔“ انہوں نے وضاحت کی۔
اب مہ جبین کے ناراض ہونے کی باری تھی جب کہ وہ زور سے ہنسی تھی۔

”ارے ابھی بچو! جلدی آؤ۔“ پھوپھا تیزی سے اندر داخل ہوئے تھے ”آؤ رکافون آیا ہے۔“
”آچھا..... آؤ جبین، ضوفی بات کرتے ہیں۔“ عاصم بھائی اٹھ کر تیزی سے کہتے ہوئے نکل گئے۔
”چلیے محترمہ۔“ مہ جبین نے اسے چھیڑا۔ ”کچھ اپنی کہہ لیں کچھ ان کی سن لیں۔“

”مہ جبین کے جانے کے بعد بھی وہ تھوڑی دیر وہیں بیٹھی رہی دل بری طرح سے دھڑکنے لگا تھا اتنے دن بعد اس دشمن جان کو سننے کا خیال اس کے ہاتھوں پاؤں سرد کیے دے رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کیا کہے گی۔ کس سوال کا جواب دے گی۔
کچھ دیر بعد مہ جبین پلٹ کر آئی۔

”ہوں، تو بڑی چالاک ہو گئی ہے میری بہن۔“ وہ ہنس کر بولی۔
ضوفی نشان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”دیر لگائی تاکہ سب بات کر لیں تو اطمینان سے اکیلے میں باتیں کرو۔“
”نہیں آپا۔“ اس نے بولنے کی کوشش کی۔

”چلو جلدی آؤ سب بات کر چکے ہیں کمرے میں کوئی نہیں ہے تم آرام سے بات کر لو۔“
”آپا۔“ اس نے التجاسی کی ”مجھے ڈر لگ رہا ہے اسے کہو میں آئی ہی نہیں ہوں۔“

”ارے“ وہ ہنس دی ”پاگل ہو گئی ہو ضوفی وہ آؤ رہے، وہی آؤ رہے جس سے تم گھنٹوں باتیں کرتی تھیں اور تمہاری باتیں ہی ختم نہیں ہوتی تھیں۔ چلو شاباش وہ بلا رہا ہے تمہیں۔“

مرے مرے قدموں سے وہ دوسرے کمرے میں آئی عاصم نے ریسیور تھمایا اور گڈ لگ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔
ریسیور کان سے لگا کر اس نے تھوک لگا۔

”ہیلو.....“

”اجالا۔“

اس ایک لفظ میں کتنی شدتیں کتنے اظہار تھے، اس سے کچھ پوشیدہ نہ تھا۔

”کیسی ہوا جالا؟“

”تم کیسے ہو آذر۔“ اس نے اپنا حال چھپا لیا ”ٹھیک ہونا۔“

”بس اس طرح جینے کو اگر ٹھیک ہونا کہتے ہیں تو میں بالکل ٹھیک ہوں“ وہ دھیمے سروں میں بولا ”کچھ پوچھ سکتا ہوں تم سے۔“

”آذر۔“ اس نے آنکھیں سختی سے بند کر لیں ”کتنے دن ہو گئے ہیں ناں تمہیں گئے ہوئے۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسا ”تمہیں شاید آج مجھے سن کر یہ احساس ہوا ہے۔“

”ظن کر رہے ہو؟“

”نہیں، اچھا جانے دو۔“ پھر اس نے خود ہی جون بدل لی ”آج میں اتنا خوش ہوں کہ تم سے کوئی شکوہ بھی نہیں کروں گا شادی میں مزا

آیا؟“

”نہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”کیوں؟“ وہ حیران ہوا پھر ہنس دیا۔ ”میں نہیں تھا اس لیے ناں۔“

”نہیں اس بات کو تو میں نے محسوس بھی نہیں کیا بس مزا کیا آنا تھا جیسے تیسے ہو گیا سب کچھ۔“

وہ تھوڑی دیر کے لیے بالکل خاموش ہو گیا پھر بولا۔

”مجھے یاد کرتی ہوا جالا؟“

”پتا ہے آذر اتنی مصروفیت میں یہ عرصہ گزرا ہے کہ مجھے ہوش نہیں تھا کہ میں تمہیں کیا یاد کرتی تم بھی تو وہاں مصروف رہتے ہو گے ہے

ناں۔“

”ہاں، رہتا تو ہوں، لیکن جنہیں یاد آنا ہو وہ مصروفیت کہاں دیکھتے ہیں، تمہاری مصروفیت شاید کچھ انوکھی تھی۔“ وہ بالکل مرجھا گیا تھا۔

وہ کچھ بولی نہیں ہو لے سے ہنس دی۔

”کچھ بات نہیں کرو گی؟“ کچھ دیر بعد وہ پھر بولا۔

”کیا بات کروں سمجھ میں نہیں آ رہا تمہارا بھی تو بل بن رہا ہو گا ناں۔“ وہ چپ ہو گیا پھر بولا۔

”اچھا جالا خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“

اس نے پہلے ہی ریسور رکھ دیا۔ پھر سر جھکا کر بری طرح ہانپنے لگی۔ کیا قیامت گزر گئی تھی اس پر وہ خود ہی جانتی تھی۔

اسے سنا، محسوس کیا پھر بھی کھنچی رہی۔ اسے ستاتی رہی اس کا دل توڑ دیا۔

”کیا کچھ نہیں کیا تھا اس نے ان چند لمحوں میں۔“

”صرف تمہاری ہی نہیں بہت سے لوگوں کی خوشیوں اور بہتری کے لیے۔“

اس نے سوچا اور آنکھوں میں امنڈتے آنسوؤں کو سختی سے رگڑ دیا۔

”تم کیوں چلے آتے ہو بار بار کم از کم مجھے بہادر تو بنانا ہے نہ دو۔“

اپنے آنسوؤں سے، لڑتی وہ اٹھ کر باہر کی طرف چل دی۔



کیا ہے پیار جسے ہم نے زندگی کی طرح
وہ آشنا بھی ملا ہم سے اجنبی کی طرح
ستم تو یہ ہے کہ وہ کبھی بھی نہ بن سکا اپنا
قبول ہم نے کیے جس کے غم خوشی کی طرح
بڑھا کے پیاس مری اس نے ہاتھ جھوڑ دیا
وہ گر رہا تھا مروت بھی دل لگی کی طرح
کبھی نہ سوچا تھا ہم نے قاتل اس کے لیے
کرے گا ہم پہ ستم وہ بھی ہر کسی کی طرح

ہاتھوں میں لرزتے کاغذ پر اس کے کئی آنسو گرے اور اپنے نشان چھوڑ گئے۔ نچلا ہونٹ سختی سے دانتوں میں دبائے وہ کسی بے جان بت کی طرح سے بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ صرف بہتے آنسو تھے جو اس بے جان بت میں زندگی ہونے کا ثبوت تھے۔

ابھی کچھ دیر قبل ڈاک سے اسے آذر کا خط موصول ہوا تھا اسے صرف لفافے پر اس کا نام لکھا تھا اندر خط میں کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر محض چند اشعار تحریر تھے۔ لیکن ہر ہر لفظ اپنے اندر اس کے ذہنی کرب اور تکلیف کا گواہ تھا۔ ہر شعر میں آذر کا ذہنی انتشار پوشیدہ تھا۔

اس کا سر درویدہ اس کے لیے کن اذیتوں کا موجب بنے گا۔ اسے پہلے سے علم تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ جو کام وہ کرنے جا رہی تھی وہ آذر کی زندگی میں ایسی تلخیاں گھول دے گا کہ ساری عمر اسے اپنی سانسوں میں زہری آمیزش محسوس ہوا کرے گی۔ لیکن وہ مجبور تھی۔ نہ صرف اس کی بلکہ بہت سے لوگوں کی خوشیاں بھی اس کے اسی فیصلے میں پنہاں تھیں اور خود اسے بہت حوصلے سے کام لینا تھا۔

آنسو پونچھ کر اس نے خط لفافے میں رکھا اور حسب معمول اس کے باقی خطوں کے ساتھ رکھ دیا۔ فی الوقت وہ گھر میں تنہا تھی۔ مہ جبین اور رعاصم بھائی چھٹیاں گزارنے گئے ہوئے تھے اور پھوپھی جان نے اماں اور ابا کو ملنے کے لیے بلوایا تھا۔ اماں نے اسے بھی چلنے کا کہا تھا لیکن وہ نال گئی اب اس کا کہیں بھی جانے کو دل نہیں چاہا کرتا تھا اور پھوپھی اماں کے گھر جا کر تو سانس لینا دشوار لگتا تھا، ہر چیز سے آذر کی یاد جیسے روشنی بن کر اٹکا کرتی تھی۔

بہت دیر تک وہ صحن میں ستون سے ٹیک لگائے کھڑی رہی آذر کا خط ملتے ہی بیک وقت کتنی ہی یادیں اس پر حملہ آور ہوا کرتی تھیں۔ یہی صحن تھا ہاں وہ آکر بیٹھتا تھا، تو ہر سوراخ سے نکلتی بکھر جاتا کرتی تھیں اس کی مسکراہٹیں اس کی شرارتیں اس کی نظریں ضوفشاں کے آنچل سے بندھی رہا کرتی تھیں۔

اس کی نظروں نے صحن سے باورچی خانے تک کا سفر طے کیا۔ کبھی کبھی وہ باورچی خانے کے دروازے میں آکر کھڑا ہو جاتا تھا اور وہ غنٹیں کر کے اسے اندر جانے پر مجبور کیا کرتی کبھی وہ برآمدے میں موڑھے پر بیٹھا مہ جبین کے کان کھاتا رہتا کبھی اندر کمرے میں اس کے پاس دھم سے بیٹھ کر اسے ڈراتا تھا۔

ضوفشاں کو لگا وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو جائے گی اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔
”آذر... آذر... کیا میں کبھی سوچ سکتی تھی کہ میری ہتھیلیوں میں یہ جو قسمت کی لکیر ہے اس پر کہیں بھی تمہارا نام درج نہیں آہ میرے خدا! تو نے قسمت کی لکیر، دل کی لکیر سے الگ کیوں بنائی ہے۔“

”کال بیل کی آواز اگر نہ گونجتی تو شاید اسے ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا۔ بیل کی آواز پر وہ چونک کر اصل دنیا میں لوٹ آئی، تھوڑی دیر پھٹی پھٹی نظروں سے اس نے بند دروازے کو دیکھا پھر ایک گہرا سانس اس کے اندر سے نکلا۔
مرے ہوئے قدموں سے خود کو گھسیٹتی وہ دروازے تک پہنچی۔

”کون۔“ تھکے ہوئے لہجے میں اس نے دریافت کیا تھا۔

”دروازے کھلوروشنی میں ہوں عالم شاہ۔“ باہر سے آتی آواز پر وہ جامد ہو گئی۔

”عالم شاہ۔“ اس نے دہرایا ”عالم شاہ“

اس کے ذہنی کیفیت اس وقت بالکل درست نہیں تھی۔ دماغی رویک وقت کئی سمتوں میں بہہ رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول

دیا۔

سفید شلوار قمیص پہنے، کاندھوں پر میروں شال ڈالے وہ دروازے کی چوکھٹ تھامے کھڑا تھا۔ دونوں تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو خاموش کھڑے دیکھتے رہے۔ پھر اس کے لب دھیرے سے بلے۔

”تم..... تم زندہ ہو۔“ وہ اس پر نگاہیں جمائے دماغی طور پر کہیں اور تھی۔

”ہوں۔“ اس نے استعجاب سے سر کو ہلکی سی جنبش دی ”ظاہر ہے“

”میں نے تو..... میں نے تو بہت دعا کی تھی۔“ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”میری زندگی کی؟“ وہ دھیرے سے ہنسا اور اندر آ گیا۔ ”میری فکر مت کرو روشنی، تمہیں پائے بغیر میں مرجاؤں ممکن نہیں اور تمہیں پا کر

مر جاؤں تو اس کی مجھے پروا نہیں۔“

”میں نے دعا کی تھی کہ تم..... کہیں بھی نہ رہو۔“ عالم شاہ نے اس مرتبہ اسے حیرانی سے دیکھا۔

”تم..... تم ٹھیک ہو؟“

وہ اپنی سابقہ کیفیت سے باہر نہ آ سکی تو اس نے آگے بڑھ کر اسے دونوں کاندھوں سے تھام لیا۔

”روشنی!۔“ عالم شاہ نے اسے ہلکا سا جھٹکا دیا۔

وہ کسی خواب کے دائرے سے باہر نکل آئی۔ آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر ایک جھٹکے سے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کر لیا۔

”تم۔“

”ہاں میں آ گیا ہوں۔“ وہ مسکرایا ”حسب وعدہ تمہاری بہن کی شادی کے بعد۔“

”کیوں؟“ اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”تمہارے والد سے ملنے“ اس نے کندھے اچکائے ”کہاں ہیں وہ؟“

”پھر اس نے مڑ کر آواز دی۔

”غلام علی۔“

”حاضر سائیں۔“

اگلے ہی لمحے دو مستعد ملازم دونوں کمرے کے ہمراہ دروازے پر تھے۔

”ہاں، رکھو یہاں۔“

اس نے یوں نوکرے صحن میں رکھوائے جیسے اپنے ذاتی گھر میں کھڑا ہوا۔

”یہ شگون کی مٹھائی ہے۔“ ان دونوں کے جانے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا ”میرا خیال ہے لڑکی والوں سے تاریخ طے کرنے جاتے

ہیں، تو میٹھی چیز شگون کے طور پر لے جاتے ہیں اپنی وے جو کچھ مجھے علم ہو ادویا کرنے کی میں نے کوشش کی تم اپنے والد سے کہو سید عالم شاہ آیا ہے۔

وہ خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

اس شخص کو اس سے کوئی سروکار ہی نہ تھا کہ وہ کیا سوچتی ہے۔ کیا چاہتی ہے، اس کی اپنی ایک زندگی ہے، اپنی ایک مکمل ذات ہے غم و غصے کا

ایک طوفان اٹھا جس نے اس کو پوری شدت سے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تھوڑی دیر تک اس نے بڑے غیض و غضب کے انداز میں اسے گھورا پھر اب کھولے مگر کچھ کہہ نہ سکی۔

عالم شاہ کے پیچھے سے ابھرتے اماں اور ابا کے وجود اس کی نگاہوں کی زد میں آئے اور وہ اندر سے بالکل ڈھے کر رہ گئی۔
 ”ابا..... آگئے ہیں۔“ اس نے عالم شاہ پر نگاہ کی ”جو بات کرنی ہے کر لیجئے۔“

اس سے قبل کہ اماں یا ابا میں سے کوئی اس عالم شاہ کی بابت استفسار کرتا وہ پلٹی اور بغیر رکے اپنے کمرے میں جا پہنچی۔
 بستر پر بیٹھ کر اس نے صحن کا منظر اپنے ذہن میں تازہ کیا۔ دروازہ اماں ابا کو کھلا ملا تھا۔ وہ بغیر دوپٹے، سارے بال بکھرائے مٹھائی کے نوکروں کے قریب کھڑی تھی اور عالم شاہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے انتہائی پاس کھڑا تھا اتنے قریب کہ اس کی گرم سانسوں کو اس نے اپنی پلکوں پر بکھرتا محسوس کیا تھا۔

”بس۔“ سر اٹھا کر چھت کو گھورتے ہوئے اس نے سوچا ”اب اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے۔“
 ”چند لمحے نہ گزرے تھے کہ اماں اندر آ گئیں۔“

”صوفشاں یہ یہاں کیوں آیا ہے۔“ ان کے لہجے میں چھپی درشتی اس نے صاف محسوس کی۔
 ”وہ عالم شاہ ہیں اماں۔“ اس سے نظریں نہ اٹھائی گئیں۔

”جان چکی ہوں لیکن یہ آیا کیوں ہے، پھر یہ نوکرے کیوں اٹھا لیا اور تم نے دروازہ کیوں کھولا، کیا اس لیے چھوڑ کر گئی تھی تمہیں۔“
 ”کہاں ہیں وہ؟“ اس نے ہر بات کو یکسر نظر انداز کر کے پوچھا۔

”بیٹھک، میں تمہارے ابا کو پچھلی باتوں کا کیا علم لے گئے وہ اسے عزت سے وہاں بٹھانے اب نبجانے کیا کچھ بتائے گا وہ انہیں..... اور..... میں پوچھ رہی ہوں تم نے اسے اندر کیوں آنے دیا وہ اتنا لمبا چوڑا غیر مرد تمہیں ذرا خوف نہ آیا؟۔“
 ”اماں جائیں انہیں چائے بنا دیں۔“ اس نے نیکی سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔
 ”باکس دماغ تو درست ہے تمہارا چاہتی کیا ہو؟۔“

”کیا چاہتی ہوں۔“ اس نے زیر لب دہرایا ”بہت سی خوشیاں بہت سا اطمینان بغیر کسی ڈر اور خوف کے ایک خوبصورت زندگی کیا مل جائے گی اماں؟۔“ اس نے ان پر نگاہیں جما کر پوچھا۔

اماں چند لمحے اسے گھورتی رہیں پھر بولیں۔

”میں کہتی ہوں لڑکی دماغ چل گیا ہے تمہارا۔ اس عمر میں یہی ہوتا ہے، جس چیز سے متاثر کرنا چاہتا تھا وہ تمہیں، شاید کرچکا لیکن یاد رکھو کچھ الٹا سیدھا نہیں ہوگا۔“

وہ مڑیں اور بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

اماں نے اس کی بات کا قطعاً الٹ مطلب اخذ کیا تھا۔ لیکن اسے پروا نہ تھی۔ کھیل شروع ہو چکا تھا اور اس کے پاس ایسا کوئی منتر نہ تھا جسے پڑھ کر وہ اس کھیل کو روکتی۔ یہ قسمت کا کھیل تھا۔ تقدیر کا الٹ پھیر تھا۔

وہ اٹھی، دوپٹا اوڑھا، بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل دی اور باہر نکل کر بیٹھک کی طرف چل دی۔

”دیکھیے صاحب آپ یقیناً مغالطے کا شکار ہیں۔“ اندر سے آتی ابا کی آواز پر وہ رک گئی۔

”میں مغالطوں کا شکار نہیں ہوتا۔“ وہ بڑے سکون سے بولا تھا ”میں اپنے ہاتھوں سے آپ کی بیٹی کو انگوٹھی پہنا چکا ہوں اور وہ یہ رشتہ تسلیم کرتی ہے۔“

”دیکھیے آپ میرے مہمان ہیں میرے گھر میں بیٹھے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ آپ سے بد اخلاقی سے پیش آؤں لیکن آپ بار بار میری بیٹی

کا ذکر مت کریں، وہ ایک شریف حیا دار لڑکی ہے اور میری بہن کے بیٹے سے منسوب ہے، اس کی اپنی پسند اس منگنی میں شامل ہے، میں اس بات پر قطعاً یقین نہیں کر سکتا جو آپ بار بار دہرا رہے ہیں۔“

”آپ میرے بزرگ ہیں۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی تپش تھی ”میں بھی نہیں چاہتا کہ آپ سے کوئی بدتمیزی کروں لیکن میں نہ جھوٹ بولنا پسند کرتا ہوں نہ سننا، اب اس جھگڑے کو ختم کریں اور تاریخ طے کریں۔“

”ارے بیٹا کمال کرتے ہو۔“ اماں بگڑ کر بولی تھیں۔

”کیوں بلا کی طرح گلے پڑ گئے ہو ہمارے، کہہ جو یا ہماری بیٹی۔“

”اماں۔“ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولی تھی۔

اماں کی بات ان کے لبوں میں ہی دم توڑ گئی۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگیں۔ ابابھی ایک ٹک اسے گھور رہے تھے۔ کسی غیر مرد کے سامنے وہ یوں اندر چلی آئے گی۔ انہوں نے دیکھا کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے جو منظر انہوں نے دیکھا تھا اسے سر جھٹک کر ایک اتفاق کا نام دے ڈالا تھا لیکن اس وقت وہ انہیں اپنی بیٹی نہیں کوئی غیر، پرانی لڑکی لگی۔ جس کے تیور سمجھنے سے وہ قاصر تھے۔

”اماں۔“ وہ ان سے مخاطب تھی۔ ”ان سے اس طرح کی بات مت کریں ابابھی ٹھیک کہہ رہے ہیں، میں نے خود اپنی مرضی سے ان سے منگنی کی ہے۔ آپ ان سے وہ بات کر لیں جو یہ کرنے آئے ہیں.....“

صوفی کی پشت پر دونوں بازو پھیلائے ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ بڑی شان سے مسکرا رہا تھا۔ صوفشاں نے ایک اچھتی نظر اس پر ڈالی اور اماں اور ابابو کو ہونق بیٹھا چھوڑ کر باہر نکل گئی۔



رات نجانے کتنی گزر چکی تھی۔ چاند آسمان کے پیچوں بچ کھڑا تھا۔

دکھتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس نے آسمان کو دیکھا پھر سر جھکاتے ہوئے اس کی نظر ستون کے قریب کھڑے ابابو پر جا رہی۔

ان کے کاندھے جھکے ہوئے تھے اور وہ اچانک بے حد بوڑھے لگنے لگے تھے۔

”صوفشاں“ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب آئے اور بیٹھ گئے۔

”یہ سب کیا ہے بیٹی؟“

”نقدیر کا ایک چکر ہے ابا۔“ سرد آہ بھر کر اس نے سر جھکا لیا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا؟ کس بات نے تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا، کیا اس نے تمہیں ڈر یا ہے بیٹی؟ کوئی دھمکی ہے؟ مجھے بتاؤ میں باپ ہوں تمہارا۔“

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ نجانے کہاں سے اس نے اتنی ہمت حاصل کی کہ خاموش بیٹھی رہی۔ آنسوؤں کو آنکھوں کے قریب بھی نہیں آنے دیا۔ ورنہ دل تو کہتا تھا کہ ان سے لپٹ جائے اور چلا چلا کر روئے ان سے کہے کہ ابا مجھے بچالو، مجھے کہیں چھپا دو ابا جہاں سے عالم شاہ مجھے کبھی نہ ڈھونڈ سکے۔ میں ساری عمر وہاں دبی بیٹھی رہوں۔

لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی جس درخت کی چھاؤں میں اس نے اپنی زندگی گزاری ہے وہ اب اتنا پرانا اور شکستہ ہو چکا ہے کہ اپنا بوجھ بھی بمشکل برداشت کیے کھڑا ہے۔ اندر سے وہ کھوکھلا اور بے سکت ہے۔ لڑکیوں کا بوجھ کس قدر جلد انسان کے کاندھے جھکا دیتا ہے۔ وہ انہیں یہ بھی نہ بتا سکی کہ اس نے خود کو زندہ رکھا بھی تھا تو محض ان کے لیے، ان کے نام کو بٹہ نہ لگ جائے ان کی عزت پر کوئی حرف نہ آئے۔ کیا کیا بتانا چاہتی تھی وہ ابا کو، لیکن اس نے کہا۔

”ابا، وہ بہت اچھے آدمی ہیں، مجھے پسند ہیں اور اور میں خود ان سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ اس کے سر پر دھرا ابا کا ہاتھ پھسل گیا۔

”ابا، آؤ مجھے پسند ہے لیکن محض ایک پھوپھی زاد بھائی کے رشتے سے، ایک اچھے دوست کی طرح۔ لیکن سید عالم شاہ میں تو وہ سب کچھ ہے جو ایک لڑکی چاہ سکتی ہے۔ وہ اتنے دولت مند ہیں ابا کہ ساری زندگی جن خواہشات کے لیے میں اندر ہی اندر سسکتی رہی، وہ چنگی بجاتے میں انہیں پورا کر سکتے ہیں ابا وہ۔“

”بس کر بیٹی، بس کر۔“ ابا کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی ”میرا مان، میرا غرور، سب مٹی کر دیا تو نے..... مٹی! تو تو تاج تھی میرا، سلطنت تھی میری۔ تجھے تصور میں سجا کر بڑے ناز سے چلا کرتا تھا۔ تو نے ہی بغاوت کر ڈالی۔ میری اپنی مٹی نے دھوکا دیا مجھے! کیا منہ دکھاؤں گا اپنی بہن کو، کیا کہوں گا بہنوئی سے، کیا معذرت کروں گا بھانجے سے۔“

”ابا، اتنی پریشانی کیوں؟ کیا منگنیاں ٹوٹتی نہیں ہیں؟“

”ٹوٹتی ہیں بیٹی، ٹوٹتی کیوں نہیں، طلاقیں ہو جاتی ہیں پھر منگنی تو محض زبانی کلامی وعدہ ہے لیکن کوئی ٹھوس وجہ بھی ہو، کیا کمی ہے آؤ میں، کیا برائی ہے؟ اور پھر جہاں تک امیری غریبی کا تعلق ہے تو یہ تو پل بھر کا کھیل ہیں۔ پلک جھپکتے میں مٹی سونا اور سونا مٹی ہو جاتا ہے۔ اور وہ کس کی خاطر اتنی دور گیا ہے؟ سب کی محبتیں چھوڑ کر، سارے آرام اور سکھ بھلا کر کیوں بیٹھا ہے وہاں؟ تیری خاطر ناں، اور تو ٹھکرا رہی ہے اسے کفرانِ نعمت کر رہی ہے بیٹی۔ کیوں کر رہی ہے ایسا؟“ وہ بے بسی سے بولے۔

”ابا۔“ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ”ایک بات بتائیں کبھی زندگی میں آپ سے کچھ مانگا ہے میں نے؟ کبھی کوئی فرمائش کی ہے؟“

”نہیں نا۔“ انہیں اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ پھر بولی ”بس ایک چیز مانگ رہی ہوں، زندگی میں، پہلی اور آخری بار، عالم شاہ کو انکار مت کرنا

ابا۔“

”پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ابا کو ساکت بیٹھا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔“



کئی دن بڑی خاموشی سے گزرے۔ گھر میں ایک عجیب جامد سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی شخص دوسرے سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سب ایک مسلسل خوف ایک مسلسل اضطراب کا شکار تھے۔ اور وہ افراد ہی کتنے تھے۔ ابا صبح چلے جاتے تو وہ اور اماں گھر میں رہ جاتیں۔ شروع میں اماں نے

اسے سمجھانے کی کوشش کی، گھر کا، ڈانٹا، واسطے دیے، منتیں کیں، لیکن اس کی جانب سے محض ایک جواب پا کر وہ خاموش ہو گئیں۔ بالکل خاموش، اب وہ اس سے محض ضرورتاً بات کرتیں جو کہ دن بھر میں ایک یا دو جملوں سے زیادہ نہ ہوتی۔

ضوفشاں بھی خاموشی سے مہ جیس کا انتظار کر رہی تھی جو کہ کچھ ہی دنوں میں ختم ہوا اور وہ ہنستی مسکراتی ہر بات سے لاعلم خوش خوش چلی آئی۔
 ”میری پیاری بہن، ضوفشاں کو اس نے گرم جوشی سے لپٹا لیا، خیریت سے ہو؟“
 ”جی، بالکل۔“ وہ مسکرائی۔

”لگتی تو نہیں۔“ اس نے غور سے اسے دیکھا ”یہ کیا حال بنا لیا ہے اپنا ضوفنی کیا بہت کام کرتی رہی ہو؟ لیکن کام کون سا اتنا زیادہ ہوتا ہے پھر یہ کیا ہوا ہے تمہیں۔“

”کیا ہوا ہے آپ۔“ اس نے ہنسنے کی کوشش کی، کچھ بھی تو نہیں۔“

”یہ بے حال حلیہ، یہ گہرے حلقے، زرد رنگت، کیا بیمار ہو گئی تھیں۔“

”جی..... جی ہاں۔“ اس نے بات ٹال دی۔ ”بخار تھا کچھ دنوں سے۔“

”اور تم نے کسی کو بتایا بھی نہیں ہوگا۔ اس نے آنکھیں نکالیں ”خیر، اب میں بنوں گی تم سے۔“
 ”وہ ہنس دی۔“

مہ جیس سارا دن وہیں رہی۔ مسلسل بولتی رہی۔ اپنے سیر و تفریح کے قصے سناتی رہی۔ اپنی خوشیوں میں مگن اس نے قطعاً غور نہ کیا کہ گھر کی فضاؤں کو اداسی کی کس کہر نے لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔

”اماں کے رویے سے ضوفشاں نے بارہا محسوس کیا کہ وہ اسے کچھ بتانا چاہتی تھیں لیکن بنا نہیں پا رہی تھیں۔ شاید اس لیے کہ ضوفشاں مسلسل اس کے ساتھ تھی۔
 ”سنو ضوفنی۔“

جاتے وقت وہ اس کے آکر بولی۔

”آذر کا فون آیا تھا وہ تم سے بات کرنا چاہتا تھا میں نے کل کا کہہ دیا ہے کل میں عاصم کو بھیجوں گی تم ان کے ساتھ چلی آنا۔“
 ”جی بہتر۔“ اس نے سر ہلا دیا۔

وہ خود بھی آذر سے بات کرنا چاہ رہی تھی ایک ایک کر کے دل توڑ رہی تھی۔ اب اس کے دل کی باری تھی۔
 ”کل پورے دن کے لیے ٹھیک ہے ناں۔“

”جی ٹھیک ہے۔“

”وہ سر ہلاتے ہوئے سوچنے لگی کہ کل اس کو کیا کیا کہنا ہے۔“



عاصم بھائی اسے صبح ہی آکر لے گئے تھے۔ پورا دن وہ مہ جیس کے ساتھ رہی، صرف جسمانی طور پر زور نہ دہنی طور پر وہ کہیں اور تھی۔ مہ جیس کی باتوں کے جواب میں محض ہوں ہاں کرتی رہی۔ مہ جیس نے اس کی عدم توجہ کو محسوس کیا، مگر زیادہ توجہ نہ دی۔ وہ یہی سمجھتی رہی کہ اسے آذر کے فون کا انتظار اس شدت سے ہے کہ کسی دوسری بات میں اس کا دل نہیں لگ رہا ہے۔ شام کو فون کی بیل بجی اس نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا جائے جناب یہ وہی ہیں۔“

ضوفشاں نے دھڑکتے دل سے گھڑی دیکھی اور اٹھ کر فون اٹھا لیا۔

”ہیلو۔“

”ہیلو، اجالا۔“ اس نے پلک جھپکتے میں اسے پہچان لیا ”میں آذر ہوں۔“

”ہاں آذر کیسے ہو؟“

”اس سے بات کرتے ہوئے لہجے میں بیگانگی کا رنگ بھرنا، بے رخی کی چادر اوڑھنا کتنا مشکل کام تھا۔
”مجھے کیا ہونا ہے۔“ وہ دھیرے سے ہنسی۔

”پتا نہیں اجالا معلوم نہیں کیوں میں بہت عجیب خواب دیکھتا ہوں تمہارے لیے، پتا نہیں کیا تعبیر ہوتی ہے ایسے خوابوں کی۔ لیکن میں ڈر جاتا ہوں اجالا میرا پورا وجود خوف میں ڈوب جاتا ہے تم ٹھیک ہونا۔“

وہ تیز تیز بول رہا تھا عموماً وہ اس طرح بات کرنے کا عادی نہ تھا ٹھہر ٹھہر کر، مسکرا کر بولتا تھا۔ خواہ کسی سے بھی مخاطب ہو۔ اور اس سے بات کرتے ہوئے تو وہ بہت مدہم بہت دھیمہ ہو جاتا تھا۔ اس کے انداز گفتگو سے صوفشاں کو اندازہ ہوا کہ وہ بے حد پریشان تھا۔
”تم خاموش کیوں ہو۔“ اسے خاموش پا کر وہ مزید پریشان ہو گیا۔ ”بتاؤ اجالا تمہیں میری قسم، خوش نہیں ہونا، تم پریشان ہو، ناخوش ہو، آج نہیں بلکہ کئی دنوں سے، ایک طویل عرصے سے، تم کیا چھپاتی ہو مجھ سے؟ اور کیوں چھپاتی ہوں، آج تمہیں بتانا ہوگا۔“
کئی آنسو اس کی پلکوں میں الجھے اور اس کے دوپٹے پر گر کر جذب ہو گئے۔

کون تھا جس نے اس کی پریشانی کو محسوس کیا تھا۔ کس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے دل میں چلتے جھکڑ محسوس کیے تھے۔ کسی نے نہیں، کسی نے بھی نہیں۔ لیکن وہ جو اس کے دل کا مکین تھا وہ بے خبر نہ تھا۔ وہ باخبر تھا اس کی حالت سے، کئی دن بعد پچی خوشی کی ایک لہر اس کے وجود میں دوڑی۔

”اجالا، تم بولتی کیوں نہیں۔“ اس نے جیسے تھک کر پوچھا۔

”آذر۔“ وہ بولی تو اس کی آواز بالکل بھیگ چکی تھی۔

”ہاں، کہو..... بولو..... کچھ تو بولو۔“

”آذر مجھے تم سے..... کچھ کہنا ہے ایک ایسی بات کہنی ہے جو شاید تمہارے لیے بے حد تکلیف دہ ہوگی۔ جسے سن کر زندگی اور زندگی کی ہر سچائی پر سے تمہارا یقین اٹھ جائے گا۔“ وہ بہت دیر کے لیے چپ ہو گیا۔ پھر بولا۔

”کیا یہ وہی بات ہے جس نے ایک طویل عرصے سے تمہارے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر ثبت کر رکھی ہے؟“

”ہاں۔“ ایک سرد آواز اس کے سینے سے نکلی ”وہی بات ہے۔“

”کہو اجالا۔“

”آذر پتا نہیں کیا ہوا ہے، اور کیوں ہوا ہے۔“ اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ ”آذر میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، میں کن الفاظ کا استعمال کروں۔“

”ہمارا تمہارا رشتہ ایسا تو نہ تھا اجالا، جس میں کچھ کہنا کے لیے لفظ ڈھونڈے جاتے یا تمہید کی ضرورت پڑتی۔“ وہ دکھ سے بولا۔ ”بس جو کہنا ہے وہ کہہ ڈالو، صاف صاف واضح انداز میں۔“

”آذر میں شادی کر رہی ہوں۔“

اسے اپنی خبر نہیں تھی کہ اس نے یہ الفاظ کس طرح ادا کر دیے اسے بس یہ احساس تھا کہ دوسری جانب اس نے کس طرح سے یہ بات سن لی ہوگی۔

وہ کچھ دیر کے جواب کا یا کسی رد عمل کا انتظار کرتی رہی، لیکن وہاں ایک گہرا سا ناچھا گیا تھا۔

”ایک شخص ہے سید عالم شاہ۔“ وہ اب کافی حد تک سنبھل گئی تھی ”وہ آندھی طوفان بن کر اس طرح میری زندگی میں داخل ہوا ہے کہ میں اس کے سوا ہر بات، ہر شے کو بھول چکی ہوں، اس نے میری زندگی کو یکسر بدل دیا ہے آذر میری سوچیں، میری ذات کا محور سب کچھ بدل دیا ہے۔ بس وہی وہ رہ گیا ہے، باقی کچھ بھی نہیں ہے، کچھ بھی نہیں“ وہ خاموش ہو کر گہرے سانس لینے لگی۔

”پتا ہے آذر، وہ ایسا ہے کہ چاند سورج بھی اس کے آگے ماند سے پڑ جاتے ہیں بات کرنے لگے تو زمانہ کی گردشیں تھم جاتی ہیں خاموش ہو جائے تو اس کی آنکھیں بولنے لگتی ہیں۔ چلتا ہے تو ہر شے ہم کرا سے دیکھتی ہے، ہنستا ہے۔“

”اجالا۔“ وہ تڑپ کر بولا ”خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ، خدا کا واسطہ ہے تمہیں، چپ ہو جاؤ۔“

بہت سے حرف، بہت سے لفظ جو وہ اس سے سننے کا خواہش مند تھا آج وہ کہہ رہی تھی تو اس طرح کہ ان کے معنی اور کسی کی ذات سے وابستہ تھے۔

”کوئی خنجر ہوتا، زہر میں بچھا ہوا، اور وہ تم میرے سینے میں اتار دیتیں تو تمہاری قسم مجھے اتنی اذیت، اتنی تکلیف نہ ہوتی کیا تمہیں خود احساس ہے تم نے کیا کہا ہے؟ کس سے کہا ہے؟ اور..... اور..... تم کیا کرنے جا رہی ہو؟“

”میں جانتی ہوں آذر، میں سب جانتی ہوں، لیکن اس دل کا کیا کروں، جو محض یہی ایک فیصلہ کرتا ہے، پوری دنیا میں اس شخص کا قرب چاہتا ہے بتاؤ آذر میں کیا کروں۔“

”میں بتاؤں۔“ وہ بڑی دکھی ہنسی ہنسا ”میں نے تو ہمیشہ تمہاری خوشیاں ہی چاہی ہیں ناں اجالا، میری تمام خواہشوں کا تو ہمیشہ ہی صرف ایک نام رہا ہے تمہاری خوشی، تمہاری ہنسی، تمہارا اطمینان، تو جاؤ اجالا، جہاں یہ ساری چیزیں تمہیں مل جائیں، انہیں اپنالو۔“

”اور..... تم.....“ اس نے تھوک لگا۔

”میں! اب میرے لیے کچھ رہا ہے کیا؟ کچھ سوالات ضرور ہیں جو دل و دماغ کی دنیا میں آگ لگائے دے رہے ہیں لیکن میں تم سے کچھ پوچھوں گا بھی نہیں، اس لیے کہ جہاں محبت کی جائے، وہاں شکوے یا شکایت کا کوئی حق بچتا ہی نہیں ہے۔ اپنے بارے میں تو کوئی فیصلہ تم ہی کر سکتی ہو، لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ میں نے تم سے عشق کیا ہے۔ سچا کھرا عشق، میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔“

”آذر..... تھنک یو..... بس ایک آخری کام کرو میرا۔“

وہ کچھ بولا نہیں لیکن خاموشی سے اس کی بات کا منتظر رہا۔

”میں..... میں..... اکیلے اتنے سارے لوگوں کو اپنی بات نہیں سمجھا سکتی۔ اماں ابا کو پتا ہے لیکن باقی لوگ۔“

وہ دھیرے سے، تنہی سے ہنسا۔

”اچھا..... ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا ہوں تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔ بے فکر ہو، اپنے گھر والوں سے میں بات کر لوں گا، جب میں خود تمہیں اس بندھن سے رہائی دے رہا ہوں تو باقی کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے، اوہ گاؤ۔“ وہ جیسے کسی انتہائی اذیت میں مبتلا ہو کر بولا ”عجب حادثات ہوتے ہیں جن سے دو چار ہونے سے پہلے ہی انسان ان کا ادراک کر بیٹھتا ہے۔ میں نے غلط نہیں دیکھا تھا میں..... میں پہلے ہی جان گیا تھا، تو یہ تعبیر تھی۔“

وہ ریسیور کان سے لگائے کھڑی رہی تا وقتیکہ دوسری جانب سے لائن کٹ گئی۔



”میں تم سے جو کچھ پوچھ رہی ہوں ناں صوفشاں اس کا مجھے ٹھیک ٹھیک جواب دو۔“ شعلہ بار لہجے میں اس سے مخاطب مہ جیس تھی۔ وہ جو اس سے کبھی بھی خفا نہیں ہوتی تھی۔ آج وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ لیکن اس کا کوئی قصور بھی نہ تھا۔ اگر وہ اس پر برس رہی تھی اس سے متنفر تھی تو اپنی جانب سے حق بجانب تھی۔

”آپا۔“ اس نے سر جھکا کر کہا ”میں نہیں جانتی کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ تو آپ کو ٹھیک ٹھیک کیا بتاؤں وہ مجھے اچانک انسپائر کر گیا ہے۔ اس حد تک کہ اب اس کے بغیر میں نہیں جی سکتی۔ مجھے صحیح معنوں میں علم ہوا ہے کہ محبت کیا ہوتی ہے۔“

”وہ نہیں اس کی دولت و حشمت۔“ وہ دانت پیس کر بولی ”یہ کیوں نہیں کہتیں کہ مرئی ہوسکوں کی کھٹکتی آواز پر، چمک دمک نے خیرہ کردی ہیں تمہاری آنکھیں اور تم اندھی ہو گئی ہو۔ ورنہ ایک وقت تھا کہ آذر کا قرب تمہاری سانسوں کی ضمانت تھا۔ وہ بولتا تھا تو تمہیں زندگی کا احساس ہوتا تھا خاموش ہو جاتا تھا تو تمہیں ایک پل گزارنا دشوار لگتا، اور..... اور..... اس عالم شاہ نے کیا دیا ہے تمہیں، ہیرے کی انگلی، سونے کے نگین، یہ زنجیریں تمہاری محبت بھی بن سکتی ہیں ضوئی، میں نے کبھی خواب میں نہیں سوچا تھا دولت کے سیاہ ناگ کا زہر تمہاری رگوں میں سرایت کر گیا ہے اور ان رگوں میں دوڑتی سچائی اور محبت مر گئی ہے۔“ وہ رونے لگی۔ ضوفشاں خشک آنکھیں اور سپاٹ چہرے اسے دیکھتی رہی۔ وہ آج رو رہی تھی کل سب کچھ بھول کر خاموش ہو جاتی۔ لیکن ضوفشاں اگر اپنا فیصلہ بدل دیتی تو شاید وہ تامل مروتی رہتی۔

”جانتی ہو ضوئی وہ معصوم صفت شخص کتنا چاہتا ہے تمہیں ہر الزام اپنے سر لے لیا ہے اس نے، ہر قصور کا رخ اپنی انب موڑ لیا ہے پھوپھی اماں اور پھوپھا ابا سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی خوشی سے یہ مٹانی توڑ رہا ہے۔ لیکن میں جانتی تھی کہ اگر کہیں کچھ غلط ہو رہا ہے تو تمہاری وجہ سے۔ وہ تو آنکھیں بند کیے اپنی چاہتوں کے دریا میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اچانک کیسے یہ فیصلہ سناسکتا تھا۔ خاموش تھیں تو تم، اسے نظر انداز کر رہی تھیں تو تم، اس کے وجود کی مسلسل نفی کی تو تم نے میں سمجھ گئی ضوئی کہ اصل مجرم تم ہو اور اسے تمہاری ہی قسم دے کر میں نے اس سے اقرار کروا بھی لیا۔“ وہ بولتے بولتے تھک گئی تو ایک بار پھر رونے لگی۔

”ضوفشاں جاننا چاہو گی وہ تمہیں کتنا چاہتا ہے۔“ آنسو پونچھ کر وہ بولی ”وہ مجھ سے کہنے لگا کہ جبیں آپا، میں چاہوں تو اس کے انکار کے باوجود اپنا سکتا ہوں کہ وہ مجھ سے منسوب ہے لیکن میں ایسا نہیں کروں گا میں ایسا کر ہی نہیں سکتا کیونکہ میں اس کی خوشی دنیا کی ہر شے سے عزیز رکھتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ ایک عمر اس طرح گزارے کہ اس کی آنکھیں بجھی ہوں اور دل روتا ہو۔ تو اس سے بہتر میں وہ زندگی سمجھتا ہوں جو میں تنہا گزاروں لیکن میری یادوں کی فریم میں لگی اس کی تصویر بنستی ہو، مسکراتی ہو، شاد ماں ہو۔ اس نے کہا کہ جبیں آپا بس ایک خواہش ہے اگر پوری ہو سکے تو ضرور کر دیجئے گا۔“

”ضوفشاں نے بے تابی سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا آذر کی کوئی ایک خواہش بھی اب اگر اس کی ذات پوری کر سکتی تو اس سے بڑی خوش نصیبی اس کے لیے کیا ہو سکتی تھی۔

”اس نے کہا کہ اگر ہو سکے تو اسے دلہن بنا کر ہمارے گھر سے رخصت کرنا تا کہ اگر کبھی میں لوٹ کر آؤں تو اپنے گھر کی فضاؤں میں اپنی نا آسودہ خواہشوں کی خوشبو ہی محسوس کر سکوں اس نے کہا کہ اسے دلہن بنانا تو بہت ساری گجروں سے سجا دینا، وہ گجروں میں لپٹ کر بڑی خوبصورت لگتی ہے۔“

”خاموش ہو جاؤ آپا۔“ اس نے التجا کی۔

”سن لو ضوئی، کوئی حسرت تمہارے دل کی تہوں میں نا آسودہ نہ رہ جائے۔ اس نے کہا کہ اگر وہ اپنے گھر سے رخصت ہوئی تو ایک وہم ہمیشہ مجھے پریشان کرتا رہے گا کہ شاید وہ راستہ بھول گئی ہے۔ بھٹک کر کہیں اور چلی گئی ہے اور کبھی راستہ پا کر مجھ تک پہنچ جائے گی لیکن میرے ہی گھر سے رخصت ہوئی تو ایسے اندیشے مجھے پریشان نہیں کریں گے۔“

ضوفشاں کو لگا اس کا دل دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا اور وہ اٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔



”بہت خوبصورت لگ رہی ہو، کسی کی نظر نہ لگے۔“ اسے اس کی سہیلی عائشہ نے تیار کیا تھا۔

”میں جیسے آپا کو بلا کر لاتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

اس نے اپنی بے جان نظروں کو درود یوار پر بکھیرا، اس خالی کمرے میں کتنا جاندار احساس تھا اس کی موجودگی کا۔ جیسے ہر شے سے اس کی نگاہیں جھانک رہی ہوں، جیسے وہ اسے دیکھ رہا ہو۔ مسکرا رہا ہو آذر کا کمر اس کے بغیر بھی اس کے ہونے کے احساس سے لبالب بھر رہا تھا ہمیشہ، اور آج یہ احساس کچھ اور سوا ہو رہا تھا۔

تکیے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے حیرت سے اپنے نہروں کے سب کو سوچا۔ شاید وہ اندر سے مرچکی تھی، فنا ہو گئی تھی اور مردے روپا نہیں کرتے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور اس کی ہر چیز کو بغور دیکھتی رہی، چھوٹی رہی، آخری بار، آخری بار، آخری بار۔ کوئی اس کے اندر چیخ رہا تھا۔

”آخری بار محسوس کر لے اسے، آخری بار سوچ لے اسے، آخری بار اپنی سانسوں میں اس کی خوشبو محسوس کر لے، پھر اسے بھول جا ہمیشہ کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“

دروازے پر آہٹ ہوئی تو وہ مڑی مہ جیسے لب کاٹتی، آنسوؤں کو روکتی اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کا سارا ضبط جواب دے گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ کر بے تحاشا رو دی اور پھر روتی ہی رہی۔

ضوفشاں کے اندر کوئی تھا جو مہ جیسے کا ساتھ دے رہا تھا لیکن باہر سے اس کی خشک آنکھیں ہلکی سی نم بھی نہ ہو سکیں۔ وہ صرف گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔

”ضوفنی میری جان۔“

بالآخر اس نے آنسوؤں اور سسکیوں پر قابو پا کر اس کے گال پر ہاتھ پھیرا۔

”سدا سکھی رہے، ہنستی رہے، مسکراتی رہے۔“

پھر وہ اس سے علیحدہ ہوئی اور مڑ کر باہر نکل گئی آذر کا کمر پھر اس کے احساس کے وجود سے آباد ہو گیا۔ باری باری ہر کوئی آ کر اس سے مل کر چلا گیا۔ وہ تنہا تھی تنہا رہ گئی۔ بس ایک احساس تھا جو خوشبو کی طرح ایسے لپٹا تھا کہ علیحدہ نہ ہوتا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ جس لمحے وہ گھونگھٹ نکال کر اس کمرے سے نکلے گی یہ احساس بس دہلیز تک اس کا ساتھ دے گا پھر وہ آگے بڑھے گی تو اسے کسی بچے کی طرح تھام لے گا۔ کھینچے گا، واپس بلائے گا۔ ضد کرے گا، روئے گا، مچلے گا اور جب وہ زبردستی دامن چھڑا کر آگے بڑھ جائے گی تو دہلیز پر گر کر سسکتا رہے گا۔ ہمیشہ سسکتا رہے گا۔ پھر فضا دھماکوں سے گونج اٹھی۔ شہنائیاں بجنے لگیں اسے علم ہوا کہ اس نے اپنا وجود سید عالم شاہ کے نام لکھ دیا ہے۔

اور جب اسے علم ہوا کہ اس کی رخصتی میں محض چند لمحے رہ گئے ہیں تو اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی کلائی پر لپٹا گجرا اتارا اور اس کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ وہ جانتی تھی کہ خواہ وہ ایک عمر گزار کر لوٹے اسے یہ گجرا یہیں ملے گا۔

وہ ایسے رخصت ہوئی تھی جیسے ڈولی میں نہیں جنازے میں جا رہی ہو، نہایت خاموشی سے اماں ابانے اسے وداع کیا تھا۔ بنا کسی اہتمام کے اور اہتمام تو وہاں ہوتے ہیں جہاں خوشیاں اور مسرتیں ہوں سب کے دلوں کو تو دکھوں کے بوجھ نے چور کر رکھا تھا۔ اماں، ابا پھوپھی اور پھوپھا سے نظریں چراتے تھے۔ پھوپھی اماں اور پھوپھا ابا، ان دونوں سے شرمسار تھے۔ پھولوں سے لدی گاڑی میں وہ بیٹھی تو ان سب غموں سارے دکھوں کی وہ وجہ بڑی شان سے آ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

ضوفشاں کی سانسوں کی طرح بڑی آہستگی اور خاموشی سے گاڑی آگے بڑھی تھی۔



اس نے گاڑی سے اتر کر سر اٹھا کر دیکھا۔ ”رنگ محل“ کے در و دیوار قطعاً سادے تھے۔ کسی قسم کی آرائش و زیبائش یا سجاوٹ ایسی نہ تھی جسے دیکھ کر کوئی کہہ سکتا کہ ”رنگ محل“ کا بادشاہ جنگ جیت کر لوٹا ہے۔

”شاہ صاحب! مبارک ہوا!“ کسی نے سامنے آ کر کہا تھا۔

”شکریہ مکرم!“ اس کی آواز میں گہرا اطمینان ہلکورے لے رہا تھا۔ ”یہ تمہاری بی بی صاحب ہیں۔“

”سلام بی بی صاحبہ!“ وہ بے حد ادب کے ساتھ اس سے مخاطب تھا۔

وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ دل و دماغ اس طرح سے تھکے ہوئے تھے کہ اسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

”اب تم بھی آرام کرو مکرم۔“ وہ اس سے مخاطب ہوا۔ ”تمہاری بی بی صاحبہ تھکی ہوئی ہیں۔ صبح مل لینا۔“

”جی سائیں۔ بہتر!“ وہ ایک طرف کو ہو گیا۔

”آؤ روشنی!“ عالم شاہ نے ذرا اسے گھونٹھٹ سے جھانکتے اس کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا۔ اور مسکرایا ماربل کی سیڑھیاں، ایک ایک کر کے وہ اس کی ہمراہی میں طے کرتی گئی۔ ایک ایک پاؤں من من بھر کا ہو رہا تھا۔ سید عالم شاہ کی جانب سے اتنا زیور آیا تھا کہ بقول مہ جبین کے ”بوری میں بھر کر بھیجنا چاہیے تھا۔“ اس نے وہ تمام زیور پہن لیا تھا۔ دونوں کلائیوں سونے کی چوڑیوں سے یوں بے تحاشا بھر گئی تھیں، کہ مہ جبین کی بڑی چاہت سے خرید گئیں سرخ کانچ کی ایک چوڑی کی بھی جگہ نہ بچی تھی۔ بہت سے بھاری ہاراتنی دیر سے پہنے پہنے اس کی گردن بالکل جھک گئی تھی اور کاندھوں میں شدید درمخسوس ہو رہا تھا۔ موٹی سونے کی پازیب اس کے پاؤں اٹھانے میں مانع ہو رہی تھی۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا، لیکن وہ کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے چلتی رہی۔

”تمہیں حیرانی ہو رہی ہوگی۔ یہاں سنا نا دیکھ کر!“

ٹنڈ گلا سزا والا محرابی دروازہ اس کے لیے وا کرتے ہوئے وہ خوش دلی سے بولا۔ ”اس کی ایک بڑی خاص وجہ ہے۔ جو میں ابھی تمہیں بتاؤں گا۔“

صوفشاں نے ایک بے حد تھکی ہوئی، مرجھائی ہوئی نگاہ اس کے جھگاتے چہرے پر ڈالی اور سر جھکا کر دروازہ پار کر لیا۔ دروازہ اس کے پیچھے بے آواز بند ہو گیا۔

سوالا خروہ اسے فتح کر کے یہاں لے ہی آیا تھا۔ یہاں اسی جگہ، اس ہال میں کبھی کس نفرت سے اس نے کہا تھا۔

”بات صرف اتنی سی ہے کہ میں آپ کے لیے نہیں ہوں اور یہ بات میں خود آپ سے کہہ رہی ہوں، اپنے دل کی گہرائیوں کے ساتھ، کی یہ بات آپ کو سمجھانے کے لیے کافی نہیں؟“

اس وقت اسے خبر نہ تھی کہ اس کی پیشانی میں چھپی تقدیر کے کاغذ پر اس شخص کا نام جلی حروف میں لکھا ہے۔

”تو عالم شاہ! جیت گئے تم۔ ہار گئی میں، میری محبت۔ ختم ہو گیا میرا غرور، خاک ہوئی میری انا۔“

وہ اس کے پیچھے پیچھے کارپٹ سے ڈھکی سیڑھیاں پار کرنے لگی۔

”ایک بے بس چڑیا کی مانند مجھے تم نے پکڑ کر اس پنجرے میں پہنچا ہی دیا۔ اس کی سونے سے بنی سلاخیں اتنی مضبوط ہیں کہ میں ساری زندگی اس پنجرے میں پھڑ پھڑاتی رہوں گی اور یہ سلاخیں اتنی مضبوطی سے جمی میری بے بسی کا مذاق اڑاتی رہیں گی۔“ بے حد چکراتے ہوئے سر کو تمام کر وہ سیڑھیوں کے پتھوں بچ کھڑی ہو گئی۔

”دیکھو..... دیکھو..... کتنی مضبوط، کتنی بھاری زنجیریں ہیں جن میں تم نے مجھے سر سے پاؤں تک جکڑ دیا ہے۔ دیکھو عالم شاہ دیکھو۔ یہ ہار نہیں وہ بے شمار طوق ہیں جو مجھے پہنا کر تم نے میری گردن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے آگے خم کر دی ہے۔ یہ کنگن یہ چوڑیاں، وہ جھکڑیاں ہیں جو سدا میرے ان ہاتھوں کو تمہارے آگے جوڑے رکھیں گی۔ یہ پازیب وہ بیڑی ہے جو مجھے اس پنجرے کا پابند رکھے گی۔ کتنے ارمانوں سے قید کیا ہے تم نے

مجھے۔ کتنی محبت سے کالے ہیں میرے پر۔“

اپنی دھن میں اوپر جاتے عالم شاہ نے کئی سیرھیاں اکیلے پار کر لیں پھر اپنے پیچھے چوڑیوں کی کھنک اور پازیب کی چھنک نہ پا کر تعجب سے مڑ کر دیکھا۔

وہ بس گرنے ہی والی تھی۔ لہر اکرز میں پر آرہی تھی، کئی سیرھیاں ایک ساتھ پار کرتے عالم شاہ کے مضبوط بازوؤں نے اسے تھام لیا۔
”روشنی۔ روشنی!“ اس نے بے تابی سے اس کے گال تھپتھپائے۔

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک بے حد آرام دہ بستر پر پایا۔ وہ کمرے میں تنہا تھی۔ چند لمحے اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ انتہائی شان و شوکت سے سجا بیڈروم اسے پہلی نگاہ میں بڑا پرسرار، بے حد مغرور لگا۔

”کیا جگہیں بھی اپنے اندر رہنے والے لوگوں سے متاثر ہو جاتی ہیں۔“ اس نے سوچا۔ ”یا شاید کچھ شخصیات ہوتی ہی بہت مضبوط اور متاثر کن ہیں۔ اتنی کہ ان جگہوں کو بھی متاثر کر ڈالتی ہیں۔ جہاں وہ رہتی ہیں۔“

”وہ اس مغرور کمرے کی قیمتی اور خوب صورت چیزوں کو دیکھ کر سوچتی رہی۔ عاایشان، منقش مسہری کے چاروں جانب جالی کا نفیس پردہ تھا جسے فی الوقت سمیٹ کر ڈوری سے باندھ دیا گیا تھا۔ سائینڈ ٹیبل پر رکھے نازک کرٹل کے گلدان میں سجے سفید پھولوں کی بھینی مہلک سے کمر ابھرا ہوا تھا۔ کونے میں رکھے لیمپ میں جلتے دودھیا بلب کی روشنی لیمپ کی جھالروں سے پھوٹ کر کمرے میں بکھری ہوئی تھی۔ اور اس مدہم روشنی میں ڈوبا وہ بیڈروم پر اسرار اور مغرور لگ رہا تھا۔ بالکل سید عالم شاہ کی طرح۔

سید عالم شاہ کا خیال آتے ہی اس کا دل پوری طاقت سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنے گھٹنوں کے گرد بازو بختی سے لپیٹ لیے۔ ورنہ لگتا تھا کہ دل ابھی پسلیاں توڑ کر باہر مسہری پر آگرے گا، اس کے پورے وجود پر شدید نقاب طاری ہو گئی۔ وہ آج صبح سے بھوک تھی۔ ویسے تو اس کی بھوک بچھلے کئی مہینوں سے سوئی ہوئی تھی اور کچھ دنوں سے تو یہ محض چند لقمے پورے دن میں زہر مار کیا کرتی تھی۔ لیکن آج تو جیسے اس کا روزہ تھا۔ نہ تو اس نے کسی ایک وقت کا بھی کھانا کھایا تھا نہ ہی پانی کی شکل دیکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اب رہ رہ کر چکر آرہے تھے اور بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ ایک بار پھر اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ ذرا سی آہٹ ہوئی تو اس نے سہم کر سر اٹھایا۔ بیڈروم سے ملحق غسل خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ اور سفید شلوار سوٹ میں ملبوس عالم شاہ تویہ سے بال خشک کرتا ہوا باہر آ رہا تھا۔
”خوش آمدید!“ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر وہ مسکرایا۔

”کہو۔ کمرہ پسند آیا!“

”اس نے آنکھیں بند کر کے سر مسہری کی پشت سے ٹکا دیا۔

دوبارہ اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑا بالوں میں انگلیاں چلا رہا تھا۔ وہ پیچھے سے اس کے چوڑے کاندھوں کو گھورتی رہی۔ تاوقتیکہ وہ مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

”بہت ادا اس ہو؟“

”عجیب سا لہجہ تھا اس کا۔ جیسے بظاہر بے نیازی سے سوال کرتا ہوا اندر کہیں وہ بہت بے کلم ہو۔ ضوفشاں نے اس کی جانب دیکھا۔
بلکی سفید روشنی میں سفید ہی لباس میں ملبوس وہ اپنے تمام تر تھکے نقوش کے ساتھ بڑا وجہہ دکھائی دے رہا تھا۔ خم دار پلکوں سے بھی آنکھیں حسب معلوم سرخ ہو رہی تھیں۔ قدرے اٹھی ہوئی ستواں ناک اس کے چہرے پر اپنی تمام تر موزونیت کے ساتھ ایستادہ تھی اور سگریٹ نوشی سے سیاہ پڑتے لب اپنی جیت کے احساس سے کھلے ہوئے تھے۔

”ایسا کیا دیکھ رہی ہو۔“ سنجیدگی سے سوال کرتے ہوئے اس نے جھک کر سائینڈ ٹیبل پر پڑا سگریٹ کا پیٹ اٹھایا اور سگریٹ لبوں میں دبا کر اسٹر سے سلاگنے لگا۔

”دیکھ رہی ہوں کہ جب بڑے بڑے بادشاہ جنگ جیت کر لوٹتے ہوں گے تو فتح کا نمار ان کے چہروں پر کیسے بکھرتا ہوگا۔“
جتنی سنجیدگی سے سوال کیا گیا تھا اتنی ہی سنجیدگی سے اس نے جواب دیا۔

بڑی دیر تک وہ بہت سارا دھواں اپنے اندر بھرے خاموش بیٹھا رہا۔

”زمین کے ایک بے جان ٹکڑے کو حاصل کرنے اور زندگی کی ایک بہت بڑی جیتی جاگتی خواہش کو پانے میں بڑا فرق ہوتا ہے روشنی۔“
”کافی دیر بعد اس نے ایش ٹرے میں راکھ بھاڑتے ہوئے کہا۔

”شکر ہے۔“ وہ تلخی سے ہنسی۔ ”آپ نے اتنا تو بہر حال تسلیم کیا کہ وہ خواہش جیتی جاگتی ہے ورنہ آج تک تو آپ اسے بے جان سمجھتے آئے ہیں۔“

اس کے لب بھینچ گئے۔ بے دردی سے آدھے سے زیادہ سگریٹ کو اس نے ایش ٹرے میں پھینک دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک ضوفشاں نے اسے پیچھے ہاتھ باندھ کر کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلے دیکھا۔ پھر اس نے سر جھٹکا اور آہستہ آہستہ چلتا دوبارہ اس کے قریب آ بیٹھا۔

”جانتی ہو۔ آج یہاں اس سناٹے کا مطلب کیا ہے؟“ وہ بولے سے مسکرا کر بتانے لگا۔ ”آج یہاں ایک ہنگامہ ہونا تھا۔ رنگ و بو کا ایک سیلاب موجزن ہونا چاہیے تھا، تمہارے استقبال کے لیے گیٹ سے لے کر یہاں، کمرے تک گلاب کے پھولوں کی روشن ہونی چاہیے تھی۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا سبب پتا ہے کیا؟“ ضوفشاں نے خاموشی سے نظریں اٹھا دیں۔

”اس کا سبب یہ ہے کہ کسی کو علم نہیں ہے اس شادی کا۔ خفیہ رکھا ہے میں نے اپنے سارے دوستوں اور ملنے والوں سے۔ دراصل روشنی میں نہیں چاہتا تھا کہ ان تمام رسومات میں وقت ضائع کیا جائے۔ یہ وقت جب کہ تم پہلی بار اس طرح میرے مقابل بیٹھی ہو، مجھے بڑا عزیز ہے۔ میں اس خوبصورت وقت میں، اپنی زندگی کے ان سب سے حسین اور قیمتی لمحات میں کسی بھی قسم کی دخل اندازی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن تم دیکھنا، دو دن بعد ولیمہ کی تقریب ہوگی، اور اس تقریب میں اتنی خوشیاں منائی جائیں گی جیسے آج سے پہلے اس شہر میں کوئی شادی ہی نہ ہوئی ہو۔ ٹھیک ہے نا!“

”جی!“ اس نے گہرا سانس لیا۔

”ایک بات بتاؤ۔“ اچانک ہی وہ پرشوق ہوا۔ ”رومنائی میں کیا چاہیے تمہیں!“ اگر یہ مذاق تھا تو بے رحم تھا۔ پھر بھی اسے ہنسی آنے لگی۔
”کہو۔ خاموش کیوں ہو۔ شرماؤ نہیں، جو چاہو مانگ لو۔ آ زما لو عالم شاہ کو۔“

اس نے ایک بڑی کاٹ دار نظر اس پر ڈالی۔

”سوچ لیجئے۔ بڑا مشکل دعویٰ کیا ہے۔“

”سب کچھ سوچ کر کہا ہے۔“ اس کے لبوں پر وہی اس کی ازلی، نہ سمجھ میں آنے والی مسکراہٹ کوندی۔

”فرض کیجیے۔ آزادی مانگ لوں آپ سے۔“ اس نے ابرو چڑھائے۔ ”کسی دوسرے شخص کا ساتھ مانگ لوں!“

”سید عالم شاہ کا جگمگاتا چہرہ اس تیزی سے تاریک ہوا کہ ایک لمحے کو ضوفشاں کا اپنا دل دھک سے رہ گیا۔ بڑی دیر ایک ٹک وہ اسے دیکھتا

رہا۔

”میں کبھی اپنی زبان سے نہیں پھرا۔“ بڑی دیر بعد وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”زبان دی ہے تو اس کا پاس بھی کروں گا۔“

وہ اٹھ کر دوڑ گیا اور ڈوری کھینچ کر پردہ ہٹا دیا۔ شیشے کی دیوار کے پارتا ریکیاں تھیں۔

”مانگو۔ کیا مانگتی ہو!“ وہ باہر دیکھ رہا تھا۔

”ایک گلاس پانی پلا دیجیے!“ اس نے تھک کر سر جھکایا اور شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ پرکٹ جانے کے بعد اسے پنجرہ سے نکال کر باہر

پھینک بھی دیا جاتا تو اب اس کا یہ بے بال و پردہ وجود کس کام کا تھا۔

عالم شاہ مڑا تو اس کے چہرے کی رونقیں بحال ہو چکی تھیں۔ ”شاید تم پہلی دہن ہو جس نے رونمائی میں محض ایک گلاس پانی کی خواہش کی ہے۔“ پانی سے گلاس بھر کر اسے تھماتے ہوئے وہ بولا۔

”لیکن عالم شاہ اتنا گیا گزرا نہیں ہے۔“ بہت سی آوازیں، بہت سے جملے آپس میں ٹکرائے اس کا ہاتھ کانپا اور بہت سا پانی جھلک کر اس کے زرتار آنچل کو بھگو گیا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں رونمائی میں کوئی بہت انوکھی، کوئی بہت قیمتی شے دوں۔ لیکن ہر وہ شے جو میری سوچ کی گرفت میں آسکی مجھے حقیر اور بے معنی لگی۔ تب میں نے اس شے کا انتخاب کیا جو بہت قیمتی ہے۔ میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ جانتی ہو کیا؟“ اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلادیا۔

”آج۔ اس خوبصورت رات کو اور اس کی تمام تر سچائیوں کو گواہ بنا کر عالم شاہ اپنی ساری وفائیں تمہارے آنچل سے باندھ رہا ہے۔ پچھلی زندگی جو تھی، جیسی گزاری۔ اسے عمر کی کتاب سے حذف کر دیا ہے میں نے۔ آج سے عالم شاہ ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہا ہے اور اپنی محبتیں اور اپنی وفائیں تمہارے نام لکھنے میں پہل کر رہا ہے۔ کم از کم میرے لیے یہ بات بڑی اہم ہے۔ تمہارے لیے؟“

دفعۃً اس نے بات کاٹ کر اس سے پوچھا تھا۔

”میرے لیے؟“ اس نے ہولے سے دہرایا تھا پھر ایک سانس چھوڑ کر خاموش ہو گئی وہ بڑی دیر تک نگاہوں میں انتظار کی تمام شدتوں کو بھرے اس کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

”روشنی! تمہارے ساتھ کیا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تم نے اپنے دل میں میرے لیے کوئی خاص جذبہ محسوس کیا ہو۔ مانا کہ تمہارے ماضی کے ساتھ ایک یاد وابستہ ہے۔ لیکن محبت کسی ایک ہی شخص کے لیے مخصوص تو نہیں ہو جاتی نا؟“

اس کا لہجہ اس کے الفاظ۔

”کیا یہ وہی سید عالم شاہ ہے؟“ اس نے سوچا ”غور سے لبالب بھرا، لبوں سے شعلے برساتا ہوا، نگاہوں سے تھلستاتا ہوا، محبت انسان کو کس قدر کمزور کر دیتی ہے!“

”بولو۔ خاموش کیوں ہوا؟“

”آپ!“ اس نے لب دانتوں سے کچلے۔ ”کیا آپ چاہیں گے کہ میں آپ سے جھوٹ بولوں۔ کیا ایک ایسا اقرار آپ کو سچی خوشی بخش سکتا ہے جس میں جک کا شائبہ تک نہ ہو!“ ضوفشاں کی بات سن کر اس نے انگلیوں سے پیشانی کو رگڑا پھر بولا۔

”ہرگز نہیں۔ میں نے تمہیں ایک بار پہلے بھی کہا تھا کہ مجھ سے کبھی جھوٹ مت بولنا۔ خواہ وہ مجھ سے ہی محبت کا اظہار کے لیے بولنا ہو۔ مجھے یقین ہے ایک دن ساری دنیا کو بھلا کر تم مجھ سے سچی محبت کرو گی۔ ضرور کرو گی لیکن خواہ وہ دن روز حشر کا ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے ایک دن پہلے بھی مجھ سے یہ جھوٹ نہ بولنا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہو چکی ہے۔ یہ جملہ میں تمہارے لبوں سے سنوں گا لیکن دل و دماغ کی تمام سچائیوں کے ساتھ جذباتوں کی مکمل ہم آہنگی کے ساتھ۔“

وہ اٹھ کر الماری تک گیا اور اس کا پٹ کھول کر اوپری خانے سے ایک فائل نکال کر لایا۔

”یہ لو!“ اس کی گود میں اس نے فائل ڈال دی۔

”کیا ہے یہ؟“ ضوفشاں نے حیرت سے دریافت کیا۔

”یہ گھر۔ رنگ محل میں نے تمہارے نام کر دیا ہے۔ یہ میں نے اپنے لیے بنوایا تھا۔ بہت عزیز ہیں مجھے اس کے درود یوار اس گھر کو بھی میں بہت عزیز ہوں۔ چند دنوں میں تم محسوس کرو گی کہ اس درود یوار سے میری خوشبو پھوٹی ہے۔ میری دعا ہے روشنی کہ خدا تمہیں لمبی عمر دے اور تم ہمیشہ یہاں رہو۔ ان درود یوار کے بیچ اور ایک دن ان سے تمہاری خوشبو آنے لگے۔ اس کی پیشانی پر ”رنگ محل“ لکھا ہے۔ میں نے مکرم علی سے کہا کہ ان

الفاظ کی جگہ ”روشنی ولا“ لکھوا دے۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ اس نے ٹھوڑی گھٹنے پر کا کر کہا۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ ”رنگ گل“ ہے یا ”روشنی ولا“ آپ یہ اطمینان کر لیجئے کہ میں یہاں سے جانے کے لیے نہیں آئی۔ میں نے دل میں کسی انتقام کا ارادہ باندھ کر آپ کو نہیں اپنایا بلکہ تقدیر کی ایک حقیقت سمجھ کر زندگی کے اس موڑ کو قبول کیا ہے۔“

”بہر حال۔ یہ نام میں نے تمہیں دیا ہے۔ تم نے قبول کر لیا مجھے خوشی ہوئی۔ اس گھر کو بھی یہ نام میں دے رہا ہوں۔ اس میں بھی میری خوشی سمجھ لو۔“

”آہ، ایسا مت کرو عالم شاہ!“ آنکھیں موند کر اس نے کرب سے سوچا۔ ”کیسا نام دیا ہے تم نے مجھے زندگی کی تمام روشنیاں گل ہو گئی ہیں۔ اس گھر کو یہ نام مت دو۔ ہر چند کہ اس کی روشنیاں میری آنکھوں میں چبھتی ہیں مگر میں چاہوں گا کہ یہ گھر سدا روشن رہے۔ اس کے دیے روشن رہیں۔ اس کے اجالے برقرار رہیں! ہاں میں یہی چاہوں گی۔“



اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں بڑا سحر انگیز اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ شیشے کی دیوار پر پڑے دبیز پردے کی وجہ سے یہ معلوم ہونا بڑا مشکل تھا کہ اس وقت کیا بجاتا تھا۔

کونے میں رکھے بڑے لیپ کی روشنی گل تھی اور بیڈ کے دونوں جانب ملحق چھوٹی میزوں پر رکھے ننھے ننھے خوب صورت لیپ روشن تھے۔ جن سے بڑی خوبصورت دو دھیاں روشنی انتہائی کم مقدار میں خارج ہو رہی تھی یہی روشنی ہلکے سحر انگیز اندھیرے کی وجہ تھی۔ بڑی دیر تک وہ سیدھی لیٹی چھت کو گھورتی رہی۔ اور خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ اپنے اس چھوٹے سے گھر میں نہیں ہے جہاں کل تک ہر صبح اس کی آنکھ کھلتی آئی تھی۔ اور جب اس کے حواس پوری طرح سے اس کے قابو میں آ گئے تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ذرا سا رخ موڑ کر اس نے دیکھا۔ جہازی سا نر مسہری کے دوسرے انتہائی کونے پر وہ لینا گہری اور پرسکون نیند میں تھا۔ ہلکی روشنی، ہلکے اندھیرے میں اس کے نقوش دھندلے دھندلے سے لگ رہے تھے۔ کمرے میں اس وقت سردی کا احساس بے حد واضح تھا۔ لیکن وہ بغیر کچھ اوڑھے اسی طرح لینا تھا۔

”کیا شخص ہے یہ!“ اس نے بے حد تعجب سے اس کی ستواں، اٹھی ہوئی ناک کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”لفظ غرور کی مجسم تفسیر ہے!“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تو ایک لمبے کوہر شے تاریک ہو گئی۔ وہ اگلے ہی لمبے سر تھام کر دوبارہ بیٹھنے پر مجبور ہو گئی۔ تیزی سے اعصاب پر طاری ہوئی نقاہت نے احساس دلایا کہ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے حالت فاقہ میں تھی۔ بمشکل اٹھ کر وہ پردے تک آئی اور کونا ذرا سا سر کا کر باہر دیکھا۔ آسمان اپنی تمام نیلاہٹوں کے ساتھ واضح تھا۔ نیچے پھیلے سرسبز لان کا منظر بے حد روح پرور اور دیدہ زیب تھا۔ وہ کچھ دیر کو ہر بات بھلا کر ہری گھاس پر مڑگشت کرتے مورد دیکھتی رہی۔

”یہ گھر میں نے اپنے لیے بنوایا تھا!“

اس کے کانوں میں عالم شاہ کا جملہ گونجا۔

”کیا واقعی تم اتنے ہی خوبصورت اور اچھوتے احساسات کے مالک ہو!“ اس نے پلٹ کر پھر ایک نظر اس پر ڈالی۔ ”یقین آ ہی نہیں سکتا! کیونکہ جو کسی دوسرے کے احساسات سے قطعاً بے بہرہ ہو، اس کی اپنی فیلنگز اتنی خوبصورت نہیں ہو سکتیں۔“

آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ اس تک پہنچی اور کارپٹ پر پڑا کبل اٹھا کر اس پر ڈال دیا۔

”ایسا بھی کیا غرور کہ انسان پر موسم بھی اثر انداز ہونا چھوڑ دیں۔“

”ایک تلخ مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ وارڈروب تک آئی، اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ ملگبی روشنی میں کپڑوں کے رنگ اور ڈیزائن تو واضح نہیں تھے پھر بھی اتنا اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک جو بیش قیمت ملبوسات لٹکے تھے، وہ اس کے لیے خریدے گئے تھے۔ پہلا لباس جو اس کے ہاتھ میں آیا اس نے کھینچ کر نکالا اور ہاتھ روم میں گھس گئی۔

نہا دھو کر جس کو وقت وہ بالوں میں برش کر رہی تھی، ریک پر دھرے ٹائم پیس میں ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ یونہی بے مقصد کمرے میں پھرتی رہی پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اسے کبھی بھی صبح دیر تک سوتے رہنے کی عادت نہ رہی تھی۔ آج تو وہ پھر اپنے حساب سے وہ بہت دیر سے بیدار ہوئی تھی۔

کارڈور پارکر کے اس نے کچھ دیر کوریٹنگ تھام کر نیچے ہال کا منظر دیکھا پھر آہستہ آہستہ میڑھیاں اترنے لگی۔

”سلام بی بی صاحب!“ نجائے کس کو نے سے اچانک ہی ایک عورت نمودار ہوئی تھی۔

”وعلیکم السلام۔“ اس نے غور سے اسے دیکھا۔

”شادی مبارک ہو جی!“ وہ بڑی خوش اور پر جوش لگتی تھی۔ ”خدا آپ کو بڑی خوشیاں دے۔“

وہ گہرا سانس بھر کر رہ گئی۔

”میرا نام خیراں ہے جی!“ اسے خاموش پا کر اس نے مزید بات کی۔

”اچھا۔“ اس نے سر ہلایا۔

”بی بی جی ناشتا!“ خیراں نے بوتل کا جن بننے کی قسم اٹھا رکھی تھی شاید۔

”رکھ دو۔“ وہ بے زاری سے بولی۔

اس نے کپ میں چائے اٹھالی اور گرم گرم حلق سے اتارنے لگی۔

”چائے اور بنا کر لاؤں جی!“

”نہیں۔ اتنی ہی کافی ہے!“

اس نے ایک نظر ناشتے کے لوازمات پر ڈالی۔

”بی بی جی! سردی بہت ہے۔“

”خیراں نے اس کے کاشن کے سوٹ کو۔ پریشان نگاہوں سے دیکھ کر اپنی ہتھیلیاں رگڑیں۔

”اچھا۔“ شکے ہوئے سلائس کو دانٹوں سے توڑتے ہوئے وہ مسکرائی۔

”آپ نے کوئی گرم کپڑا بھی نہیں پہنا ہوا جی!“

”تم وہ شعلوں کا لباس کہاں دیکھ پاؤ گی جو میری روح نے اوڑھ رکھا ہے۔“ اس نے سوچا۔

”سردی لگ رہی ہے تو اندر چلی جاؤ۔ یہاں کیوں بیٹھی ہو!“ اس نے بے نیازی سے کہا۔

”نا بی جی! میں نے اپنی بات کہاں کی۔ میں نے تو جی دو دو سو کیٹر پہنے ہیں۔ لیکن آپ نے تو؟“

”میری فکر مت کرو۔“ اس نے کپ میں مزید چائے نکالی ”اب مجھے زندگی بھر سردی نہیں لگے گی۔“

”وہ کیوں جی۔“

”اس نے احمقوں کی طرح حیران ہو کر اسے دیکھا۔

وہ خاموشی سے دوسری جانب دیکھنے لگی۔

”بی بی جی۔ میں نے پہلے کبھی آپ کو یہاں نہیں دیکھا۔“ خیراں ٹلنے کو کسی طور پر تیار نہ تھی۔

”کیا مطلب؟“ اس نے بیزارگی سے نگاہ اس پر ڈالی۔

”مطلب یہ ہے جی کہ شاہ جی کی کئی سہیلیاں دیکھی ہیں میں نے۔ پر آپ تو اچانک ہی آگئی ہیں۔“

”بہت سہیلیاں ہیں تمہارے شاہ جی کی؟“ اس نے بے تاثر لہجے میں دریافت کیا۔

”ہاں جی۔ بہت۔ آپ کی بھی پہلے دوستی تھی شاہ جی سے؟“

”نہیں!“

”پھر جی؟ کہاں دیکھا شاہ جی نے آپ کو؟ ویسے بڑا بھلا ہوا جو شاہ جی نے آپ کو دیکھا لیا۔ وہ سب جو آتی تھیں، مجھے تو ایک آنکھ پسند نہیں

تھیں۔ آپ تو جی ماشاء اللہ نظر نہ لگے۔“

”خیراں۔“ وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”بس اب اندر جاؤ۔ مجھے اکیلے بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔“

”حاضر بی بی جی حاضر!“

وہ اٹھی اور اٹنے قدموں اندر کی جانب چلی گئی۔

اس کی جی جی کی رٹ سے جان چھوٹنے پر اس نے شکر کا سانس لیا اور سکون سے ناشتا کرنے لگی۔

”پچھلی زندگی، جو تھی، جیسی تھی۔ اسے عمر کی کتاب سے حذف کر دیا ہے میں نے!“

”اسے گزشتہ رات کی بات یاد آئی۔“

”ہونہ۔“ سر جھٹک کر اس نے سوچا۔ ”مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن شاید تمہیں اس بات سے بہت فرق پڑے عالم شاہ کہ میں اتنی

آسانی سے اپنی عمر کی کتاب سے پچھلی زندگی کے صفحات پھاڑ کر نہیں پھینک سکتی!“

”روشنی!“ اس نے بے حد نزدیک سے پکارا تھا۔

اس کا ہاتھ بری طرح سے کانپا اور کپ انگلیوں کی گرفت سے آزاد ہو کر گھاس پر گر گیا۔

”جی!“ ہونق بن کر اس نے عالم شاہ کو دیکھا۔ نیند سے بوجھل سرخ نظریں وہ اس پر جمائے ہوئے تھا۔

”ڈر گئیں؟“

”جی۔ نہیں بس ذرا کسی اور دھیان میں تھی!“

”اس کی قربت اس کی سانسوں کی آمد و رفت میں رکاوٹ بننے لگتی تھی۔“

”یہاں اتنی سردی میں کیوں بیٹھی ہو؟ بیمار ہو جاؤ گی۔“

”جن کے اندر مرجائیں ان کے باہر کے باہر بیمار نہیں ہوا کرتے۔“ اس نے تلخی سے سوچا۔

”باہر آنا ہی تھا تو کم از کم کوئی شال وغیرہ تو لے لی ہوتی۔ چلو اٹھو۔“

”حکمیہ انداز میں تو اس کا سدا کا تھا۔ وہ کیا ماسک کرتی۔ خاموشی سے اٹھ کر ٹرے اٹھانے لگی۔“

”یہ کیوں اٹھا رہی ہو؟“ اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”جی!“ وہ بوکھلائی۔ ”وہ اندر لے چلوں!“

”رکھ دو۔ بہت نوکر ہیں ان کاموں کے لیے۔“ اس نے سر جھٹکا۔

اس کا ہاتھ تمام کروہ اسے اندر لے آیا۔

”میں جاگا تو تمہیں نہ پا کر پریشان سا ہو گیا۔“ میز حیاں چڑھتے ہوئے وہ بتا رہا تھا۔ ایک ہاتھ اس کے شانوں پر رکھا ہوا تھا۔ صوفیاں

سے قدم اٹھانا دشوار تھا۔

”ورنہ میں اتنی جلدی جاگ ہی نہیں سکتا۔ خیر، اب سو کروقت کیا گنوانا۔ تم جاگ رہی ہو تو میں سو نہیں سکتا۔ تم بیٹھو میں نہا کرتا ہوں۔ پھر مل کر ناشتا کریں گے!“

”اسے بٹھا کروہ باتھ روم میں گھس گیا۔“



دو دن بعد اس کا ولیمہ تھا۔ عالم شاہ صبح سے انتظامات میں مصروف تھا۔ مکرم علی پھر کی کی تیزی سے اس کے احکامات کی بجا آوری کرتا پھر رہا تھا۔ ضوفشاں کو اندازہ ہوا کہ سید عالم شاہ کی زندگی میں مکرم علی کا وجود ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔

”بی بی صاحبہ!“

”وہ بالوں میں برش پھیر رہی تھی جب وہ دروازے بجا کر اندر آیا۔“

”یہ شام کی تقریب کے لیے آپ کا لباس ہے۔“ بڑا سا ڈبہ اس نے مسہری پر رکھا۔ ”شاہ صاحب نے خاص طور پر تیار کروایا ہے۔ آپ کے میک اپ کے لیے شام ساتھ بچے بیوٹی پارلروالی آجائے گی۔ دس بجے تقریب شروع ہوگی!“

”دس بجے؟“ اس نے تعجب سے دہرایا۔

”جی!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو ختم پھر کب ہوگی!“

”صبح تک جاری رہے گی!“

”کیا؟“ وہ کھڑی ہو گئی! ”یہ کس قسم کی تقریب ہے؟“

”وہ جی، راگ رنگ ہوگا۔ پینا پلانا ہوگا۔ شاہ صاحب کے سارے دوست مدعو ہیں۔ ان کے لیے تو خاص طور پر ایسی تقاریب کا بندوبست کرنا ہوتا ہے۔“

وہ اپنی جگہ سن کھڑی رہ گئی۔

”تمہارا مطلب ہے مکرم علی کہ۔“ بڑی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئی کہ شراب کا دور چلے گا۔“

”ظاہر ہے جی!“ وہ اس کی سادگی پر مسکرایا۔

”اور۔۔۔ ناپنے والیاں بھی آئیں گی۔“

”مکرم علی نے پریشان ہو کر ابھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی مالکن کے لیے یہ بات ایک شاک ثابت ہوئی تھی۔“

”میری بات کا، ہاں، نہیں میں جواب دے دو۔“ اس نے مکرم علی کے چہرے کو دیکھا۔

”جی ہاں بی بی صاحبہ!“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اپنی جگہ پر واپس بیٹھ گئی۔ مکرم علی کے جانے کے بعد وہ تھوڑی دیر تک اپنی جگہ پر بیٹھی رہی اور اٹھ کر فون تک آئی۔

ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔

”ہیلو۔“ سلسلہ ملنے پر وہ بولی۔ ”آپا! میں ہوں ضوفی!“

”ضوفی!“ وہ کھل اٹھی۔ ”کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں!“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ”آپ کو ولیمہ کا پیغام آیا تھا؟“

”ہاں۔ کل تمہارا ملازم کارڈ دے گیا ہے۔“

”اماں کا ارادہ ہے آنے؟“ اس نے پوچھا۔

”ضوفا! تمہیں علم تو ہے نا وہ ناراض ہیں تم سے۔ پھر بھی میں نے سوچا ہے کہ میں اصرار کر کے سب کو لے آؤں گی۔ آخر یہ دوریاں برقرار تو نہیں رہتی ناں تم خوش ہو تو پھر باقی باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔“

ضوفا شاں کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

”آپا۔ آپ بہت بہت اچھی ہیں!“

”پاگل۔“ وہ ہنس دی۔

”آپا اصل میں، میں نے فون اس لیے کیا تھا کہ یہ بتا سکوں، آج کی تقریب کینسل ہو گئی ہے۔“

”کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”دراصل عالم کے ایک قریبی دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اس کی حالت نازک ہے اسی لیے سارے دوستوں نے مل کر تقریب کینسل کرادی!“

”اچھا۔ چلو پھر سہی۔ میری طرف سے افسوس کرنا!“

”جی بہتر!“

”ضوفا! تم خوش تو ہونا!“ وہ کچھ دیر چپ رہ کر بولی۔

”ارے۔“ وہ ہنس دی۔ ”کیا نہیں لگتی؟“

”نہیں۔“ وہ صفائی سے بول گئی۔ ”ان دنوں آواز میں جو کھنکھ ہوتی ہے، خوشیاں جس طرح لب و لہجے میں جھانکتی ہیں۔ وہ ہر احساس

معدوم ہے۔“

”وہ بڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی، پھر بولی۔“

”آپا بہت سی باتیں ناقابل تردید ہوتی ہیں۔ مگر پھر بھی سچ نہیں ہوتیں۔ میں خوش ہوں آپا۔ اچھا خدا حافظ!“

”خدا حافظ!“

فون رکھ کر وہ مڑی تو عالم شاہ کو دروازے کے قریب کھڑا دیکھا۔

”تم نے ان لوگوں سے جھوٹ کیوں بولا؟“

”وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آ کر بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔“

”خدا کا شکر ہے کہ مجھے پہلے سے علم ہو گیا کہ رات کی تقریب میں کیا ہونا ہے؟“ وہ دوسرے کنارے پر نکلتے ہوئے بولی۔ ”میرے ماں

باپ بہت غریب ہیں شاہ صاحب! ایسی رنگ رلیاں افورڈ نہ کر پائیں گے!“

عالم شاہ نے اس کے سنجیدہ چہرے پر نظر کی۔

”کیا خوشی منانا بری بات ہے؟“

”اس کے پوچھنے پر وہ ہولے سے ہنس دی۔“

”ایک بات بتائیے۔“ اچانک اس نے پوچھا۔ ”آپ۔ آپ شراب پیتے ہیں؟“

وہ خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

”ہاں۔ کبھی کبھی!“ پھر بولا۔

بڑا تکلیف دہ احساس تھا جو اس کے پورے وجود میں سرایت کر گیا۔ اس میں مزید کچھ بولنے کچھ پوچھنے کی سکت نہ رہی تھی۔ سید عالم شاہ نے بڑی دیر تک اس کے چہرے پر لہراتے کرب اور اذیت کے سایوں کا مشاہدہ کیا۔

”تم۔ تم ناخوش ہوئی ہو؟“

وہ چپ چاپ بیٹھی لب کاٹتی رہی۔

”بولوروشنی! برا لگا ہے تمہیں میرا شراب پینا۔“ وہ اٹھ کر اس تک آیا پھر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

”مجھے برا لگے گا تو کیا آپ پینا چھوڑ دیں گے؟“ اس نے تڑخ کر پوچھا۔

”ہاں۔“ بڑا واضح جواب تھا۔ لہجے کی تمام تر مضبوطی کے ساتھ۔ ”بس ایک بار کہہ کر دیکھو!“

”کہہ رہی ہوں۔“ اسے عالم شاہ کی وارفتگی سے پریشانی ہوتی تھی۔

”ایسے نہیں۔ پوری بات کہو!“

اس نے پریشانی سے اس کی سمت دیکھا اور اس سے نظر ملنے پر یک بارگی اس کی نگاہیں جھک گئیں۔

”آپ۔ آپ آئندہ شراب نہیں پئیں گے!“ بالآخر اس نے جبر کر کے کہہ ڈالا۔

”عالم شاہ وعدہ کرتا ہے!“ وہ مسکرا اٹھا۔ ”اور جسے تمہاری نگاہوں سے مدہوشی ملی ہو، وہ بھلا عارضی، نشے کی سمت کیوں نگاہ کرے گا۔“

صوفیاشاں نے گہرا سانس لے کر سر جھکا دیا۔

”مجھے۔ مجھے ایک اور بات پر بھی اعتراض ہے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”ہوں۔“ وہ عموماً ہنکارا بھر کر بات دریافت کرتا تھا۔

”گھر میں یہ ناچ گانا، گھٹکھروؤں کی جھنکار۔ یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”ہوں!“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

کمر پر ہاتھ باندھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر ایک جگہ رک گیا۔

”بات یہ ہے روشنی!“ اس نے سوچتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ ”کہ اگر اپنی ذاتی خوشی اور پسند کو درمیان سے نکال بھی دیا جائے تو کچھ

کام ایسے ہوتے ہیں جو بندے کو کرنے ہی پڑتے ہیں۔ شام کو میرے جو دوست اور مہمان مدعو ہیں۔ ان کی پہلی ذیما دہی یہی ہوتی ہے۔ میں تمہاری

بات مان بھی لوں تو انہیں مطمئن کرنا آسان کام نہیں ہوگا۔“

”غلط تو غلط ہے نا عالم شاہ۔ خواہ کسی کو خوش کرنے کے لیے ہی ہو!“

”ہوں۔ ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن۔“ وہ الجھن کا شکار تھا۔ ”اچھا، اگر آج کی تقریب کو اس پابندی سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے تو آئندہ کے

لیے محتاط رہا جاسکتا ہے۔“ اس نے محض شانے اچکا دیے۔

وہ جانتی تھی کہ جو پابندیاں وہ از خود قبول کرتا جا رہا تھا۔ وہ کسی بھی طور سے مجبور کر کے لاگو نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تو اس کی اپنی ذہنی رو تھی جو فی

الوقت مثبت سمت میں رواں تھی۔ کس وقت اس کا دماغ اگلے قدموں دوڑنے لگتا۔ یہ تعین کرنا آسان نہ تھا۔ جو کچھ وہ مان رہا تھا۔ اس کے لیے اتنا ہی

بہت تھا۔ ورنہ سید عالم شاہ سے کسی بھی قسم کی کوئی امید اسے ہرگز نہ تھی۔

”لباس پسند آیا؟“ اس نے موضوع بدل کر اسے سوچوں سے نکالا۔

”جی؟ میں نے ابھی دیکھا نہیں۔“ وہ چونک اٹھی۔

”دیکھو لو۔“ اس نے ڈبہ کھول دیا۔

صوفیاشاں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ آف وہائٹ کلر کا اتنا عالیشان لباس تھا کہ اس کی قیمت کا تعین کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔

”اچھا لگا؟“

”جی ہاں!“ اس نے سر ہلایا اور اسی سے مسکرائی۔

اسے یاد آگیا کہ یہ لباس پہننے کے بعد اسے تمام تعریفی کلمات کس شخص سے وصول کرنے تھے۔

”میں نے یہ خاص طور پر آج کی تقریب کے لیے تمہارے لیے تیار کرایا ہے۔“

”کیا قیمت ہے اس کی؟“ اس نے سادے سے لہجے میں پوچھا۔

”جذبہ انمول ہوتے ہیں۔“ وہ ہنسا۔ ”اس کی قیمت میں اس وقت بتاؤں گا جب تم اسے زیب تن کرو گی۔ اس سے پہلے بھلا اس کی کیا

قیمت ہو سکتی ہے!“

ضوفشاں نے بے تاثر انداز میں اسے دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ ساری عمر اپنے الفاظ کا خزانہ بے دریغ لٹا کر بھی سید عالم شاہ کبھی اس کے

نزدیک جذبوں کا محض ایک احساس بھی اپنے نام نہ لکھوا پائے گا۔



تقریب کا سارا انتظام چھت پر تھا۔ ”رنگ محل“ کی طویل و عریض چھت ان گنت چمکتی روشنیوں میں نہائی ہوئی تھی۔

اسٹیج پر رکھے غنم لیس صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھی ضوفشاں نے دور تک نظر دوڑائی۔ جہاں تک نظر جاتی۔ آدمی ہی آدمی تھے۔ بیش قیمت

ملبوسات زیب تن کیے، قیمتی خوشبوؤں سے بھرے ہوئے۔ چہروں پر خاص امیرانہ تاثر لیے آدمی ہی آدمی تھے۔

ایک بے حد مخصوص حصے میں عورتیں ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مشغول تھیں۔ خوش ادا کو خوش انداز عورتیں۔ جیسے ان کو کبھی کسی

غم نے نہ چھوا ہو۔ جیسے وہ دنیا کی ہر خوشی اپنے نصیب میں اوپر سے لکھوا کر لائی ہوں۔

اس نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

”واؤ۔ چوائس اچھی ہے شاہ کی!“ کسی کی چمکتی آواز پر اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ ایک خوبصورت ناز و انداز سے نئی عورت

اسی پر نگاہیں جمائے کھڑی تھی۔

”روشنی یہ نرگس ہے۔“ اس کے عقب سے عالم شاہ نکلا۔

”بچی کہتی ہوں عالم۔ تم نے مجھے کیوں رہنچیکٹ کیا۔ اس کا جواب از خود مل گیا مجھے!“

”سید عالم شاہ نے بے حد مسکرا کر ایک نگاہ ضوفشاں کے چہرے پر ڈالی اور ذرا سارخ موڑ کر نرگس کی طرف متوجہ ہوا۔

”بے وجہ کی خوش فہمیوں میں مبتلا تھیں تم۔“ وہ خوش دلی سے گویا ہوا تھا۔ ”اگر روشنی مجھے نہ بھی ملتی تو اتنا تو طے تھا کہ کم از کم تم سے میں ہرگز

شادی نہ کرتا۔“

نرگس نے سر اٹھا کر ہلکا تہقید لگایا اور مڑ گئی۔

”تم تھک گئی ہو گی؟“ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”جی بہت۔“

”میں تمہیں کمرے میں پہنچانے کا بندوبست کرتا ہوں!“ وہ ادھر ادھر نگاہ دوڑانے لگا۔

”یہ لوگ کیا ساری رات اسی طرح بولتے رہیں گے؟“ اس نے عجیب بیزار لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”ہاں۔ لیکن یہاں نہیں۔ نیچے ہال میں۔“

”وہاں کیا ہے؟“

”وہاں۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا۔ ”وہاں جو کچھ ہے اسے تم چھوڑ دو۔ بیڈروم میں جاؤ۔ چینیج کرو اور سکون سے سو جاؤ۔“
 ”وہ خاموش ہو گئی۔ اسے علم ہو گیا تھا کہ ”وہاں“ کیا ہونا تھا۔

اسے تھوڑی دیر میں نیچے پہنچا دیا گیا تھا۔ لباس تبدیل کرنے کی غرض سے وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔ بے اختیار اس کی نگاہ سامنے آئینے پر گئی۔ چند لمحے وہ خود ساکت کھڑی اپنے عکس کو دیکھتی رہی پھر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی آئینے کے بالکل قریب پہنچ گئی۔

اگر وہ واقعی اتنی ہی خوبصورت لگ رہی تھی جتنی کہ آئینہ اسے دکھا رہا تھا تو یہ سچ تھا کہ وہ زندگی میں کبھی اتنی حسین نہ لگی تھی۔ آف وہاسٹ دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ چاند کی مانند چمک رہا تھا۔ ڈھیروں ڈھیروں گجروں نے اس کے وجود میں ایسی خوشبوئیں بھرا رکھی تھیں جو نہ صرف محسوس ہوتی تھیں بلکہ نظر بھی آرہی تھیں۔ محض اسے دیکھ کر چاندنی اور خوشبو کا خیال آرہا تھا۔

”وہ گجروں میں لپٹ کر بہت خوبصورت نظر آتی ہے۔“ آذر نے مہ جیوں سے کہا تھا۔ نجانے کب اس نے اسے گجرے پہنے دیکھا ہوگا اور ہمیشہ کے لیے وہ منظر دل میں محفوظ کر لیا ہوگا۔ اس نے آذر دگی سے سوچا۔

”کیا عجیب افسانہ ہے۔ آج میں اتنی سی خواہش بھی نہیں کر سکتی کہ تم کہیں سے آ جاؤ اور مجھے یوں بنا سنو اور دیکھ سکو۔ میں چاہتے ہوئے بھی نہیں چاہ سکتی!“

”دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آہٹ پر وہ چونک اٹھی۔ عالم شاہ اندر داخل ہو رہا تھا۔

”اچھا ہوا تم نے لباس نہیں تبدیل کیا۔“

اسے آئینے کے مقابل دیکھ کر کرہولے سے ہنسا اور چلتا ہوا اس کے پاس آکھڑا ہوا۔

”میں سوچ رہا تھا، ایسا نہ ہو تم میرا انتظار کیے بغیر اپنا یہ سجا سنورا روپ بے دردی سے خراب کر دو۔ میں نے اچھی طرح سے تمہیں دیکھا بھی نہیں۔ دیکھ لوں؟“ اسے شانوں سے تمام کر اس نے اپنے مقابل کر لیا۔

”آئینہ بھلا تمہیں کیا بتا سکتا ہے کہ تم کیسی لگ رہی ہو جاننا چاہتی ہو تو ایک نظر میری آنکھوں میں دیکھو۔“

ضووفشاں نے بے اختیار نظریں اٹھائیں۔ سیاہ بھونرا آنکھیں بڑی دلچسپی سے اس پر جمی ہوئی تھیں کیا تھا ان آنکھوں میں کہ وہ نظریں نہ جھکا سکی۔ ایک معمول کی مانند ان آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ محبت، وارفتگی، جذبول کی انتہا۔ ان آنکھوں سے کیا کیا نہ ظاہر تھا۔ پھر اچانک دولائٹ براؤن چمکتی آنکھوں نے ان کا لی بھونرا آنکھوں کی جگہ لے لی۔ یہی سب باتیں تو وہ آنکھیں بھی کیا کرتی تھیں۔ ان میں بھی تو ایسے ہی کنول کھلتے ہیں۔ ایسے شعر تو وہ بھی کہا کرتی تھیں۔

اس نے ایک سسکی لی اور اس کا سر عالم شاہ کے سینے سے جا لگا۔

”روشنی!“ وہ چونک اٹھا۔ ”کیا ہوا؟“

اسے ہولے سے جھنجھوڑ کر وہ واپس حواسوں میں لے آیا۔

”کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے نا تمہاری؟“

”جی۔“ اس نے سر تھاما۔ ”میں ٹھیک ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”کھانا ٹھیک سے کھایا تھا؟“ وہ پریشان تھا۔

”جی ہاں! بس مجھے نیند آرہی ہے۔“

”ہاں تو ٹھیک ہے سو جاؤ!“ اس نے پیار سے گال تھپتھپایا۔ ”جاؤ شاہاں کپڑے بدل لو۔“

جب تک اس نے زیور اتارا، کپڑے بدلے، میک اپ صاف کیا، وہ وہیں بیٹھا رہا۔ سارے کاموں سے فارغ ہو کر وہ بستر پر نیم دراز ہوئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”شب بخیر!“

اسے کمبل اوڑھا کر اس نے لائٹس آف کیں اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

وہ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ ذرا سی دیر میں ہی نیند کی دایوں میں کھو گئی۔ اسے اندازہ نہ ہوا تھا کہ اس کی آنکھ کتنی دیر بعد کھلی تھی۔ اور کیوں کھلی تھی۔ کوئی خواب تھا یا کوئی احساس تھا جو اس کی پرسکون نیند میں خلل ہوا تھا۔

چھت پر نگاہ جمائے وہ سوچتی رہی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ نہایت ہلکی، مدھم سی آوازیں تھیں جو کمرے کی پرسکون فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ اور یہ آوازیں نیچے ہال سے آرہی تھیں۔

گھنگھر وؤں کی جھنکار، طبلے کی تھاپ، قہقہے نعرے، بہت سی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

خوفشاں کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا، جیسے کوئی دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ وہ یکلفت اٹھ کر بیٹھ گئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ ایک عجیب، ڈراؤنے احساس نے اس کا گھیراؤ کر رکھا تھا اسے درود یوار سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ان آوازوں میں بھوتوں اور چڑیلوں کی چیخیں چھپی لگ رہی تھیں۔ ایک جھٹکے سے کمبل ہٹا کر وہ مسہری سے نیچے اتر آئی سر ہانے رکھی شال اٹھا کر اچھی طرح سے اپنے گرد لپیٹی اور تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔ کارڈور سے گزرتے ہوئے اس نے رفتار آہستہ کر لی پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ریلنگ کے پاس آکھڑی ہوئی۔

نیچے ایک اودھم ہوا تھا۔ ناچتی، تھرکتی عورتیں، طبلہ پیٹتے، سر ہلاتے آدمی اور کھلی بوتلوں اور بھرے ساغروں سے لطف اندوز ہوتے بے شمار مرد۔

تیزی سے آتے جاتے سانس پر اس نے بڑی مشکلوں سے قابو پایا اور منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کے بعد ایک آدمی پر سے گزرتی اس کی نگاہ سید عالم شاہ پر جا رکی۔ ایک کونے میں رکھے صوفے پر آڑا ترچھا بیٹھا تھا۔ دوسرے بے قابو ہوتے مردوں سے قطعاً مختلف تاثر کے ساتھ۔ لائق سے اپنے ساتھ ہوتے تماشے کو وہ یوں دیکھ رہا تھا جیسے ریلوے اسٹیشن پر بیٹھا ہو۔ اسکے پیچھے اس کا خاص آدمی رائفل تھامے کھڑا تھا۔ ذرا سے فاصلے پر مکرم علی مستعد تھا۔

”واہ۔ میری امراؤ جان ادا۔“

اچانک ہی ایک نشے میں ڈوبا شخص اٹھ کر چیخا تھا۔

”کیا ناچتی ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں اپنے گھر لے چلوں۔ ہمیشہ کے لیے!“

اس نے آگے بڑھ کر ناچتی عورت کی کلائی تھام لی۔ سزا اچانک خاموش ہو گئے۔ رقص ختم گیا۔ گھنگھر و ساکت ہو گئے۔ پورے ہال میں خاموشی چھا گئی۔ عورت نے اپنی کلائی چھڑانے کی ناکام کوشش کی۔

”میرا یقین کرو میں تمہیں گھر لے جاؤں گا۔“ وہ مکمل نشے میں تھا اور اسے کھینچتا ہوا دروازے کی جانب لے جا رہا تھا۔

”محمود!“ عالم شاہ اچانک کھڑا ہوا تھا۔

”چھوڑ دو اس کا ہاتھ!“

”یار۔ او میرے یار۔ آپس کی بات ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”مجھے پسند آگئی ہے یہ۔ لے جانے دے۔“

”میں کہہ رہا ہوں اس کا ہاتھ چھوڑ دو!“ اس آواز بلند ہو گئی۔ ”یہ لوگ یہاں عالم شاہ کے بلاوے پر آئے ہیں۔ ذمہ داری ہیں میری۔ کوئی بدتمیزی میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ یہ فحش حرکتیں تم اپنے گھر میں کرنا۔“

”ارے واہ۔ سید عالم شاہ بڑا خیال ہے تمہیں ان طوائفوں کا۔ ان کے لیے اپنے دوستوں کو بے عزت کرتے ہو۔ ہاں کیوں نہیں۔ تمہیں ان کا خیال کیوں نہ ہوگا آخر کہ تمہاری ماں کے رشتے داروں میں سے ہیں۔“

”محمود گیلانی۔“ وہ اتنی زور سے چیخا تھا جیسے بھوکا شیر دباڑا ہو۔ پھر وہ تیزی سے ڈگ بھرتا اپنے پیچھے کھڑے آدمی کی طرف بڑھا۔ ضوفشاں ایک لمحے میں سمجھ گئی کہ وہ کیا کرنے والا تھا۔

رائفل اس کے ہاتھ سے چھین کر وہ مڑا اور قریب تھا کہ گولی چلا دیتا۔ ایک دلدوز چیخ ضوفشاں کے لبوں سے نکلی۔ ایک سانس میں سیڑھیاں پار کر کے وہ اس تک پہنچی تھی۔

”عالم پلیز۔ عالم پلیز۔ ایسا نہ کریں۔“ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”چھوڑ دو مجھے۔“ اس نے ایک جھٹکے سے اسے خود سے الگ کر دیا۔ ”نہیں چھوڑوں گا نہیں چھوڑو گا اسے۔“

”عالم!“ وہ پھر اس سے لپٹ گئی۔ ”عالم آپ کو میری قسم۔ ایسا مت کریں۔“

”ہٹ جاؤ۔“ وہ پوری طاقت سے چیخا۔

پھر اگلے ہی لمحے وہ اپنے حواسوں میں آ گیا۔ ایک خون آشام نظر محمود گیلانی پر پھینک کر اس نے ضوفشاں کو دیکھا۔

”بہت برا کیا ہے روشنی۔ بہت برا کیا ہے تم نے میرے ساتھ۔“ وہ ہانپ رہا تھا۔ پھر وہ مڑا۔

”مکرم! ان سب کو ان کے گھروں کو بھیج دو۔ پانچ منٹ میں خالی ہو جائے ہال!“

ضوفشاں کی کلائی تھام کر اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا وہ اوپر لے جانے لگا۔ سیڑھیوں پر رک کر اس نے اس کی سیاہ شال اٹھا کر اس پر ڈال دی۔

پھر دوبارہ اتنی ہی تیزی سے چلتا، اسے ساتھ چلاتا وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایک تیز آواز کے ساتھ دروازہ بند کیا پھر ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر وہ باتھ روم میں گھس گیا۔

ضوفشاں منہ پر سختی سے ہاتھ جمائے مسہری کے کنارے پر تکی رہی۔ سید عالم شاہ تو اپنے عام انداز میں ہی اس کی جان اس کے جسم سے نکال دیا کرتا تھا۔ یہ روپ تو اس نے کبھی نہ دیکھا ہی نہ تھا۔ نجانے کتنی دیر گزر گئی بیٹھے بیٹھے اس کا پورا بدن اکڑ گیا۔ وہ اندر سے برآمد نہ ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ نیند اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگی۔ اس کا سر خود بخود تکیہ سے جا لگا اور وہ گہری نیند سو گئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو سامنے رکھنا نام پیس ساڑھے آٹھ بج رہا تھا۔ وہ اتنی دیر تک سونے کی عادی نہ تھی۔ لیکن شاید اس کے دماغ پر رات کی باتوں کا تاثر تھا۔ سراسیمگی تک دکھ رہا تھا۔ مسہری سے پاؤں نیچے لٹکاتے ہی اس کی نگاہ عالم شاہ پر پڑی۔ کونے میں رکھی راکنگ چیئر پر بیٹھا منہ میں سگریٹ دبائے وہ مسلسل دھواں چھوڑ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گئی اور ڈوری کھینچ کر پردے بٹا دیے۔ سارا کمرہ اجالے سے بھر گیا۔ راکنگ چیئر کی حرکت تھم گئی۔ مگر اس نے رخ موڑ کر نہ دیکھا۔

”آپ!“ وہ تذبذب کا شکار تھی۔ ”آپ سوئے نہیں تھے؟“

وہ کافی دیر تک خاموش رہا پھر ہاتھ بڑھا کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی۔

ضوفشاں اس کے قریب پہنچی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ صرف ایش ٹرے میں ہی نہیں۔ اس کے آس پاس پورے کارپٹ پر سگریٹ کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے۔ صرف آدھی رات میں اس نے اپنا نجانے کتنا خون جلا ڈالا تھا۔ وہ ضوفشاں کی طرف تو نہیں دیکھ رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اس کی آنکھوں کا گہرا سرخ رنگ دیکھ سکتی تھی۔

”روشنی!“ وہ بڑی گہری آواز میں بولا۔

”جی!“

”گھر جاؤ گی؟ مل آؤ اپنے ماں باپ سے!“

”میں۔ میں پھر کبھی چلی جاؤں گی!“ اسے اس کی اس حالت سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

”نہیں۔ آج چلی جاؤ۔“ وہ بولا۔ ”ناشتا کر لو تو ڈرائیور سے کہو وہ تمہیں چھوڑ آئے گا۔“

”جی بہتر!“

”اس کا لہجہ اتنا قطعی تھا کہ اسے انکار کی ہمت نہ ہو سکی۔ ورنہ وہ اسے اس طرح چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔

”واپس کب آؤ گی؟“ وہ اسی انداز میں بیٹھا رہا۔

”جب آپ کہیں۔“

”اتوار کو ڈرائیور بھیج دوں گا۔ شام کو۔“

”جی۔“ وہ سر جھکا کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔ اور نہادھو کر تیار ہو گئی۔ تب بھی عالم شاہ کی حالت اور انداز نشست میں کوئی فرق نہ آیا۔

”نیچے ناشتا تیار ہے!“ اس نے محض اتنا کہا تھا۔ ”جا کر ناشتا کرو اور ڈرائیور سے کہو تمہیں چھوڑ کر آئے۔“

”آپ ناشتا نہیں کریں گے؟“ اسے احساس تھا کہ اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔

”جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کر لو روشنی!“ لہجہ نرم تھا مگر اپنے اندر تحکم کا ایک خاص احساس رکھتا تھا۔

اس نے بیگ میں اپنے چند ملبوسات رکھے۔ ہینڈ بیگ اٹھایا اور دروازے کی جانب بڑھ گئی، دروازہ کھول کر چند لمحوں وہ شیش و پنچ میں مبتلا

رہی۔

”خدا حافظ۔“ پھر وہ بول پڑی۔

”اللہ حافظ۔“ وہ ہولے سے بولا تھا۔

وہ دروازہ بند کر کے نیچے چلی آئی۔ ڈائننگ ہال میں بڑی سی میز حسب معمول لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔ خیراں اور حسینہ اس کی خدمت

میں پیش پیش تھیں۔

”شاہ جی نے ناشتا نہیں کرنا جی؟“ خیراں کو زباں قابو میں رکھنا نہیں آتی تھی۔

”بعد میں کر لیں گے۔“ وہ آہستہ سے بولی اور اپنے لیے چائے نکالنے لگی۔

”سنا ہے بی بی جی!“ وہ بولی

پھر اس کی سر دنگاہ کو دیکھ کر جلدی سے خاموش ہو گئی۔ اسے لوگوں سے برابر تاؤ رکھنے کی عادت نہیں تھی تاہم جس شخص کی وہ بیوی تھی۔ اس

کی ذلت کے لحاظ سے اب اسے اپنے رویوں کی سمت متعین کرنی تھی۔

”خیراں! ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ میں بس آرہی ہوں۔“ چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے وہ بولی۔

”جی بی بی!“ وہ دوڑ گئی۔



مہ جیسے اسے سامنے پا کر خوشی سے نہال ہو گئی تھی۔

”ضوئی“ کتنی دیروہ اسے شانوں سے تھامے دیکھتی رہی۔ ”صرف تین دن میں بدل گئی تو!“

”آپا! وہ ہنس دی۔“ کہاں سے بدل لی ہوں مجھے بھی بتادیں۔“

”پتا نہیں۔ بس شخصیت میں ایک عجیب سا تاثر ابھر آیا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”لگ رہا ہے کہ کسی بڑے آدمی کی بیگم ہو۔“ وہ سر جھکا کر ہنس دی۔

”اماں کی طرف گئی تھیں؟“ وہ اسے اندر لے جاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”جی جی تو آئی ہوں، یہاں آپ کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔ اماں کا از خود سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔“

”پاگل، ماں باپ بھی بھلا ناراض رہ سکتے ہیں اپنی اولاد سے ہم سے اماں ابا جتنی محبت کرتے ہیں اس کی تو آدمی محبت بھی نہ مل سکی مجھے۔“

”پھوپھی اماں کہاں ہیں؟“

”لیٹی ہیں۔ بخار تھا دو دن سے انہیں۔ آؤ پہلے مل لو ان سے۔“ دونوں دوسرے کمرے میں چلی آئیں۔

”پھوپھی اماں!“ وہ ان سے لپٹ گئی!“ کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہوں میری بچی!“ انہوں نے حسب عادت اس کا ماتھا چوما۔ ”خدا میری آنکھوں کی یہ روشنیاں سلامت رکھے۔ تو خوش ہے؟“

”جی!“ اس کی نظریں جھک گئیں۔

جھوٹ بولنا مشکل تو نہ رہا تھا۔ ہاں تکلیف دہ اب تک تھا۔

”کیسی خوبصورت لگ رہی ہے۔“ ان کے لہجے میں حسرتیں ہی حسرتیں تھیں۔ ”کیوں کیا آؤر! تو نے ایسا!“

”پھوپھی! طبیعت ٹھیک ہے اب آپ کی!“ اس نے موضوع بدل دیا۔

”ہاں!“ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”ٹھیک ہوں اب۔ دکھ کیسا ہی شدید ہو۔ کم ہو ہی جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے!“

ضوئی کی نظر مہ جیسے سے ٹکرائی پھر اس نے جلدی سے نظر چرائی۔

”پھوپھی! اماں سے ملنے چلیں گی؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”تم دونوں مل آؤ بیٹی۔“ انہوں نے منت بھرے انداز سے میں کہا۔ ”میرا جی ابھی کہیں آنے جانے کا نہیں ہے۔“

”لیکن آپ اکیلی کیسے رہیں گی؟“ وہ پریشان ہوئی۔

”جی پھوپھی اماں! آپ بھی چلیں۔ میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“ مہ جیسے لاڈ سے ان سے لپٹ گئی۔

”میں ٹھیک ہوں میری بچی۔ بس ابھی سوؤں گی تو شام کو جاگوں گی۔ تم عاصم کو فون کر جاؤ کہ شام کو تمہیں لیتا ہوا آئے۔“

”وہ راضی نہ ہوئیں تو ناچار دونوں ہی چل دیں۔“

”آپا! اماں کچھ کہیں گی تو نہیں؟“ وہ خوفزدہ تھی۔

”بے وقوف ہو پوری۔“ وہ ہنس دی۔ ”شادی کے بعد پہلی بار میکے جا رہی ہو۔ وہ تو خوشی سے نہال ہو جائیں گی تمہیں اس روپ میں دیکھ

کر!“

”کس روپ میں؟“ اس نے تعجب سے دریافت کیا۔

”بھاری بھر کم با اثر آدمی کی بیگم کے روپ میں۔“

”ضوفشاں کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ سج گئی۔ رخ موڑ کر وہ دوڑتی ہوئی گاڑی سے باہر کے منظر دیکھنے لگی۔

دروازہ ماں نے کھولا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں پٹ تھامے اسے دیکھتی رہیں۔

گہرے ہرے، گولڈن موتیوں کے نازک کاموں والے لباس میں وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا اس کی تمام خطائیں معاف کر دیتا۔ وہ تو پھر اس کی ماں تھیں۔

”ضوفا! میری جان!“ ان کے لب لرزے اور آنکھیں بھر آئیں۔

اس کی تین دن کی جدائی نے ان ساری ناراضگی دھو ڈالی تھی۔

”اماں!“ وہ دیوانہ وار ان سے پٹ گئی۔

”اماں! مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا؟“

”بس کر۔ چھوڑ اس ذکر کو۔“ انہوں نے علیحدہ ہو کر آنسو پونچھے۔ ”مٹی ذال، جو ہو گیا سو ہو گیا۔ ماں باپ اولاد میں ہی اپنی خوشی اور سکھ

پاتے ہیں۔ تو خوش ہے نا؟“

”ہاں اماں!“ اس نے دو آنسو اور گرا دیے۔

”بہت خوشی ملی ہے۔ کسی سے کوئی شکوہ باقی نہیں رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا اتنی خوشیاں رکھو کہاں!“

”اماں۔ اب نہیں ہیں گھر پر؟“ اندر آتے ہوئے مہ جبین پوچھنے لگی۔

”وہ تو شام کو ہی آئیں گے اب۔“

”ضوفشاں نے ایک اداس نظر اپنے پیارے گھر کے در و بام پر ڈالی۔ کوئی اسے اختیار دیتا تو آج بھی وہ اس کروڑوں مالیت والے محل کو ٹھکرا کر اپنے اسی گھر میں ہنسی خوشی رہتی۔ جہاں سارے خواب اس کے اپنے تھے، ساری خوشیاں دسترس میں تھیں۔ جہاں۔۔۔۔۔ اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ کتنی کوشش کرتی تھی وہ اس ایک خیال سے بچنے کی۔ بس اس ایک یاد سے چھپنے کی۔ مگر بقول شاعر ”جس کو بھولے وہ سدا یاد آیا۔“ کی طرح اسے بھی ہر بات کے بعد یہی اک خیال آتا تھا۔

”ضوفا! کیا ملار و نمائی میں!“ فرصت سے بیٹھ کر مہ جبین اپنے تجسس کے دروازے وا کرنے لگی۔

”کچھ وعدے۔ کچھ کاغذات!“ شعوری کوشش کے باوجود بھی وہ لہجے میں در آنے والی تلخی کو روک نہ پائی تھی۔

”کیا مطلب؟“ اسے تعجب ہوا۔

”وہ محل عالم شاہ نے میرے نام کر دیا ہے!“ وہ لا پرواہی سے بولی۔

”میں نے تو اب تک تمہارا وہ محل ہی نہیں دیکھا۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”جب جی چاہے آ کر دیکھ لیں۔“ وہ ہنس دی۔

”کون سا دنیا کے دوسرے کونے پر ہے!“

”اور۔ وہ تمہارے شاہ صاحب کس مزاج کے ہیں؟ ویسے ہیں تو زبردست چیز محض دیکھ کر رعب حسن و دولت سے انسان حواس باختہ ہو جائے۔ تیرے حواس کس طرح قائم رہے ہوں گے۔“

وہ شرارت سے ہنس کر پوچھنے لگی، ضوفشاں نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”بتاؤ نا۔ اب کیا گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ گئی ہو منہ میں!“ مہ جبین چڑ کر بولی۔

ضوفشاں نے اسے دیکھا پھر اسے خیال آیا کہ اس کا رویہ ان لوگوں کو شکوک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ جب ایک دفعہ ان سب کی خوشیوں پر خود کو قربان کر بی ڈالتا تو پھر یہ بیزاری کیسی۔ اب جو جیسے بھی تھی اسے نبھانا تھا۔

وہ ہولے ہولے سے اسے اپنے گھر اور عالم شاہ کے متعلق بتانے لگی۔ اس کی محبتوں کا، پل پل بدلتے موڈ کا، گھر میں میسر عیش و آرام کا۔ ہر شے کا ذکر اس طرح کرنے لگی، جیسے یہ سب کچھ پاکر وہ بہت خوش ہو۔

”آذر کا فون آیا تھا!“ دفعتاً اس نے بتایا۔ صوفشاں نظریں چرا کر رہ گئی۔

”کیا کہہ رہا تھا!“ بظاہر بے نیازی سے پوچھا۔

”کہہ رہا تھا کہ تمہیں اس کی جانب سے شادی کی مبارکباد دوں اور تمہاری تصویر منگوائی ہے شادی کی!“

”اس سے کہیے گا۔ اب اسے میری تصویر کی نہیں۔ کسی اور تازہ تصویر کی ضرورت ہے جو صرف اس کے سر ہانے رکھے فریم میں ہی نہیں اس کے دل اور زندگی کے فریم میں بھی فٹ ہو جائے اور اسے کہیے گا آپا۔ ماضی کی طرف دوڑنے والے ہمیشہ گھائے میں رہتے ہیں، دکھ اٹھاتے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بجائے آگے دیکھیے!“

دیوار پر نگاہ جمائے، دکھ کے ایک گہرے تاثر کے ساتھ وہ بولتی رہی۔

”صوفی!“ مہ جیوں نے اسے پکارا۔

”جی!“ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تم واقعی خوش ہونا؟“ وہ اسے ایک نکل دیکھ رہی تھی۔

”ہاں آپا!“ وہ ہنس دی۔ ”کبھی رنگ محل آؤ تو دیکھو میں کتنی خوش ہو کتنی خوش!“

دو دن اس طرح پر لگا کر اڑ گئے کہ اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ اماں ابا پچھلی باتوں کو بھلا کر خوش تھے۔ وہ بھی اس کی خوشیوں میں شامل ہو کر خود کو اپنی ذات سے وابستہ محرومیوں کو بھلا کر ہنستی رہی۔ مسلسل بولتی رہی۔ دو دن کے لیے وہی پہلے والی صوفشاں بن گئی۔ اپنے ساتھ لائے ہوئے بچے بنے کپڑے بیگ میں بند کیے وہ اپنے پرانے کپڑے پہنتی رہی۔ اسے تو محض ان کپڑوں کو دیکھ کر ہی عالم شاہ کا خیال آنے لگتا تھا۔ پرانے کپڑوں سے آذر کی خوشبو اور اس کی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ جان بوجھ کر تو ایسا نہیں سوچتی تھی۔ بس لاشعوری طور پر ہی یہ سارے کام کیے جاتی تھی۔

”صوفی!“ آخری دن اماں نے اسے اپنے پاس بیٹھا کر سنجیدگی سے کہا تھا۔ ”کچھ باتیں ایسی ہیں جو شادی سے پہلے میں تم سے نہیں کر سکتی

تھی۔ اب سن لو!“

”جی اماں! کہیں۔“

”بیٹی! تمہارا شوہر جیسا بھی ہے۔ اور جس انداز سے ہم سے پیش آیا، ہم تمہاری خوشی کی خاطر بھلا چکے ہیں۔ اب وہ بھی ہمارے لیے عاصم

جیسا ہے۔ اب آؤ تو اسے بھی آنے کا کہنا۔“

”جی اماں!“

”اور سنو بیٹی! میں جانتی ہوں یہ سب کچھ تم سے کہنا فضول ہی ہے۔ کیونکہ تم خود ہی سمجھدار ہو پھر بھی۔ دھیان رکھنا کہ ساری عمر اپنے شوہر کو خوش رکھو، اس کا کہنا مانو، اس کے مکان کو اپنے وجود سے سجا کر گھر بنا دو بیٹی! شوہر ایک عورت کی سب سے قیمتی شے ہوتا ہے۔ اپنی ساری خوشیاں اس کے نام کر کے بھی عورت گھائے میں نہیں رہتی کیونکہ پھر وہ اپنی ہستی عورت کے نام لکھ دیتا ہے۔ تمہارا شوہر عادت کا اکھڑ ہے۔ سخت مزاج ہے۔ جوانی اور دولت کے نشے میں چور رہتا ہے۔ پھر بھی وہ تمہاری زندگی کا اثاثہ ہے، اسی کے سہارے اب تمہیں اپنی عمر بتانی ہے۔ اپنے مزاج سے اس کے مزاج کو بدل دو تو زندگی کی سب سے بڑی کامیابی سمجھنا۔ نہ بدل سکو تو کبھی اس کے مقابل کھڑی مت ہونا۔ جھک جانا، ہار مان لینا۔ وہ گھر اب تمہارا اول و آخر ہے، سب کچھ ہے۔“

”جی اماں!“ اس نے گہرا سانس لیا۔

”کبھی میری تربیت پر دھبہ نہ لگنے دینا!“

”اماں کیسی باتیں کر رہی ہیں۔“ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”اپنا فرض پورا کر رہی ہوں بیٹی۔“ وہ اداسی سے مسکرائیں۔

مہ جیس کو علم تھا، اسے اتوار کو واپس جانا ہے۔ وہ صبح سے آگئی تھی۔

شام ہونے لگی تو نہا کر اس نے لباس تبدیل کر لیا۔ پنک کلر کا سادہ سا سوٹ تھا۔ مہ جیس نے اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی۔
”یہی کپڑے پہن کر جاؤ گی؟“

”جی۔ کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔ ”اچھے نہیں ہیں کیا؟“

”اچھے تو ہیں۔ کیوں نہیں ہیں اچھے۔ مگر بہت سادہ ہیں۔ تمہاری شادی کو محض ایک ہفتہ ہوا ہے اور اس طرح رہتی ہو جیسے برسوں پہلے کبھی شادی ہوئی ہو۔ اتنے اچھے اچھے کپڑے لائی ہو، ان کا کیا کرو گی؟“
”مجھے تو یہی پسند آئے سو پہن لیے!“ وہ مسکرا دی۔

”بیوقوف سدا کی ہو۔“

وہ اٹھ کر اس کا بیگ دیکھنے لگی۔

”کتنی خوبصورت ساڑھی ہے۔“

اس نے گہرے فیروزہ رنگ کی ساڑھی نکال کر کہا۔ شاکنگ پنک اور گولڈن بناری بارڈ والی، بے حد حسین ساڑھی تھی۔ شاکنگ پنک بلاؤزی آستھیوں پر گولڈن کام تھا۔

”بس یہی پہنو گی آج تم۔“

”آپا۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”مجھے تو یہ باندھنے کی پریکٹس بھی نہیں۔“

”پریکٹس باندھنے سے ہی ہو گی۔ جاؤ بدل کر آؤ!“

اس نے اصرار کر کے بالآخر اس کے کپڑے تبدیل کروا دیے۔ بالوں کی خوبصورت فرنیچ چوٹی باندھ دی۔

”میک اپ تم خود اتنا اچھا کرتی ہو کہ مجھے خود کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی!“ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اطمینان سے بولی۔

اسے دکھانے کے لیے اسے چہرے پر آدھا گھنٹہ ضائع کرنا پڑا۔ جس وقت وہ ہونٹوں پر گہرے شاکنگ پنک کلر کی لپ اسٹک لگا رہی تھی۔ باہر گاڑی کا ہارن بجنا پھر کال بیل بج اٹھی۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر باہر کی سمت چل دی۔ ”یقیناً آپ کے شوہر نامدار نے ڈرائیور بھیجا ہوگا۔“

چند لمحوں میں واپس آ کر اس نے تصدیق بھی کر دی۔

”جاؤ۔ خدا اپنی حفظ و امان میں رکھے تمہیں بھی اور تمہارے شاہ صاحب کو بھی!“ وہ شرارت سے ہنسی۔

ضووفشاں نے ایک نگاہ آئینے پر ڈالی پھر اس کا دل ذرا تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دو دن اسے عالم شاہ کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اور اب دوبارہ اس کے سامنے جانے کے تصور سے اس کی جان نکلنے لگی۔ اور وہ بھی اس تیاری کے ساتھ۔

”چلیں آپا! آپ کو گھراتا رہوں گی!“

”نہیں۔ بس عاصم آتے ہی ہوں گے!“ وہ مسکرائی۔

”تم جلدی کرو۔ وہ دیدہ دل فرس راہ کیے بیٹھے ہوں گے۔“

وہ دھیرے سے ہنس دی۔

اماں، ابا سے مل کر، ڈھیروں دعائیں لے کر وہ باہر نکلا آئی۔ مستعد ڈرائیور نے جلدی سے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے پھر ہاتھ ہلایا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی تو وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ عالم شاہ کے بارے میں سوچنے

لگی۔ دودن کتنے آرام و سکون سے گزر رہے تھے۔ ہر دوسرے لمحے اس کے آن دھمکنے کے خوف سے آزاد، اس کی قربت کے احساس سے بالاتر۔ اور اب پھر اس کی محبت پاش نگاہوں کا سامنا کرنا تھا۔

اک یہ بھی حادثہ ہے مری زندگی کے ساتھ
میں ہوں کسی کے ساتھ، مراد دل کسی کے ساتھ

گاڑی ”رنگ محل“ میں جارکی۔ ڈرائیور نے فوراً اتر کر پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔ گاڑی سے اترتے ہوئے اس کی نگاہ اوپر گئی۔ ”رنگ محل“ کی جگہ ”روشنی والا“ جلی حروف میں لکھا تھا۔

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

”السلام علیکم بی بی جی!“ مكرم علی راستے میں ہی مل گیا۔

”وعلیکم السلام! تمہارے شاہ صاحب کہاں ہیں؟“

”جب سے آپ گئی ہیں وہ تو کمرے سے ہی نہیں نکلے۔“ وہ اداسی سے مسکرایا۔

”کیا؟“ اسے جھکا لگا۔ ”اب وہ تک!“

”جی۔ صرف ایک وقت کا کھانا اندر گیا ہے۔“

”تو۔ تو۔ تم نے انہیں سمجھایا نہیں کہ۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”وہ دروازہ بند کیے بیٹھے ہوں تو کس کی ہمت ہو سکتی ہے اندر جانے کی!“ وہ ہولے سے بولا۔ ”اب آپ آگئی ہیں آپ سمجھائیں بی بی جی!“

وہ پریشانی سے سوچتی، سیڑھیاں چڑھتی اور آگئی۔ دروازے کا ہینڈل موڑ کر اس نے ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ ان لاک تھا، کھلتا چلا گیا۔ اندر حسب توقع اندھیرا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر لائٹس آن کیں۔

وہ اسی جگہ بیٹھا تھا۔ جہاں وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتی وہ اس کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں موندے وہ بے خبر سو رہا تھا۔ سفید لباس ملگیا اور شکن آلود تھا۔ سیاہ بکھرے بالوں اور بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ وہ اسے کوئی اور عالم شاہ لگا۔ ڈرائی کلین ہوئے مغرور سے عالم شاہ قطعاً مختلف! پاس رکھی ٹرے پر کپڑا دھرا تھا۔ اس نے دیکھا کھانا ویسے کا ویسا رکھا تھا۔ اس نے چھو تاک نہ تھا۔ ہاں البتہ قالین پر بکھرے سگریٹ کے ٹکڑوں میں گراں قدر اضافہ ہو چکا تھا۔ نجابانے دودن میں اس نے کتنا دھواں پھونکا تھا۔ حالت خراب میں بھی ہلکی سی تختی سے بھنچے لب سیاہ ہو رہے تھے۔ وہ ایسا بگڑا ہوا روٹھا ہوا بچہ لگ رہا تھا جو کوئی من پسند چیز نہ ملنے پر روتے روتے سو گیا ہو اور جس کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان موجود ہوں۔

اچانک ہی اس نے آنکھیں کھولیں۔ اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے بالکل قریب۔ دوزانوں بیٹھی ضوفشاں بوکھلا گئی۔

”تم آگئیں!“ انتہائی مخمور، سرخ آنکھیں، بوجھل اور سوچی ہوئی تھیں۔

”جی!“ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

”ہاں! میں نے صبح ڈرائیور سے کہا تھا تمہیں لانے کا۔“

”آپ..... آپ نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے!“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”تم ہی تو ہو میری اس حالت کی ذمہ دار۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جا کر پردے ہٹانے لگا۔

”میں!“ وہ حیرت سے منجمد ہو گئی۔

”ہاں۔ تم!“ وہ مڑا۔ ”تم نے ہی روکا تھا نا مجھے اس کو قتل کرنے سے۔ تم نے قسم دی تھی نا مجھے۔ وہ قسم نہیں ایک آگ تھی روشنی! جو میرا سینہ

اب تک دہکا رہی ہے۔ مارنے دیا ہوتا مجھے اس کو۔ دس گولیاں اس کے سینے میں اتار دیتا تو اس گالی کا ازالہ ہو پاتا جو میرے کانوں نے سنی۔ ہزاروں

آدمیوں کے درمیان۔ تم نے تم نے کیوں روکا مجھے۔ کیوں!“

”اسے مار کر آپ خود کہاں جاتے۔“ وہ نرمی سے بولی۔ ”جانتے ہیں!“

”کیا ہوتا؟“ وہ تلخی سے ہنسا۔ ”پھانسی چڑھ جاتا بس!“

”بس؟“ اسے حیرانی ہوتی۔ آپ کے لیے یہ کچھ نہیں ہے؟“

”میرے لیے تو شاید پھر بھی بہت کچھ ہو۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں بولا۔ ”لیکن تمہارے لیے کیا اہمیت ہے اس بات کی؟ تمہیں تو خوشی ہی ملتی نا۔ آزادی مل جاتی۔ شاید کسی دوسرے شخص کا ساتھ مل جاتا!“

دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر وہ بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس کی بات پر صوفشاں نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ جتنا بے نیاز وہ خود کو ظاہر کرتا تھا، اتنا تھا نہیں۔

”اب میرے لیے کسی دوسرے شخص کی ساتھ کے کوئی اہمیت نہیں۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کی اس حالت کی ذمہ دار میں ہوں تو جو سزا چاہے سنا دیں۔ وہ دس گولیاں میرے سینے میں اتا دیں۔ لیکن بہر حال اتنا ضرور سوچیں کہ کسی دوسرے کی دی ہوئی ایک گالی کا ازالہ انسان اپنی زندگی داؤ پر لگا کر نہیں کیا کرتا۔“

”روشنی! روشنی! تم نہیں جانتیں۔ اندازہ ہی نہیں کر سکتی ہو اس کا کہ یہ ایک بات یہ واحد بات جو میں صرف سوچتا ہوں تو میرے جسم میں دوڑتا لہو زہر بن جاتا ہے۔ میرے مساموں سے دھواں نکلنے لگتا ہے۔ میرا وجود بھڑکتی آگ کا ایک گولہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ بات میں نے سنی، کسی اور کی زبان سے۔ یہ گندی گالی، یہ جلتا کوڑا مجھ پر برسائے ہزاروں لوگوں کے سامنے اور میں خاموش رہا۔ کچھ بھی نہ کر سکا میں۔ کیا کبھی عالم شاہ اتنا بے حس ہوا تھا؟ کبھی بھی نہیں! کیا شے ہوتی ہے یہ محبت۔ بھڑکتے انسان کو پانی بنا دیتی ہے۔ ناکارہ کر دیتی ہے۔ توڑ مروڑ کر بے شناخت کر ڈالتی ہے۔ انسان کا اپنا وجود، پوری شخصیت، گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہا۔ یہ محبت میرے جیسے شخص کے بس کا روگ تو نہ تھی۔“

”وہ اٹھ کر دیوار تک گیا اور سر نکا کر دیوار پر کسے برسائے لگا۔“

وہ بھی اٹھ کر اس تک پہنچی۔ چند لمحے تذبذب سے کھڑی لب کاٹتی رہی پھر اس کے مضبوط شانے کو تھام لیا۔

”آپ۔ بھول نہیں سکتے یہ بات؟“

”نہیں!“ وہ بھڑکا۔

”میں کہوں تب بھی نہیں؟“

”تمہاری خاطر ہی تو بھلانے کی کوشش رہا ہوں اسے۔ پچھلے کئی دنوں سے۔ تمہاری قسم روشنی اس رات اگر میں ہاتھ روم میں بند نہ ہوتا۔ یا دوسری صبح تمہیں تمہارے گھر نہ بھیج دیتا تو شاید تمہیں ہی مار دیتا۔“

وہ ہسم کر تھوڑا پیچھے ہٹ گئی۔

”ہاں۔ اتنا ہی غصہ تھا مجھے تم پر کیوں بچائی تم نے اس کی زندگی۔ کیوں دی تھی اپنی قسم مجھے؟“

”آپ۔ آپ کیوں اتنی سی بات کو خود پر سوار کرتے ہیں۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

”اتنی سی بات؟“ اس نے دانت پیسے۔

”کاش کہ تم جان سکتیں۔ کتنا درد ہے عالم شاہ کے سینے میں۔ جانتی ہو ماں کا رشتہ کیا ہوتا ہے اپنی اولاد سے؟ یہ رشتہ میرے لیے ایک پھوڑا ہے، ایک ناسور ہے جو پکتا ہے مجھ میں، مجھے اندر سے گلے جاتا ہے۔“

وہ آگے بڑھ آیا اور اسے بازوؤں میں تھام لیا۔

”سنو روشنی! سنو! مجھے عورت کی ذات پر اعتبار نہیں آتا۔ یہ سر سے پاؤں تک وفا ہے یا سراپے بے وفائی، میں سمجھ نہیں پاتا۔ لیکن اس کے

باوجود میں نے تمہیں چاہا۔ تمہاری خواہش کی تمہیں اپنایا۔ محض اس لیے کہ عورت سے متنفر ہونے کے باوجود میں عورت سے ہار گیا۔ محبت ہار ہی ہوتی ہے نا! کس قدر مجبور ہوں میں اس محبت کے ہاتھوں۔ اس کا اندازہ یوں کرو کہ میں جانتا تھا تمہارا دل کسی اور کے نام ہے۔ تمہاری آنکھوں میں مہکتے خوابوں کی خوشبو کسی اور کے لیے ہے۔ اور یہ جاننے کے باوجود میں تمہیں اپنے گھر لے آیا۔ بے وفائیوں اور ہرجائی پن کے تمام تر خوف کے باوجود! کیا متضاد واقعہ ہے۔ لیکن آج میں تم سے ایک درخواست کر رہا ہوں! روشنی! زندگی میں کبھی بھی ماں کے رشتے سے کھوٹ نہ کرنا، اس ایک لفظ کی حرمت کو اعدا نہ کرنا۔ تمہارے ماتھے پر جو جو روشنی ہے تمہاری آنکھوں میں جو سچائی ہے یہ مجھ سے کہتی ہے کہ جب تم ماں بنو گی تو بہت محبت والی ماں ہو گی۔ اس حرمت اور تقدس کی پاسبان جو ایک ماں کا ہی خاصہ ہو سکتی ہے۔ بس میرے اس یقین کو کبھی بے یقین نہ کرنا۔“

وہ کھلی آنکھوں سے اسے ہنستی رہ گئی۔

کیا بلا کا یہ بدگمان شخص تھا۔ اس سے والہانہ عشق کرتا تھا اور بے وفائی کی امید بھی رکھتا تھا۔

وہ تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

”زنجیروں میں جکڑ کر لائے ہیں تو لازماً یہی سمجھیں گے کہ میرے دل کے کسی کونے میں فرار کی آرزو بھی ہو گی۔ لیکن یاد رکھیں، عورت محبوب سے بے وفائی کر لے تو عورت ہی رہتی ہے، شوہر سے بے وفائی کرے تو گالی بن جاتی ہے۔ میں کبھی بھی خود کو گالی نہیں بناؤں گی۔ سمجھے آپ!“

بہت عرصے بعد اس کے لبوں پر مسکان آئی تھی۔

”براگاتمہیں؟ شاید مجھے اپنے اندیشوں کو یوں بے نقاب نہیں کرنا چاہیے تھا!“

”بہت اچھا کیا آپ نے یہ سب کہہ کر کم از کم مجھے اتنا علم تو ہو گیا کہ آپ مجھے جن محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اب انکے پیچھے بد گمانیوں کے عکس بھی موجود ہیں۔“

”چلو۔ وعدہ ہے عالم شاہ کا۔ آج کے بعد کبھی تمہارے متعلق معمولی سا بدگمان بھی ہو جاؤں تو موت آجائے مجھے۔ تمہارے لبوں سے آج یہ چند لفظ سن کر برسوں سے دل کی سطح پر جمنا شک و شبہات کا غبار صاف ہو گیا ہے۔“

اس کا تھکا تھکا لہجہ صاف ہو کر پھر پہلے جیسا شگفتہ ہونے لگا۔

”ارے۔“ وہ اچانک چونکا تھا۔ ”تم تم نے یہ لباس پہنا ہے۔“

”کیوں؟“ وہ اسے دیکھنے لگی۔ ”پسند نہیں ہے آپ کو؟“

”بہت پسند ہے!“ وہ ہلکے سے ہنسا۔

”ساڑی ہمیشہ میرا پسندیدہ لباس رہی ہے۔ عورت بڑی باوقار، بڑی مکمل لگتی ہے۔ ذرا ادھر دروازے تک جاؤ اور چل کر پھر واپس مجھ تک آؤ میں تمہیں ہر زاویے سے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”اس کے لیے بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ پھر بھی وہ بنا کچھ کہے مڑ کر دروازے تک گئی اور پلٹ کر اس تک آ گئی۔

”شاندار!“ وہ ستائشی لہجے میں بولا۔ ”تم پر تو یہ لباس کچھ اور ہی دلکش لگتا ہے۔ اکثر پہنا کرو۔“

”آپ بھی بدل لیجیے کپڑے۔ نہا کر فریش ہو لیں۔“ وہ سر جھکا کر آہستہ سے بولی۔

”ہاں۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے سر بلایا۔ ”تم حسینہ سے کھانا لگانے کا کہو۔ میں تب تک نہاتا ہوں۔ پھر کہیں باہر چلتے ہیں۔“

اس نے ہولے سے سر بلایا اور مڑ کر کمرے سے نکل گئی۔



کھلی کھڑکی سے پرے نیلے روشن آسمان کی وسعتوں کے نیچے پھیلی جھیل کے پانیوں میں بھی نیلے آسمان کا عکس تھا۔ ہر شے بڑی کھلی ہوئی چمکدار اور روشن لگ رہی تھی۔

ضوفشاں کا جی چاہا، دوڑتی ہوئی جائے اور پانی میں آگے تک جانکے۔
”جگہ پسند آئی؟“

”عالم شاہ، نوکر کرکھانے کا کہہ کر آیا تھا۔ اسے یوں محویت سے باہر تکتا پا کر اس نے پوچھا۔
”جی۔ بہت!“ وہ باہر دیکھتی رہی۔

”ابھی تو دو پہر ہے۔ سورج چمک رہا ہے۔ منظر واضح ہے کل صبح جلد اٹھ کر دیکھنا ہوگا۔ فطرت کے حسن پر حیران رہ جاؤ گی۔ پانی کے اوپر کبر ہوگی۔ جو آسمان تک پھیلتی معلوم ہوگی۔ سفید آبی پرندوں کے غول کے غول کناروں پر اور پانی کی سطح پر جمع ہوں گے۔ ہر شے اتنی مقدس، اتنی دلکش معلوم ہوگی کہ تمہارا دل ہمیشہ یہیں رہ جانے کو چاہے گا۔“

”آپ آتے رہتے ہیں یہاں؟“ اس نے کھڑکی کے آگے سے ہنستے ہوئے پوچھا اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”ہاں۔ جب میرے دوست نے یہ ریست ہاؤس بنوایا تھا تب اس کی دعوت پر ایک ہفتہ یہاں گزار کر گیا تھا۔ اس کے بعد بھی ایک دو مرتبہ آنا ہوا ہے لیکن۔“

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اسے مسکرا کر دیکھا۔
”لیکن؟“

”لیکن اس مرتبہ تو ایسا لگتا ہے جیسے جنت میں آ نکلا ہوں۔ وجہ اس مصنوعی جھیل کا حسن نہیں۔ تمہارا حسن ہے۔“ وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔ ”میں نے شادی سے پہلے بھی سوچ رکھا تھا کہ بنی مون کے لیے تمہیں یہاں لے کر آؤں گا۔ میں نے تقریباً پوری دنیا ہی گھوم رکھی ہے لیکن یقین کرو، جتنا حسن، جتنا سکون میں یہاں پاتا ہوں۔ کہیں اور نہیں پاتا۔ دنیا بھر میں یہ جگہ میری پسندیدہ ترین جگہ ہے۔“
”جی۔ بہت خوبصورت جگہ ہے!“ اس نے سر بلایا۔

”تم کہو تو یہ ریست ہاؤس میں خرید لوں۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ ہولے سے مسکرا دی۔ ”جب چاہے آ تو جاتے ہیں۔ آپ یہاں!“

”ہاں۔ بالکل۔ نواب قاسم خان میرا جگری دوست ہے۔ زبانی طور پر تو اس نے مجھے ہی دے رکھا ہے ہی ریست ہاؤس۔ لیکن میرا دل چاہتا ہے روشنی کہ میں دنیا کی ہر شے باضابطہ طور پر تمہارے نام لکھوا دوں۔“
وہ ہنس کر خاموش ہو گئی۔

”جو کچھ میں تمہارے لیے کرتا ہوں۔ کیا تمہیں اس سے خوشی نہیں ہوتی روشنی؟“

”اسے بڑی دیر تک دیکھ کر اس نے ایسے لہجے میں پوچھا جس کی تہ میں حسرتیں پوشیدہ تھیں۔

ضوفشاں نے خاموش نظریں اس پر جمادیں۔ ان آنکھوں میں سید عالم شاہ کے اندر تڑپتے مچلتے ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کھڑا ہو گیا۔

”کھانا اب تک تیار نہیں ہو۔ میں دیکھتا ہوں!“

”وہ شمال کو بازوؤں کے گرد لپیٹتا باہر نکل گیا۔ ضوفشاں نے بیڈ کی پشت سے سر نکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔

وہ یہاں آنے کے لیے ذہنی طور پر قطعاً تیار نہ تھی۔ محض عالم شاہ کی ضد سے مجبور ہو گئی تھی۔ اپنے اندر کو مار مار کر وہ ادھ موٹی ہو جاتی تھی، تب کہیں جا کر عالم شاہ کی وارھکیاں برداشت ہو پاتی تھیں۔ ”روشنی ولا“ میں تو ہزار کام ہوتے تھے جو اسے ضوفشاں سے دور رکھتے تھے۔ زمینوں کے

معاملات، وہاں سے مختلف کاموں سے آئے ہوئے لوگوں کے مسائل، نوکروں کی ہدایات کا سلسلہ، دوستوں کی آمد و رفت۔ وہ بیشتر وقت ان تمام باتوں میں الجھا رہتا اور وہ قدرے سکون سے رہا کرتی۔ لیکن یہاں آنے سے قبل اسے علم تھا کہ اسے دن رات وہ قربت برداشت کرنی ہوگی، جس کے خیال سے ہی اس کے اندر بے چینیوں پر پا ہو جاتی ہیں۔ پھر اس نے سوچا تھا، اسے تمام عمر اس تپتے صحرا میں اسی طرح چلتے جانا ہے، پھر گریز کیسا اور کیسا انکار سر تسلیم خم کر کے وہ اس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔



انگلی صبح وہ فجر کی نماز پڑھ کر باہر چلی آئی۔ عالم شاہ نے بالکل درست کہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ مہبوت کھڑی قدرت کے صنایعوں اور رعنائیوں کو دیکھتی رہ گئی۔ تاحد نگاہ پھیلتے شفاف پانیوں کو کہر کے بادلوں نے جھک کر جیسے اپنے بازوؤں میں لپیٹا ہوا تھا۔ پرندوں کے غول کے غول تھے۔ جو آسمان پر، پانی کی سطح، کناروں کی سطح پر، کناروں پر جمع تھے۔ اسے لگا وہ واقعی جنت کے کسی گوشے میں موجود ہے۔

چپیلیں اتار کر اس نے شفاف پانی کے اندر جسے بڑے بڑے پتھروں پر قدم جمائے اور ذرا سا آگے جا کر بیٹھ گئی۔ سردیاں اپنے اختتام پر تھیں اور فی الوقت فضا میں تیرتی ٹھنڈک اسے بھلی لگ رہی تھی۔

”کیا حسین نظارہ ہے۔ کیا جنت نظیر جگہ ہے!“

اس نے گھٹنے سے ٹھوڑی ٹکا کر سوچا۔

”نجانے کیا راز ہے اس میں۔ انسان جس جگہ کو پسند کرے وہاں اپنی من چاہی شخصیت کی ہمراہی میں ہی آنا کیوں چاہتا ہے۔ عالم شاہ یہاں میرے ساتھ ہی آنا کیوں چاہتا تھا۔ اور اگر مجھے اختیار حاصل ہوتا تو میں۔ میں۔“

اس نے دل میں ایک چور دروازہ ہوتا محسوس کیا۔

”نہیں۔“ پھر اس نے سختی سے سر جھٹک دیا۔

”اب مجھے ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ خدا کے واسطے آذر! مت در آیا کرو مجھ میں ان چور دروازوں سے۔ میں بھول جانا چاہتی ہوں تمہیں۔“

اس کے اندر سے ایک سسکی نکلی پھر اس نے ہتھیلیوں سے آنکھوں کے کنارے رگڑ دیے اور پانی پر نظریں جمادیں۔ جس جگہ وہ بیٹھی تھی وہاں سے پانی کی گہرائیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ اس نے انگلی پھیر کر پتھر کی چکنی سطح کو محسوس کیا اور خوف زدہ ہو گئی۔

”اگر میں کھڑی ہوئی اور میرا پاؤں پھسل گیا۔ تو!“ اس نے سوچا۔

ایسی صورت میں کوئی شے ایسی نہ تھی جسے وہ تھام سکتی۔ پلک جھپکتے میں اس کا وجود ٹھنڈے، سرد پانی کی گہرائیوں میں جا پہنچتا۔ وہ پانی جو باہر سے دیکھنے میں دلکش، چمکدار، خوب صورت، حیات آفریں تھا اور اندر سے سفاک، سرد مہر اور بے رحم تھا۔ اسے بل بھر میں یوں نگل جاتا کہ پھر نہ وہ رہتی نہ کسی آذر کا تصور، نہ کسی عالم شاہ کی رفاقت۔

”عالم۔“ خوف کے عالم میں بے اختیار اس نے پکارا تھا۔

”ہاں روشنی۔ کہو؟“

اس کے اندر جیسے نئی زندگی کا اعتماد دوڑ گیا۔ سر گھما کر اس نے دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

”آپ!“ اس نے گہرا سانس آزاد کیا۔ ”آپ کب آئے؟“

”کافی دیر ہو گئی۔“ وہ مسکرایا۔ ”تم جھیل میں پھیلے پانی کو دیکھ رہی تھیں اور میں تمہاری پشت پر بکھرے خوب صورت بالوں کو۔ اس محویت میں کوئی مجھ سے پوچھتا کہ دن ہے یا رات، تو میں کہتا، رات! لیکن تم نے مجھے پکارا کیوں تھا؟“

”میں۔ میں ڈر گئی تھی۔ میں سوچ رہی تھی میں پھسل کر پانی میں گر نہ جاؤں!“

”عالم شاہ نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ ضوفشاں نے اسے تھاما اور اٹھ کر اس تک آ گئی۔

”جب تک عالم شاہ زندہ ہے، موت اور تمہارے بیچ ایسی دیوار بنا رہے گا کہ نہ تم اس کی ہلکی سی پرچھائیں دیکھ پاؤ گی نہ وہ تمہاری۔“ وہ اسے قریب سے دیکھ کر مسکرایا۔

اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت سے آزاد کر لیا اور آگے بڑھ گئی۔

ذرا سا آگے جا کر اسے مڑ کر دیکھا، وہ اسی جگہ کھڑا تھا۔ نظروں میں ایک عجیب سا احساس شکست لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

ضوفشاں کو اپنے رویے میں بسی بے پناہ سرد مہری اور لائقیت کا احساس ہوا۔ لیکن وہ بھی کیا کرتی۔ دل کے ہاتھوں اگر وہ مجبور تھا تو وہ بھی دل سے ہی شکست کھائے ہوئے تھی۔

چپلیں دوبارہ پیروں میں ڈال کر وہ وہیں گھاس پر بیٹھ گئی۔ وہ پانیوں پر نگاہ جمائے نہلتا رہا۔ ضوفشاں نے اس کے لمبے چوڑے باعتبار وجود کو غور سے دیکھا۔ تھوڑی دیر پہلے جو جھیل اسے ہولناک اور مہیب لگی تھی اب اس کے چلے آنے سے کیسی سہمی ہوئی اور معصوم لگتی تھی۔ وہ نہلتا ہوا آیا اور اس سے ذرا سے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

”سنوروشنی۔“ اچانک اس نے کہا۔ ”تم نے عمر ماروی کی داستان پڑھی ہے؟“

ضوفشاں نے اسے دیکھا اور ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”روشنی! کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ ماروی کو عمر سے محبت ہو جائے؟“

بڑی زخمی مسکراہٹ ضوفشاں کے لبوں پر پھیل گئی۔ اس کی بات کا کوئی بھی جواب دینے کے بجائے وہ سر جھکا کر زمین کو انگوٹھے سے کھودنے لگی۔

”مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہیں تمہاری خواہش اور رضا کے بغیر اپنایا ہے۔“ وہ سوچتا ہوا بولنے لگا۔ ”میں جانتا ہوں تمہیں کسی اور کے ساتھ کی خواہش تھی، تمہارا دل کسی اور کے لیے دھڑکتا تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا اور ہے کہ جتنی محبت تمہیں اس سے تھی اور اسے تم سے۔ ان دونوں محبتوں کو جمع کر کے ترازو کے ایک پلڑے پر رکھا جاتا ہے اور دوسرے پر عالم شاہ کی محبت، جنون اور خواہش کی، تو تمہاری قسم روشنی میرا پلڑا بھاری ہوتا، میں میں نہیں رہ سکا یہ سب کچھ کیے بغیر، مجھے یاد ہے تم نے کہا تھا کہ تمہیں اپنے دل پر کبھی بھی یہ اختیار نہ ہوگا کہ تم اسے میرے نام کر دو۔ تم نے کہا تھا کہ میرے حصے میں محض ایک خالی، کھوکھلا وجود ہی آسکے گا اور جواباً میں نے دعویٰ کیا تھا کہ میں اس خالی، کھوکھلے وجود کو بھی اپنی تمنائوں سے پہنچ کر اس میں محبت کے گلزار کھلا دوں گا۔ لیکن۔ اب کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے روشنی کہ میں نے برسوں تپتے صحراؤں کی خاک چھان کر ایک اہرام دریافت تو کر لیا ہے لیکن اس خوب صورت تاج محل جیسے مقبرے کے اندر جانے کا راستہ مجھے نہیں ملتا۔ میں باہر کھڑا اس کی مرمریں دیواروں سے اپنا سر پھوڑ رہا ہوں، پاش پاش ہو رہا ہوں۔ لیکن کوئی ایک در، کوئی ایک کھڑکی، کوئی ایک روزن میرے نام کا نہیں ہے اور مجھے یہ بھی وہم ہے کہ کبھی میں کوشش کر کے اندر پہنچا بھی تو مجھے علم ہوگا کہ اس اہرام میں دفن خزانہ تو کوئی اور کب کا لے جا چکا۔ میرے حصے میں تو بس ایک سرد لاش رہ گئی ہے“ کئی آنسو ضوفشاں کی آنکھوں میں بھرے اور پٹ پٹ نیچے گھاس پر گرنے لگے۔

”میں، میں تمام تر جذبات سمیت تم تک آتا ہوں تو تم برف کا ایک ایسا بت بن جاتی ہو جسے عشق کی پاگل آگ بھی نہیں پگھلا سکتی۔ تم اکیلی ہوتی ہو تو نجانے وہ کون سا خیال ہوتا ہے جو تمہارے لبوں پر مسکراہٹیں، تمہاری آنکھوں میں چمک اور تمہارے گالوں پر گلال بکھیر دیتا ہے۔ میں تم تک پہنچتا ہوں تو تمہاری مسکراہٹیں دم توڑی دیتی ہیں تمہارے گال سرسوں کا کھیت بن جاتے ہیں تمہاری شعر کہتی آنکھیں نوے پڑھنے لگتی ہیں میرے لیے تمہارے لبوں پر خوشی سے بھری ایک مسکان تک نہیں آتی۔ عمر نے تو ماروی کو دولت سے جیتنا چاہا تھا۔ میں تو تمہیں جذباتوں سے رام کرنا چاہتا ہوں۔ محبت اتنی بے اثر تو نہیں ہوتی روشنی اتنی بے اثر!“

وہ تھک کر آسمان کو دیکھنے لگا۔

صوفشاں نے اسے دیکھا۔ اس کا دل دکھنے لگا۔ وہ خود زخم خوردہ تھی۔ اس کی تکلیف پر تڑپ سی گئی۔

”آپ۔ اگر اس ایک بات سے ہی خوش ہو سکتے ہیں۔ تو میں کہہ دیتی ہوں۔“ اس نے رک رک کر کہا۔ ”میں کہہ سکتی ہوں کہ مجھے آپ

سے۔“

”نہیں۔“ دفعتاً وہ درشتی سے بولا تھا۔

”نہیں۔“ پھر اس کے لہجے میں نرمی در آئی۔

”نہیں روشنی۔ میں نے کہا تھا نام تم سے کہ یہ ایک بات میں تمہارے لبوں سے سننا چاہوں گا لیکن جذبوں کی بھرپور سچائیوں کے ساتھ۔

زبان اور دل کی مکمل ہم آہنگی کے ساتھ خواہ اس دن کے انتظار میں یوم حشر آ پہنچے۔ لیکن اس سے لمحہ بھر پہلے بھی جھوٹ بول کر مجھے سرنگوں نہ کرنا تمہارا جھوٹا اظہار مجھے میری ہی نظروں میں گرا دے گا۔ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا عالم شاہ۔“ وہ کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر کی جانب چلتا چلا گیا۔

”کیسا بے حاصل انتظار ہے تمہارا عالم شاہ۔“ اس نے سرد آہ بھر کر سوچا۔ ”شاید تمہاری عمر بھی بیت جائے گی اور میری بھی!“



ہسپتال سے عاصم بھائی کا فون آیا تھا۔ مہ جیس نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا تھا لیکن اس کی اپنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ عاصم بھائی نے اسے فوراً پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ اماں، ابا اور پھوپھی اماں اور پھوپھا جان چاروں مل کر عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے، کسی بھی روز ان کی واپسی متوقع تھی لیکن مہ جیس کی حالت اچانک خراب ہو جانے کے باعث اسے وقت سے پہلے ہی ہسپتال لے جانا پڑ گیا تھا۔

”عالم شاہ۔“ وہ فون رکھ کر تیزی سے اس تک پہنچی تھی۔ ”مجھے ہسپتال جانا ہے۔ جیس آپا کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ لیکن ان کی اپنی حالت ٹھیک نہیں۔“

”اچھا۔“ وہ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ ”ضرور جاؤ!“

”آپ! نہیں چلیں گے؟“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھی۔

وہ حتیٰ الامکان اس کے ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں سے ملنے سے گریز کرتا تھا۔ اور خود تو کبھی اس کے میکے گیا ہی نہ تھا۔

”میں۔ میں آؤں گا بعد میں۔ تم پہلے چلی جاؤ۔“

”جی۔“ وہ سر جھکا کر باہر نکل آئی۔

وہ ہسپتال پہنچی تو عاصم بھائی کا ریڈور میں ہی مل گئے۔

”جیس آپا کیسی ہیں۔“ اس نے بے تاب سے پوچھا۔

”شکر ہے خدا کا۔“ وہ ہولے سے مسکرائے۔

”خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آؤ تمہیں تمہارا بھانجا دکھاؤں۔“

گل گوتھنا سا بچہ اس نے بازوؤں میں بھرا تو اس کے لب خود بخود مسکرا اٹھے۔

”کتنا پیارا ہے۔ بالکل آپا پر گیا ہے۔“

وہ کھل کر ہنس دی۔

اگلے دن مہ جیس کو بھی کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اس کی حالت ابھی بھی ایسی تھی کہ اسے ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ ہسپتال میں ہی رہنا تھا۔

ضووفشاں رات کو اس کے پاس ہی ٹھہری تھی۔ دوسرے دن عاصم بھائی نے اسے سمجھا کر تھوڑی دیر کے لیے گھر بھیج دیا۔

”کیسی ہیں تمہاری آپا؟“

وہ کہیں جانے کے لیے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر پہلی بات یہی پوچھی۔

”اب ٹھیک ہیں۔ شکر اللہ کا!“ وہ مسکرا دی۔

”اور تمہارا بھانجا؟“ اس نے چند لمحے رک کر پوچھا۔

”بالکل خیریت سے ہے اور بہت پیارا ہے۔ لیکن آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”زمینوں پر کچھ کام پڑ گیا ہے۔“ وہ مڑ کر بالوں میں برش کرنے لگا۔ ”چند دنوں کا کام ہے۔ اتوار تک لوٹ آؤں گا۔“

”اچھا۔“ وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔

”سنو، روشنی۔“ وہ اچانک مڑا تھا۔ ”اپنی شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟“

”وہ سوچ میں پڑ گئی۔“

پھر اس نے آہستہ سے بتایا۔ اس سوال کے پیچھے کون سا سوال تھا اس سے پوشیدہ نہ رہا۔

”ڈیڑھ سال۔“ اس نے زیر لب دہرایا۔ ”روشنی کتنا اچھا ہوتا کہ ہماری بھی کوئی اولاد ہو جاتی کیا تمہیں خواہش نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں ہے۔“ وہ ہولے سے بولی۔ ”بس جب خدا کی مرضی ہو!“

”جانتی ہو۔“ وہ اس کے قریب آگیا اور اسے بازوؤں میں تھام لیا ”میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہماری ایک بیٹی ہو۔ بالکل تمہاری جیسی۔ اجلی، پیاری۔ ہم اپنی بیٹی کا نام سحر رکھیں گے۔ سحر شاید اس کے چلے آنے سے اس خاموش، اداس رات کی سحر ہو جائے!“

وہ بہت دھیمے سروں میں بڑبڑا رہا تھا۔

”چلتی ہو میرے ساتھ؟“ پھر اچانک وہ اپنے انداز میں لوٹے ہوئے پوچھنے لگا۔

”کہاں؟“ وہ اس کی خودکلامی میں گم تھی، اچانک چونک اٹھی۔

”زمینوں پر۔“ وہ مسکرایا ”اپنا گھر بھی ہے وہاں۔ انجوائے کرو گی!“

”نہیں۔ آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں ہسپتال میں ہی رہنا ہے ابھی اور دیکھ بھال کے لیے کوئی بھی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے اصرار نہیں کیا۔ ”میں لوٹوں گا تو ملوں گا ان سے۔“

وہ اس کے ساتھ ساتھ باہر تک گئی تھی۔



نجانے قبولیت کے کن لمحوں میں عالم شاہ نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ دوسرے دن شام کو جب ڈاکٹر نے اسے اس کے اندر جنم لینے والی نئی زندگی کے متعلق بتایا تو وہ بڑی دیر تک یہی سوچتی رہ گئی۔

مہ جیس بھی یہ خوش خبری سن کر نہال ہو گئی تھی۔

”اللہ کرے تمہارے ہاں چاند سی بیٹی ہو۔ پھر میں اسے تم سے اپنے حارث کے لیے مانگ لوں گی۔“

”نہیں آپا۔“ وہ ذرا سختی سے بولی۔ ”ابھی ان باتوں کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ تقدیر کی بند کتاب کے اندر لکھے گئے فیصلوں کو پڑھنے پر جب ہم قدرت نہیں رکھتے تو پھر ہمیں چاہیے کہ اپنی خواہشات کو بھی قبل از وقت ظاہر نہ کریں کیا خبر وہ ان چھپے ہوئے آسمانی فیصلوں سے مطابقت رکھتی بھی ہوں یا نہیں۔“ مہ جیس محض اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”اماں، ابا اور پھوپھی جان کے آنے میں دو دن رہ گئے ہیں۔“ پھر اس نے بات بدل دی۔

”تب تک آپ کو بھی ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ کتنا خوش ہوں گے وہ لوگ۔ بڑا سر پرانز ہو گا ان کے لیے!“

”ہاں۔“ مہ جیس مسکرائی۔ ”ایک نہیں دو، دوسرے پرانز۔ تمہارے شوہر کو پتا چلا؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلادیا ”شام کو شاید ان کا فون آئے تب بتاؤں گی۔ ایسے انہوں نے بھی آپ والی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ انہیں بھی بیٹی کی آرزو ہے!“

”ضوٹی۔ تیری بیٹی تو بہت بڑے باپ کی بیٹی ہوں گی۔“ مہ جیس کچھ سوچ کر مایوسی سے بولی۔ ”ہم جیسے چھوٹے موٹے لوگ تو اس کی نظروں میں سمائیں گے ہی نہیں!“

”کیا ہے آپا!“ وہ ہنس دی ”کہہ تو رہی ہوں ابھی ان باتوں کے لیے وقت پڑا ہے۔“

”ہوں!“ اس نے سر ہلایا۔ ”پھر بھی، اب انسان اس بات پر بھی تو قدرت نہیں رکھتا کہ اپنے دل میں خواہشات کو جنم ہی نہ لینے دے!“

وہ خاموش ہو گئی۔

شام اتری تو اس نے فون کر کے ڈرائیور کو بلوایا۔ عالم شاہ نے شام کو فون کرتے رہنے کا کہا تھا لہذا وہ شام کو گھر پر ہی رہتی تھی، اور آج تو پہلی بار اس کا دل اس سے بات کرنے کو چاہ رہا تھا۔

حسب وعدہ اس نے سات بجے فون کیا تھا۔

”اوہ جان عالم۔ کیسی ہو؟“ نجانے کیوں وہ بڑی ترنگ میں تھا۔

”جی۔ میں ٹھیک ہوں۔“ وہ بولی ”آپ اتوار کو ہی آئیں گے۔“

”خاہر ہے۔ آنے سے قبل تمہیں بتایا تھا میں نے۔ کیوں کوئی مسئلہ ہے کیا؟“

”مسئلہ تو نہیں۔“ وہ رک رک کر بولی۔

”ہاں ایک اچھی خبر ہے۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسا ”سناؤ!“

”آپ نے جانے سے قبل ایک خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اب اس خواہش کے پورا ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے۔“ وہ بے تابی سے بولا تھا ”تمہارا..... مطلب ہے روشنی..... وہ چاندی اجلی بیٹی کی خواہش۔“

”جی!“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اوہ۔ اوہ گاؤ!“ اس کی آواز اور لہجے میں دنیا بھر کی خوشیاں سمٹ آئیں ”تم نے مجھے تب ہی کیوں نہ بتا دیا۔“

”تب میں خود لاعلم تھی۔“

”تم خوش ہو روشنی!“

”جی!“ وہ ہولے سے ہنس دی۔

”میں بھی خوش ہوں۔ بے انتہا خوش۔ بے اندازہ! میں میں فوراً دیکھنا چاہتا ہوں تمہیں ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر میں ابھی آ رہا ہوں۔“

”ابھی!“ وہ متعجب ہوئی ”لیکن آپ کے کام۔“

”میرے لیے فی الوقت دنیا کا ہر کام اس خوشی کے آگے پیچھے ہے جو میں تمہیں دیکھ کر، تم سے مل کر پاؤں گا۔ میں آ رہا ہوں۔“

”لیکن راستہ لمبا ہے اور رات سر پر آ رہی ہے۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”بے فکر ہو جان عالم۔“ وہ ہنسا ”چھ گھنٹے کی مسافت محض تین گھنٹوں میں طے کر کے میں تمہارے سامنے ہوں گا۔“

”عالم شاہ، عالم سنیں۔“

وہ پکارتی رہ گئی لیکن وہ فون بند کر چکا تھا۔ پریشان ہی ہو کر وہ فون کے پاس سے ہٹ گئی۔ اسے دوبارہ ہاسپٹل مہ جہیں کے پاس جانا تھا۔

رات کا کھانا وہ اس کے ساتھ ہی کھاتی لیکن اب عالم شاہ کی فوری آمد سے اسے متذبذب کر رہی تھی۔

اس کی کلائی پر بندی گھڑی کی چمکتی سویلوں کو دیکھا۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔ دوڑھائی گھنٹے وہ مہ جہیں کے پاس گزار کر اس کی آمد سے قبل

لوٹ کر آ سکتی تھی۔

”امید۔“ اس نے چائے لاتے نوکر کو مخاطب کیا ”ڈرائیور سے کہو، گاڑی نکالے۔ میں آ رہی ہوں۔“

اس کی واپسی دس بجے ہوئی تھی۔ گھڑی دیکھتی، سیڑھیاں چڑھتی وہ اندر آ گئی۔

بال کے ایک کونے میں خیراں اوٹھ رہی تھی۔

”خیراں!“

”جی بی بی!“ وہ ہڑبڑا کر انھی ”آگئیں میری بی بی صاحب کھانا لگا دوں جی!“

”نہیں۔ تمہارے شاہ صاحب نہیں پہنچے؟“

”جی؟“ وہ ہونق ہوئی ”وہ تو جی گئے ہیں نازمینوں پر۔“

”افوہ۔“ وہ جھٹکرا آگے بڑھ گئی۔

ظاہر ہے کہ اس کی اچانک آمد کا علم محض اس کو ہی تھا۔

اس کی نیند کی رواں لہروں میں دروازے پر دی گئی دستک حائل ہوئی تھی۔

اس کی نظر سامنے رکھے ماتم پیس پر گئی پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بستر سے اتر کر وہ تیزی سے دروازے کی سمت بڑھتی تھی۔

”بی بی جی!“ باہر مکرم کھڑا تھا۔

”مکرم!“

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی صورت پر جیسے کوئی اندوہناک حادثہ تحریر تھا۔

مکرم علی۔ تمہارے شاہ صاحب!“ اس کے لب کاپنے۔

”ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“ وہ مدہم آواز میں بولا تھا۔ ”آپ کپڑے بدل لیں۔ ہم ہسپتال جا رہے ہیں۔“

دروازے کو تھامے تھامے وہ نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھار ہا تھا۔



ہسپتال کے برآمدے کے ایک گول ستون سے ٹیک لگائے وہ بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ مکرم علی سر جھکائے اس سے ذرا فاصلے پر تھا۔

”شاہ صاحب نے جلد پہنچنے کے لیے۔ شارٹ کٹ کا انتخاب کیا تھا۔“ وہ اسے بتا رہا تھا۔

”وہ راستہ بے حد خطرناک ہے۔ جنگل اور اجاز علاقہ ہے۔ شاہ صاحب کی گاڑی ایک موٹر پر توازن کھو کر کھڈ میں جا گری۔ جو نوکیلے

پتھروں سے بھرا تھا۔ شاہ صاحب کمر کے بل ان پر گرے تھے۔ اسی لیے ان کی ریزھ کی ہڈی پر چوٹیں آئی ہیں جو بہت خطرناک ہیں۔ ان کا بچنا زیادہ

ممکن نہیں۔“

اس نے ڈاکٹر سے حاصل کردہ معلومات اسے فراہم کر کے ایک نگاہ اس کے ستے ہوئے چہرے، ہنکھڑے بالوں اور خشک آنکھوں پر ڈالی

اور مڑ گیا۔

پوری رات اس نے اسی طرح کھڑے کھڑے گزار دی تھی۔ مکرم علی نے کئی بار اس سے گھر چلنے کی درخواست کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی

تھی۔ لب جیسے سب کچھ کہنا اور کان کچھ بھی سننا بھول گئے تھے۔

”کتنی آزمائشیں اور کتنی آزمائشیں۔“ بس ایک تکرار تھی جو اندر جا رہی تھی، صبح ڈاکٹر نے اس سے خود بات کی۔

”آپ کے شوہر کے بارے میں فی الوقت کچھ بھی کہنا ممکن نہیں۔“ وہ اسے بتا رہا تھا۔

”فٹنی فٹنی چانسز ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ بچ جائیں مگر اس طرح کی ساعری عمر کے لیے معذور ہو جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بالکل ٹھیک

ہو جائیں فی الوقت وہ کوما کی حالت میں ہیں۔ کل ان کا آپریشن ہے۔ اس کے کامیاب ہونے کی صورت میں تین ماہ بعد دوسرا آپریشن ہوگا۔ خوبی

قسمت سے وہ آپریشن کامیاب ہو گیا تو آپ کے شوہر انشاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ پہلے کی طرح!“

اس نے ایک نظر ڈاکٹر کے سنجیدہ چہروں پر ڈالی۔ ان کی تسلیوں میں چھپے کھوکھلے پن کو محسوس کیا پھر اٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔

”بی بی جی!“ مکرم علی باہر موجود تھا۔ ”چلیے، میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔ آپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ کل سے آپ نے بالکل آرام نہیں

کیا۔“

”میں ٹھیک ہوں مکرم!“ اس نے سرد آد بھری۔

”آپ یہاں رہ کر بھی شاہ جی کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ گھر میں چل کر تھوڑا آرام کر لیں۔ سائیں تو ٹھیک ہو کر

مجھ سے ہی پوچھیں گے ناکہ میں نے آپ کا کتنا خیال رکھا۔“

ایک زخمی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے مکرم علی کو دیکھا اور بوجھل قدموں سے اس کے آگے آگے چلنے لگی۔



”کیا ایسا نہیں ہو سکتا عالم شاہ کہ تم مر جاؤ؟“ اس کے سوائے ذہن میں کچھ آوازیں گونجیں۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اچانک ہی کوئی مہیب حادثہ تمہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لے۔ گاڑی تیزی سے چلاتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں دھند اتر آئے۔ تمہارا راستہ، اندھیروں میں ڈوب جائے۔ تم گہرے، اندھیرے کھڑروں میں جا گرو اور کوئی تمہاری لاش کو وہاں سے نہ نکالے۔ تمہاری لاش، لاش، لاش!“

ایک چیخ کے ساتھ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ عالم شاہ کا خون آلود وجود اب تک اس کی آنکھوں میں پردے پر ڈوب اور ابھر رہا تھا۔ گہرے گہرے سانس لے کر اس نے خود کو حواسوں میں لانے کی کوشش کی اور سر ہانے رکھنے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر لیوں سے لگا لیا۔ مکرم علی نے اسے گھر لا کر بڑی منتیں کر کے خواب آور گولیاں کھلا کر سلا دیا تھا اور نجانے کب سے وہ نیند میں یہی ایک منظر بار بار دیکھ رہی تھی اور اب کبھی اپنے ہی کہے الفاظ نے جو شاید ایک طویل عرصے سے اس کے لاشعور میں محفوظ تھے، اس کے ذہن میں ہر طرف ایک ہلچل سی مچادی تھی۔

بڑی دیر تک وہ ساکت بیٹھی رہی۔

”وہ بد دعائیں میں نے تمہیں دی تھیں یا اپنے نصیب کو!“ پھر ایک سسکی لے کر اس نے سوچا۔ ”اور کیا وہ بد دعا قبول ہو گئی تھی؟ اگر قبول ہو گئی تھی تو پھر اتنی دیر کیسے ہو گئی۔ اتنی دیر۔“

خاموش، اداس، بیدروم کی ہر ہر شے کو دیکھتے دیکھتے اچانک اس کے دل و دماغ پر وحشت سوار ہو گئی۔ اسے لگا، ایک، ایک چیز بظاہر ساکت ہے لیکن اس خاموشی کے اندر کہیں نوے بلند ہو رہے ہیں، جنہیں نکل رہی ہیں، ہر طرف طوفان برپا ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ سانس کا راستہ بند ہونے لگا۔ خود کو گھسیٹتی ہوئی وہ بیدروم سے باہر لائی تھی۔

”ڈرائیور۔“ وہ چیخی۔ ”گاڑی نکالو۔ فوراً۔“

”کہاں لے چلوں بی بی جی!“

اس کے پچھلی نشست پر بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے ادب سے پوچھا۔ ”پھوپھی اماں کے گھر!“ اس نے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ وہ قطعی طور پر اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ دل و دماغ وحشت سے چلا رہے تھے۔ اس کے قابو میں ہی نہ آ رہے تھے۔

گاڑی رکی۔ ڈرائیور نے اتر کر، لپک کر اس کی جانب کا دروازہ داکیا۔ وہ نیچے اتری اور بغیر کچھ کہے سنے دروازہ دھکیل کر گھر میں داخل ہو گئی۔

صحن میں برآمدے میں اور پھر برآمدے سے ہر ہر کمرے میں وہ داخل ہو کر واپس نکلتی رہی۔ پورا گھر خالی پڑا تھا۔ اس کی وحشت میں اضافہ ہو گیا۔

”آپا!“ وہ چلائی۔ ”پھوپھی اماں!“ اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کوئی کاندھا ایسا میسر نہ تھا جس پر سر رکھ کر یہ آنسو بہاتی۔ وہ تنہا تھی بالکل تنہا اور درد کا لامتناہی صحرا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ حواسوں میں لوٹی تو آنسو تھیلیوں سے پونچھ کر اس نے ایک بار پھر پورے گھر میں نگاہ دوڑائی۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ خود ہی فراموش کر بیٹھی تھی کہ مہ جیس ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھی اور عاصم بھائی کو اس وقت اسی کے پاس ہونا تھا لیکن دروازہ کیوں کھلا تھا۔ باہر تالا کیوں نہیں تھا۔

وہ سخت حیرانی کے عالم میں کھڑی یہ سب کچھ سوچتی رہی۔ تب کہیں دور سے آتی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔
بہت دنوں کی بات ہے، فضا کو یاد بھی نہیں
یہ بات آج کی نہیں!!!!

معنی کی درد انگیز آواز اس کے دکھی دل کو چیرتی چلی گئی۔
اس نے غور کیا۔ آواز اوپر سے آرہی تھی اور اوپر آذر کا کمرہ تھا۔
شباب پر بہار تھی فضا بھی خوشگوار تھی
نجانے کیوں نکل پڑا، میں اپنے گھر سے چل پڑا میں چل پڑا
کسی نے مجھ کو روک کر، بڑی ادا سے ٹوک کر کہا تھا لوٹ آئیے، میری قسم نہ جائیے
اس کے قدم دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ دروازہ ذرا سا وا تھا اور مدہم سروں میں بچتے کیسٹ پلیئر کی آواز باہر آرہی تھی۔
وہ وہیں کھڑی گہرے گہرے سانس لیتی رہی اور در و بھرے بولوں کو سنتی رہی۔ اسے جیسے الہام ہو گیا تھا کہ اندر کون تھا
اور اک حسین شام کو، میں چل پڑا سلام کو
گلی کا رنگ دیکھ کر، نئی ترنگ دیکھ کر
مجھے بڑی خوشی ہوئی، خوشی ہوئی
پر اے گھر سے جائیے، میری قسم نہ آئیے
وہی حسین شام ہے، بہار جس کا نام ہے
چلا ہوں گھر کو چھوڑ کر، نجانے جاؤں گا کدھر
کوئی نہیں جو ٹوک کر، کوئی نہیں جو روک کر
کہے کہ لوٹ آئیے، مری قسم نہ جائیے، مری قسم نہ جائیے

اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گئی۔ اندر بالکل اندھیرا اچھایا ہوا تھا۔ صرف ایک کونے
میں بچتے کیسٹ پلیئر کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔
”کون؟“

”ایک مانوس، مہربان آواز برسوں بعد اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔
پھر لائٹ جل گئی۔

کتنے عرصے بعد وہ ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ اسے یاد نہ تھا اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے بیچ میں کئی صدیوں کے صحرا اور سمندر حائل
رہے تھے۔

دونوں آمنے سامنے کھڑے ایک ٹک ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔
”اجالا۔“

بالآخر وہ حواسوں میں لوٹ آیا تھا۔
”کیسی ہو؟“

اس نے جیسے اتنبائی کرب کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔ یہ نرم آواز، ہامعتوں پر سکون و طمانیت کی پھوڑا برساتا یہ لہجہ، ایک عجب کک
تھی جو رگ دیے میں سرایت کر گئی۔

آذر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ رائل بلیو بلیک ساڑھی میں اس کا مریں وجود کسی بت کی طرح ساکن تھا۔ منھیاں تختی سے بھیچے وہ ماضی کی ان راہوں میں دوڑ رہی تھی جن پر یادوں کے گلاب بکھرے ہوئے تھے۔ پھول تو یقیناً خوبصورت تھے لیکن کانٹوں کے ساتھ تھے اور وہ کانٹے اس کی سوچوں کے پاؤں لبوہان کیے دے رہے تھے۔ وہ ایک لذت آمیز تکلیف میں مبتلا اس کے سامنے حالت مراقبہ میں تھی۔ اس کے لب دھیرے دھیرے لرز رہے تھے۔ بکھرے ہوئے سیاہ بالوں اور ڈھلکے ہوئے پلو کے ساتھ اسے وہ کوئی جوگن لگنے لگی جس نے برسوں جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھانی ہو اور پھر اچانک اپنے من مندر کے دیوتا کو سامنے پا کر ایک بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو۔

”اجالا۔“ وہ اس کے قریب پہنچا۔ ”آنکھیں کھولو۔“

ضوفشاں نے ایک جھرجھری لی اور ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔

وہ دشمن جاں کس قدر قریب کھڑا تھا۔ اس کے نقوش کو دیوانگی کے عالم میں تکتا ہوا جیسے ابھی اسے دونوں شانوں سے تھام لیتا۔

ضوفشاں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ آنکھوں کو تختی سے بند کیا، پھر کھولا۔ کون تھا وہ؟

اس کے دماغ میں روشنی کے جھماکے سے ہونے لگے۔

”عالم۔ عالم شاہ!“ وہ بے آواز بڑبڑائی۔ ”ہاں۔ آنکھیں تو اسی کی ہیں۔ ان سے جھانکتے جذبے تو اسی کے ہیں۔ نہیں۔ نہیں! آذر، آذر

کیا یہ تم ہوا؟“

”ہاں جالا۔ میں ہوں آذر۔ تمہارا آذر!“ وہ جذبات کے اندھے سیلاب میں ہر بات فراموش کر رہا تھا۔

”میرے آذر!“ وہ خواب کے عالم میں بولی۔

”ہاں تمہارا۔ صرف تمہارا۔“ وہ بے بسی سے اس کے کاندھے تھام کر بولا۔

اس کا چہرہ، اس کا لب و لہجہ، اس کی آواز اسے فریب میں مبتلا کر سکتے تھے لیکن اس کے شانے محض ایک انسان کے ہاتھوں کا لمس پہچانتے تھے۔ وہ یکدم مکمل طور پر حواسوں میں آگئی۔

آذر۔“ اس نے جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنے کاندھوں سے ہٹا دیے۔

اس نے بے یقینی اور دکھ کے گہرے تاثر کے ساتھ اسے دیکھا اور پھر اداسی سے مسکرا دیا۔

”بہت پریشان لگتی ہو۔“

”تم کب لوٹے؟“ اس نے سوال نظر انداز کر کے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

”آج ہی لوٹا ہوں۔ ایگریمنٹ کی مدت ختم ہو گئی تھی۔ ابھی عاصم بھائی مجھے یہاں چھوڑ کر ہسپتال گئے ہیں۔ امی وغیرہ بھی کل تک

آجائیں گے لیکن تم کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھو۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹ کر پیچھے کیے اور پلوٹھیک کر کے بیڈ کے کونے پر ٹک گئی۔

”کس کے ساتھ آئی ہو تم؟“ وہ ذرا فاصلے پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”میں؟“ وہ چونک کر دوبارہ کھڑی ہو گئی۔

اسے یاد آیا کہ وہ کس طرح سے بھاگ کر یہاں آئی تھی اور وہ کون سی سوچ تھی جو اس کے تعاقب میں تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ ماضی میں نہیں

حال میں موجود تھی۔ حال، جو بے رحم اور سفاک تھا۔

”میں چلتی ہو۔“ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔

”اجالا۔ ٹھہرو!“ اسے اس کے عجیب رویے حیران کیے دے رہے تھے۔ یوں بھی وہ اس پر بیتنے والی صورت حال اور اس کی دماغی کیفیت

سے آگاہ نہ تھا۔

”کہاں جا رہی ہو اس طرح۔ کس کے ساتھ جاؤ گی اور تم یہاں کیوں آئی تھیں؟“

”آؤر۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”عالم کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ ہاسپٹل میں ہیں۔ میں نیند کی گولیاں کھا کر سوئی تھی۔ کسی خواب سے ڈر کر جا گی تو بنا سوچے سمجھے یہاں چلی آئی۔ مجھے اب جانے دو۔“

”تمہارے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“ وہ حیران سے بولا۔ ”چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

”نہیں۔ شکریہ۔“ اس نے آنسو پونچھے۔ ”تم یہیں ٹھہرو۔ آپا بھی کل آ جائیں گی۔ انہیں باقی لوگوں کو بتا دینا۔ میں چلتی ہوں۔“

”اجالا۔“ اس نے پکارا۔

مگر وہ ر کے بغیر چلی گئی۔ بیڑھیاں اتر کر صحن پار کیا اور دروازہ کھول کر گئی میں آگئی۔ ڈرائیور بونٹ سے ٹیک لگائے اٹھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر جلدی سے سیدھا ہوا اور پھرتی سے اس کے لیے دروازہ وا کیا۔

”ڈرائیور۔ ہاسپٹل چلو!“

اس نے اندر بیٹھ کر بے دم سی ہوتے ہوئے پشت سے ٹیک لگالی۔

بڑی دیر تک وہ اسی طرح نڈھال سی بیٹھی رہی۔ گاڑی لمبی چکنی سیاہ سڑک پر دوڑتی چلی جا رہی تھی اور اس کا دماغ ایک نقطے پر ساکن تھا۔

”آؤر۔ آؤر۔ آؤر۔“

ایک نام تھا جو بدن کی کھوکھلی عمارت میں گونجتا چلا جا رہا تھا۔ جس طرح سے کوئی آواز کسی مقبرے کے گنبد درگنبد سلسلے میں دیواروں سے تادیر سر پختی رہے۔

”کیوں چلے آئے ہو تم؟ کیوں؟“

دونوں ہاتھوں سے چہرہ اڑھانپ کر اس نے ایک سسکی لی۔

”اس ذہن، اس جسم کے اندر ہر پایہ شور کتنی مشکلوں سے تھما تھا۔ یہ زندگی کس عذاب سے گزرنے کے بعد پھر ایک محور پر رواں ہوئی تھی۔ کتنے طوفانوں کے بعد یہ سمندر پر سکون ہوا تھا۔ تم نے پتھر پھینک دیا۔ کیوں چلے آئے ہو آؤر۔ کیوں؟“

”جی بی بی جی۔“ ڈرائیور چونک کر مڑا تھا۔ ”کچھ کہا آپ نے؟“

”نہیں۔“ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ”تم گاڑی چلاؤ۔“

اسپتال کے احاطے میں گاڑی رکی۔ وہ اتر کر تیزی سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

”بی بی صلابہ۔“ مکرم علی اسے کارپڈور میں مل گیا۔

”کہاں تھیں آپ۔ میں دوبارہ گھر فون کر چکا ہوں۔“

”تمہارے صاف صاحب کو ہوش آیا۔“ اس نے بہتے آنسو صاف کیے۔

”جی ہاں۔ انہیں پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے ان سے مل سکتی ہیں۔ کل صبح دس بجے ان کا آپریشن ہے۔“

مکرم علی دروازے کے باہر ہی رک گیا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ اس شخص کو اس حالت خراب میں دیکھنا کیا اذیت ناک عمل تھا۔ اس کو لگا اس کا دل اس کے منہ کے راستے باہر نکلنا چاہتا ہے۔ منہ پر سختی سے ہاتھ جما کر وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

”آپ ان کی مسز ہیں ناں۔“ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے اس پر نگاہ جمائی۔ ”یہ فی الوقت ہوش میں ہیں۔ آپ مل سکتی ہیں۔“

گھسٹے ہوئے قدموں سے وہ بیڈ تک پہنچی۔ اس کا چہرہ پیوں سے جکڑا ہوا تھا۔

”عا۔ عا۔ عا۔“ صوفشاں نے اسے پکارنے کی کوشش کی پھر اس کے اندر دلی تمام چیخیں، تمام آہیں آزاد ہو گئیں۔

بیڈ کے سر بانے کو تھام کر وہ زور زور سے رونے لگی۔

”بی بی صاحبہ۔ بی بی صاحبہ ہمت پکڑیں جی۔“ دروازہ کھول کر تیزی سے مکرم علی اندر داخل ہوا۔

”دیکھئے پلیزی یوں شرم مت کریں۔“ ڈاکٹر الگ پریشان ہو گیا تھا۔

”مکرم۔ مکرم مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں انہیں۔ اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ میں انہیں اس طرح نہیں دیکھنا چاہتی۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ میں مر جاؤں گی مکرم علی۔ خدا کے واسطے مجھے گھر لے چلو۔“

وہ ہوش سے بیگانہ ہو رہی تھی۔

مکرم علی اسے باہر لے آیا



اسپتال کے۔ آراستہ و پیراستہ وینٹگ روم میں وہ سب جمع تھے۔ اماں کے کاندھے سے سر نکالے وہ نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمائے بیٹھی

تھی۔

منہ جبیں سامنے والے صوفے پر بیٹھی حارث کو سنبھال رہی تھی۔ پھوپھی اماں کی انگلیاں تسبیح کے دانوں پر رواں تھی۔

دس بجے اسے آپریشن تھیر میں لے جایا گیا اور اس وقت دیوار میں ٹنگی نفیس وال کلاک تین بج رہی تھی۔

”جبیں بیٹی۔ اس کو کچھ کھلاؤ۔ اس طرح کب تک بھوکی بیٹھی رہے گی۔“ پھوپھی اماں نے اس کو مجسم بیٹھا دیکھ کر پریشانی سے کہا۔

”میں کچھ نہیں کھاؤں گی پھوپھی اماں۔“ سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے اس نے ہولے سے کہا۔

”اس وقت میں کچھ کھا ہی نہیں سکتی۔“

”آخر یہ آپریشن کب ختم ہوگا۔“ اماں بے کل ہو کر گویا ہوئیں۔ ”کوئی خیر خبر ہی سنا جائیں۔“

”ہمت رکھو۔“ ابانے ان کے کاندھے پر تھپکی دی۔ ”خدا سب ٹھیک کرے گا۔“

ایک طویل وقفہ تھا جس کے دوران اس نے اذیتوں اور بے قرار یوں کی گھڑیاں ایک ایک کر کے پوری کی تھیں۔ بالآخر ایک وارڈ

ہوائے اندر آیا۔

”مسز عالم۔ آپ ڈاکٹر یونس سے ان کے کمرے میں مل سکتی ہیں۔“

”ارے بیٹا۔ آپریشن ہو گیا۔“ اماں گھبرا کر کھڑی ہوئی تھیں۔

”جی ہاں۔ اب وہ خطرے سے باہر ہیں۔“

”اے خدا! تیرا شکر ہے۔“ سب کے لبوں سے یہی الفاظ نکلے تھے۔

”چلو بیٹا۔“ ابانے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ”ڈاکٹر سے مل آئیں۔“

گہرے سانسوں پر قابو پاتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مسز عالم۔ آپ کے شوہر کا پہلا آپریشن کامیاب ہوا ہے۔“ سرجن یونس نے مسکرا کر اسے نوید سنائی۔ ”آپ کو مبارک ہو۔ انہیں نئی

زندگی ملی ہے۔“

”تھینک یو ڈاکٹر۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔

”دوسرا آپریشن کچھ عرصے بعد ہوگا۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کیا جاسکے گا کہ مسز عالم مکمل طور پر صحت یاب ہوتے ہیں یا۔ میرا مطلب ہے کچھ

پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔“

”ضوفشاں نے بے جان نظروں سے ڈاکٹر کی سمت دیکھا۔

”دیکھئے یہ بات آپ کو ڈسٹرب ضرور کر دے گی لیکن اس کا جاننا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔“ ڈاکٹر نے پہلو بدلا۔ ”آپ کے شوہر اس آپریشن کی ناکامی کی صورت میں ہمیشہ کے لیے اپنا بیچ ہو جائیں گے۔ ان کا نچلا دھڑ مفلوج ہو جائے گا۔ وہ کبھی چل نہیں پائیں گے۔“

اس کا تیزی سے سیاہ پڑتا چہرہ دیکھ کر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ اڑھانپ کر ضوفشاں نے میز سے سر کا دیا تھا۔ ڈاکٹر کی آواز اور سید عالم شاہ کا چہرہ اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

”بیٹا۔ حوصلہ رکھو۔“ ابا نے افسردگی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”کہاں سے لاؤں اتنا حوصلہ ابا جی۔“ سر اٹھا کر اس نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کسی دکان پر ملتا ہو تو اتنا خرید لوں کہ زندگی بھر کے مصائب اور دکھوں کو آواز دے کر ایک ساتھ بلا لوں۔ ایک ساتھ سامنا کر ڈالوں سب کا۔ لیکن حوصلہ کہیں مٹا بھی تو نہیں نا ابا جی۔“

”بیٹا! خدا کسی انسان کو کبھی اس کے حوصلہ سے زیادہ نہیں آزماتا۔ خدا پر بھروسہ رکھو چندا۔“

”کل تک وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ بات کر سکیں۔“ ڈاکٹر نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگ ان سے مل سکیں گے۔ جب تک ان کے زخم وغیرہ پوری طرح ٹھیک نہیں ہو جاتے وہ یہاں ایڈمٹ رہیں گے پھر آپ انہیں گھر لے جاسکتے ہیں۔“

”اگلا آپریشن کب ہوگا ڈاکٹر۔ کب تک میں اس کرب کی سولی پر لٹکی رہوں گی؟ یقین کریں ڈاکٹر وہ ایسا شخص ہے کہ اس بے بسی کی حالت میں اسے دیکھنا اور اسے تسلی دینا مجھے کرب کی آخری سرحد پر کھڑا رکھے گا۔“

”مجھے احساس ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”بہر حال تقریباً دو ماہ کا عرصہ درکار ہوگا۔ پوری طرح سے اس آپریشن کے اثرات زائل ہو جانے کے بعد۔“

اس نے گہرا سانس لیا اور ابا کے ساتھ اٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔



”روشنی!“ اس کے چہرے پر نگاہ جمائے وہ بڑی بے بسی سے اسے تک رہا تھا۔

”جی کہیے۔“

پٹیوں سے جکڑے اس کے ماتھے کو اس نے دھیرے سے چھوا۔

”کیا۔ کیا۔ کیا میں ٹھیک ہوں پاؤں گا روشنی!“

”اس کے لہجے میں ایک عجیب بے یقینی، ایک خوف کا تاثر تھا۔

”انشاء اللہ ضرور۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔

”پریشان کیوں ہوتے ہیں۔“

”دیکھو، دیکھو میں اس طرح سے رہ نہیں سکتا۔ روشنی! یہ بستر روئی سے نہیں آگ سے بنتا ہے۔ یہ جو اسپتال کا بستر ہوتا ہے ناں یہ نظر نہ آنے والے شعلوں سے لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ میرے لیے قبر اس سے زیادہ مناسب جگہ ہے۔

”خدا نہ کرے۔“ وہ پریشان ہو گئی۔ ”اس طرح مت کہیں..... کبھی کبھی ایوں سے نکلی باتیں بھی۔“

بات ادھوری چھوڑ کر وہ ایک تکلیف دہ احساس میں گھر گئی تھی۔

”ہاں۔“ وہ کراہا۔ ”شاید کبھی میرے لیے کسی نے یہ سب کہا ہو۔ ہو سکتا ہے ناں روشنی!“

”عالم پلیز!“ وہ رو دینے کو ہو گئی۔ ”مت کریں ایسی باتیں۔“

”مجھے یہاں سے لے چلو!“ اس نے مٹھیاں بھینچیں۔ ”میں یہاں نہیں رہ سکتا۔“

”بس کچھ ہی دنوں میں ہم گھر چلیں گے۔“ ضوفشاں نے اسے تسلی دی۔

”کیسے چلیں گے؟ میں چل کہاں سکتا ہوں۔ ڈاکٹر زکو بلاؤ روشنی میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں اب کبھی چل بھی سکوں گا یا نہیں۔ میں اصل

صورت حال جاننا چاہتا ہوں۔ کوئی مجھے کچھ نہیں بتاتا۔ ع مجھے بتاؤ روشنی مجھے بتاؤ! عالم شاہ اتنا کمزور نہیں ہے کہ وہ سب کچھ سن نہیں پائے گا۔ مجھے کہو

کہ میں اپنا جج ہو گیا ہوں۔ بتاؤ کہ میں بقیہ عمر۔ یونہی شعلوں کے بستر پر گزاروں گا۔ کہہ ڈالو کہ وہ عالم شاہ جو ہزاروں ہادلوں کے پیروں تلے روندنا

غور سے سر اٹھائے چلتا تھا اب زمین پر قدم جمانے کے قابل بھی نہیں رہا۔ کہو کچھ تو کہو روشنی!“

اس نے بے بسی سے گردن تکیے پر دائیں بائیں گھمائی۔

”عالم! عالم! خدا کے لیے ایسی باتیں مت کریں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ اٹھاما۔ ”یقین کریں آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں

گے۔ پہلے کی طرح چلیں گے۔ آپ کا دوسرا آپریشن ضرور کامیاب ہوگا۔“

”اور اگر نہ ہوا تو؟“ وہ ایک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس سے نظریں چرانا بھی ممکن نہ رہا۔

”تو۔ تو۔ بھلا آپ منفی پہلو پر کیوں سوچ رہے ہیں!“

”تمہاری اماں بتا رہی تھیں کہ تمہارا کزن واپس آ گیا ہے۔“ اچانک وہ بولا۔

اب کی بار اس نے حقیقتاً نظریں چرائی تھیں۔

”ہاں۔ اس کے ایگریمنٹ کی مدت ختم ہو گئی ہے۔“ اس نے لا پرواہی سے کہنا چاہتا لیکن لہجے میں ہزاروں چور بولنے لگے تھے۔

”اچھا۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”اب کس کس ایگریمنٹ کی کتنی مدت باقی ہے؟“

”آپ آرام کریں عالم!“ وہ رسانییت سے بولی۔ ”زیادہ سوچا مت کریں۔“

”میرے پاس سوائے سوچنے کے اور رہا کیا ہے روشنی۔ سوچوں بھی نہیں تو کیا کروں؟“

”تو پھر اچھی اچھی باتیں سوچا کریں۔“

”اچھائی اور برائی کی پہچان کبھی میرے لیے واضح ہو نہیں پائی روشنی۔“ وہ دل شکستگی سے بولا تھا۔ ”فرق کیسے جان پاؤں کہ کون سی سوچ

اچھی ہے اور کون سی بری۔“

”جن باتوں کو سوچنے سے خوشی حاصل ہو، اطمینان اور سکون محسوس کریں وہ باتیں سوچا کریں۔“

”اچھا۔“ اس نے نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ ”یوں کہو کہ تمہیں سوچا کروں۔ ہاں۔ اچھا طریقہ ہے۔“

ضوفشاں مسکرا دی۔ اس کے لبوں پر بھی غیر واضح مبہمی مسکراہٹ اتری تھی۔



چند دن بعد اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ جس وقت کمر علی اسے وہیل چیئر سے بستر پر منتقل کر رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے کمرے سے نکل

گئی تھی۔

لمبی چوڑی جسامت، وہ زمین پر مضبوطی سے قدم رکھتا، تندرست و توانا وجود کتنا بے بس اور کتنا مجبور تھا۔

ضوفشاں کو یہ سب کچھ دیکھنا اور محسوس کرنا مشکل لگتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی تیز دھار چاقو سے ایک ایک کر کے اس کے دل کی رگیں

کاٹ رہا ہوا درخون اہل اہل کر حلق تک آتا ہو۔ اسے ابکیاں روکنا محال ہو جاتیں۔۔

پھر بھی اسے یہ سب کچھ دیکھنا تھا، محسوس کرنا تھا اور صبر کرنا تھا۔
”روشنی۔“

وہ اسے سہارا دے کر اونچا کر رہی تھی جب اس نے پکارا تھا۔
”جی کہیے۔“

اس نے نیکی اس کے پیچھے لگائے۔

”جانتی ہو۔ پچھلے کئی دنوں سے میرے اندر جو ابال اٹھ رہے تھے وہ اب بیٹھنے لگے ہیں۔ دنیا کو تہس نہس کر ڈالنے کی خواہش دم توڑ گئی ہے ایک سکون سا پھیل گیا ہے یا خاموشی کہہ لو۔ ہاں ایک خاموشی، ایک سناٹا اتر آیا ہے میرے اندر جو مجھ سے کہتا ہے کہ اب مجھے ہمیشہ یونہی رہنا ہے۔ یونہی جینا ہے اب ساری زندگی مکرم علی مجھے وہیل چیئر سے بستر اور بستر سے وہیل چیئر پر منتقل کرتا رہے گا اور تم مجھے سہارا دیے کر یونہی بٹھاتی رہو گی۔ تم! روشنی۔ ساری عمر کرو گی یہ سب کچھ؟“

اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں۔ آپ کے لیے مکرم علی سے بھی کم قابل اعتبار ہوں۔“
وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔

”ناراض مت ہو۔ مجھ سے ناراض مت ہوا کرو روشنی۔ جو کچھ میں کہہ جایا کروں اس کی گہرائیوں میں مت اترا کرو۔ کم از کم اب نہیں۔ اب تو میں صرف بولتا ہوں۔ سوچے سمجھے بغیر۔ جانے بغیر کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کی گہرائی میں کون سے معنی پوشیدہ ہیں۔“
”چلیں اب بس کریں۔“

اس نے ٹرائی نزدیک کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کھانے کے لیے وقت بھی اتنی باتیں کرتے ہیں کہ ایک دو لقمے سے زیادہ نہیں کھا پاتے۔“
”جتنی باتیں آپ کرتے ہیں اس کے لیے اچھی خاصی توانائی درکار ہوتی ہے۔ دو ماہ بعد جب ٹھیک ہو کر آپ پھر کم بولا کریں گے تو مجھے تو وحشت ہوا کرے گی۔ اتنی باتوں کی عادت مت ڈالیں مجھے!“
اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”تسلی دینے کا اچھا انداز ہے۔“

”آج میں خود کھانا کھلاؤں گی آپ کو۔“ اس نے پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے کہا۔

”ورنہ چند لقمے بے دلی سے کھا کر چھوڑ دیں گے!“

”چلو ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”اب جب تک تمہارے ہاتھ نہیں تھکیں گے۔ میں کھاتا ہی رہوں گا۔“

ضوفشاں نے نوالہ بنا کر اس کی سمت بڑھایا۔

”بی بی جی!“ دروازہ بجا کر خیراں نے باہر سے پکارا تھا۔ ”کوئی آذر صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں جی!“

”ضوفشاں کا ہاتھ یکدم نیچے گر گیا۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور پھر اس نے نگاہیں چرائیں۔ عالم شاہ نے آنکھیں موند کر نیکی سے سر کا

لیا۔

”جاؤ روشنی۔ مل لو!“ مدھم آواز میں وہ بولا تھا۔

”آپ کھانے کھا لیں تو۔“

”تم جاؤ۔ کھانا میں کھا لوں گا۔“

جب وہ قطعی لہجے میں کوئی بات کہہ دیتا پھر اس کے بعد اس کے لیے کچھ بھی کہنا ممکن نہ ہوتا تھا۔

وہ اٹھی، ساڑی کا پلوٹھیک کیا اور کمرے سے نکل آئی۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر صوفشاں اندر داخل ہوئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”بیٹھو آؤر!“

اسے بیٹھنے کا کہتے ہوئے وہ خود بھی اس کے مقابل رکھی ہاتھی دانت کے کام سے مزین کرسی پر ٹپک گئی۔

”اب کیسے ہیں عالم صاحب!“ وہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”شکر ہے خدا کا۔ پہلے سے بہتر ہیں۔“

آؤرنے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ سیاہ ساڑی میں ملبوس، بالوں کا سادہ سا جوڑا بنائے وہ بنا کسی تاثر کے بیٹھی اپنے ناخنوں کو گھور رہی تھی۔

اس کے اس انداز سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اپنے اندر کی کیفیات کو مقابل سے چھپانے کے لیے وہ اسی طرح سر جھکا کر اپنے ناخنوں کو ہکا

کرتی تھی۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ ان کے بیچ آیا تھا۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی تھی اور وہ اس کے چہرے کے پیچھے پیچھے خیالات کو کھوجنے کی

کوشش کرتا رہا تھا۔

”تمہارا گھر بہت خوبصورت ہے۔“ بڑی دیر بعد وہ بولا۔

”ہاں، عالم نے یہ گھر اپنے لیے بنوایا تھا بڑی محبتوں سے، پھر میرے نام کر دیا۔“

”بڑی محبتوں سے؟“ اس نے عجب کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔

صوفشاں نے خاموش نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ہاں!“ پھر اس نے صاف لہجے میں کہا۔

”تمہیں کس بات کی زیادہ خوشی ہوئی تھی۔“ اس کا لہجہ بدستور تھا۔ ”گھر نام ہو جانے یا محبتیں؟“

”میں اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی!“

”بہت سی باتوں کے جواب دینا تم پر فرض ہیں اجالا۔“ وہ مسکرایا۔ ”مگر نہ وہ میں نے پہلے پوچھی تھیں نہ اب پوچھوں گا۔“

”اب کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ اس نے پہلو بدل کر بات بھی بدلی۔

”کوئی بزنس کروں گا۔ کوئی ایسا بزنس جس میں پیسہ زیادہ ہو۔“ نجانے کیوں تمہارا یہ عالیشان محل دیکھ کر بہت با اثر، بہت امیر بننے کی

خواہش دل میں جاگی ہے۔“

پھر وہ ہنسا اور دوبارہ کہنے لگا۔

”ہاں مگر اتنا ضرور کہ ساری عمر لگا کر بھی شاید ایسا محل بنا کر پھر بھی کسی کے نام نہ کر سکوں گا۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تمہارا فیصلہ کس قدر

درست تھا۔ اجالائیں تو دنیا میں بے شمار ہوں گی۔ ہاں ممتاز محل کبھی کبھی پیدا ہوتی ہے۔“ اس نے بے چینی سے لب کاٹے۔

”معاف کرنا شاید تلخ ہو رہا ہوں لیکن کبھی کبھی دل میں ایسے طوفان اٹھتے ہیں کہ جو کچھ تہہ میں ہوتا ہے وہ سطح پر چلا آتا ہے۔“

صوفشاں نے اسے دیکھا پھر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ آنکھیں یکا یک پانیوں سے لبریز ہو گئی تھیں اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ آؤرنے کے آنسو

دیکھے۔

”دولت تو انسان کو بڑی خوشیاں دیتی ہے پھر یہ کیا بھید ہے کہ تم ہر ملاقات پر آنکھوں کے آنسو مجھ سے چھپاتی ہو۔“

”ہاں۔ دولت انسان کو خوشیاں دیتی ہے اور میں خوش ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسا۔ ”خوشی کا اعلان اس محل میں شاید محض الفاظ سے ہی ہوتا ہے۔ اندرونی جذبات اور بیرونی کیفیات کو اس ضمن میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کرتے!“

”کیا ہوا ہے میری کیفیات کو۔“ وہ بری طرح سے چڑ گئی۔

”جب چھوڑ کر گیا تھا تو ایک ہنستا ہوا، چمکتا ہوا گیت تھیں، مترنم اور دلکش اور اب۔ اب ایک پرسوز غزل لگتی ہو۔ کرب کی انتہائی کیفیت میں لکھی گئی کوئی غزل اداس اور بے کل۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”خدا کے لیے آذر۔ میری پریشانیوں میں مزید اضافہ مت کرو۔“

”میں نے ہمیشہ تمہاری خوشیوں کی آرزو کی ہے۔“ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ ”چاہتا تھا کہ تم سے نہ ملوں تاکہ مزید خوش رہوں لیکن ایک عجیب جذبے سے مغلوب ہو کر چلا آیا ہوں۔ شاید یہ بات میری انا پر ایک کاری ضرب تھی۔ برداشت نہیں کر پایا۔“

”وہ کون سی بات؟“ اس نے حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھا۔

”اپنی ایک چیز تم میرے کمرے میں بھول گئی تھیں۔“ اس نے میز پر رکھے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہی لونے آیا ہوں۔ کہنا یہ تھا کہ اب ان جھوٹی تسلیوں کی مجھے ضرورت نہیں۔ چلتا ہوں۔“

دونوں ہاتھ پینٹ کی جیسوں میں ڈال کر وہ دروازے کی سمت بڑھا پھر رک کر اس کی سمت دیکھا۔

”بڑی خواہش تھی اس شخص کو دیکھنے کی جس کے آگے چاند اور سورج بھی ماند پڑ جاتے ہیں جو بات کرے تو زمانے کی گردشیں۔ بھٹم جاتی ہیں اور خاموش ہو تو اس کی آنکھیں بات کرنے لگتی ہیں۔ جو چلے تو ہر شے ہم کر اسے دیکھتی ہے۔ بڑی خواہش تھی اس شا جہان کو دیکھنے کی لیکن فی الوقت نہیں، پھر کبھی سہی۔ خدا حافظ۔“ وہ مڑ کر کمرے سے نکل گیا۔

بڑی دیر تک وہ کھڑی اس کے الفاظ پر غور کرتی رہی پھر اس کی توجہ میز پر رکھے پیکٹ نے اپنی جانب مبذول کرائی۔

اس نے جھک کر پیکٹ اٹھایا اور کھول کر دیکھا۔ اندر ایک مہ جھایا، تو نا، بکھرا ہوا گجر رکھا تھا۔

”اب مجھے ان جھوٹی تسلیوں کی ضرورت نہیں۔“ اس کے کانوں میں اس کے الفاظ گونجے۔

ایک شدید درد کی لہر اس کے کاندھوں سے اٹھ کر پورے جسم میں پھیل گئی۔ دونوں ہاتھوں کے درمیان اس نے گجرے کو بھینچ کر چور چور کر دیا اور ان بکھری خشک پتیوں پر چلتی باہر نکل گئی۔



میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے

وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں لکھا گیا ہے بہت لطف وصل و دور و فراق مگر یہ

کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں

یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدرد وصال اس

عشق خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے

گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے

”واہ۔ بہت خوب!“ وہ مسکرا اٹھا تھا۔ ”کیا خوبصورت نظم ہے اور تمہاری آواز اور تمہارے لب و لہجے نے مزید خوبصورت بنا دیا ہے۔“

”اور سنیں گے؟“ اس نے ”نسخہ ہائے وفا“ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

”فی الحال اس خوبصورت تاثر کو قائم رہنے دو جو اس نظم کو سن کر قائم ہوا ہے۔“

”بہت پسند ہے یہ کتاب آپ کو؟“ اس نے اس کی جانب رخ موڑتے ہوئے پوچھا۔

اکثر وہ اسے یہی کتاب پڑھتے ہوئے پاتی تھی اور آج اس نے ضد کر کے ضوفشاں کو پاس بٹھا کر کوئی خوبصورت سی نظم سنانے کی فرمائش کرتے ہوئے یہ کتاب اسے تھمائی تھی۔

”ہاں بہت۔“ عالم شاہ نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔ ”اب تم کہو گی کہ پسند ہے تو خود کیوں نہیں پڑھ لیتے۔ ہیں

ناں؟“

ضوفشاں نے اسے غور سے دیکھا۔ بیماری کے اس عرصے نے اسے قطعاً بدل ڈالا تھا۔ اس کے لہجے میں ہمیشہ رچی بسی سختی اور تحکم نجانے کہاں چلا گیا تھا اور ایک عجیب حلاوت اور شیرینی اتر آئی تھی۔ حتیٰ کہ اس کے الفاظ بھی اس کے اپنے نہیں لگتے تھے۔

”نہیں تو۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں بھلا کیوں کہوں گی۔“

”ہو سکتا ہے سوچتی ہو اور کہتی نہ ہو۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”پر میں بھی کیا کروں روشنی یکفخت میری زندگی سے چوبیس سال اس طرح

خارج ہو گئے کہ مجھے خود حیرت ہوتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ متعجب ہوئی۔

”چوبیس برس قبل میں پانچ سال کا تھا۔“ وہ مسکرایا۔ ”بڑا نازک سا، بڑا احساس سا بچہ تھا۔ ہر بات کو، ہر واقعے کو بڑی گہرائی میں جا کر

محسوس کیا کرتا تھا۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسی۔ ”لیکن اچانک آپ پانچ برس کے بچے بن کیسے گئے؟“

”ہاں روشنی۔“ وہ یکدم بے تحاشا اس نظر آنے لگا۔ ”میں وہی بچہ بن گیا ہوں۔ نازک اور حساس۔ جو گرم تپتی دوپہروں میں یا سرد خون

منجمد کردینے والی شاموں میں ایک بڑی طویل و عریض حویلی کے دالانوں میں تنہا پھرا کرتا تھا۔ اونچے لمبے گول ستونوں سے ٹیک لگائے نجانے کس کا

منتظر رہتا تھا۔ شاید اس ماں کا جو اپنے پیچھے ہر دروازہ ہمیشہ کے لیے مقفل کر گئی تھی یا شاید اس باپ کا جسے اپنی بے تحاشا مصروفیات میں اسے اکیلے تنہا

بچے کا خیال بامشکل آیا کرتا تھا۔ میں انتظار کرتا رہتا تھا، پھر میری کوئی ملازمہ مجھے حویلی کے کسی گوشے سے سوتا ہوا اٹھا کر لے جاتی اور مجھے عالیشان

کمرے کے آرام وہ بستر پر لٹا دیتی تھی۔ میں دوبارہ وہی بچہ بن گیا ہوں۔ روشنی، فرق اتنا ہے کہ آج میں کسی کا منتظر نہیں۔ تم میرے قریب ہو، میرے

پاس ہو اور میرا دل چاہتا ہے کہ تم ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہا کرو۔ مجھ سے باتیں کرتی رہو۔ میں جو کہوں اسے سنتی رہو۔ میں جانتا ہوں کہ کبھی

کبھی تم بیزار ہو جاتی ہو۔ میری فرمائشیں پوری کر کر کے تھک جاتی ہو۔ الجھنے لگتی ہو لیکن میں کیا کروں روشنی۔ یہ دل بھی عجیب شے ہے۔“

وہ نیچے پر سر ٹیک کر آنکھیں موندتے ہوئے ہنس دیا۔

”آپ سے کس نے کہا کہ میں بیزار ہو جاتی ہوں۔ تھک جاتی ہوں یا الجھنے لگتی ہوں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ آنکھیں بند کیے کیے بولا۔

”تم انسان ہو اور ہر انسان یکسانیت سے گھبرا جاتا ہے۔ اپنا ج میں ہوا ہوں روشنی۔ تم صحت مند ہو۔ یکسانیت میری مجبوری تو ہے لیکن

تمہاری نہیں۔ تم ہر وہ کام کر سکتی ہو جو کرنے کو تمہارا دل چاہیے۔ ایسے میں جب میری وجہ سے تم بھی یہ کام روز روز دہراتی ہو گی تو یقیناً بیزار ہوتی ہو

گی۔ اس میں بھلا کسی کے کہنے یا نہ کہنے کا کیا سوال۔“

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے مگر فون کی بیل نے اس کے خیالات کا رخ اپنی جانب موڑ لیا۔
 ”میرا کوئی دوست مجھ سے ملنا چاہے تو منع کر دینا۔ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔“
 اس نے اثبات میں سر ہلادیا اور ہاتھ بڑھا کر ریسپور اٹھا لیا۔
 ”ہیلو۔“

”کون ضوئی۔“ دوسری جانب سے مد جہیں تھی۔ ”کیسی ہو؟“
 ”السلام وعلیکم آپا۔ میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟“
 ”وعلیکم السلام۔ شکر ہے خدا کا۔ اور عالم کی طبیعت کیسی ہے اب؟“
 ”جی پہلے سے بہتر ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
 ”ضوئی۔ دراصل میں نے اس لیے فون کیا تھا کہ کل ہم لوگ حارث کا عقیقہ کر رہے ہیں۔ تم تھوڑی دیر کو آ جاؤ گی۔“
 ”آپا۔“ وہ متذبذب ہو گئی۔ ”عالم اکیلے رہ جائیں گے۔“
 ”ہاں، میں جانتی ہوں۔“ ہولے سے بولی۔

”میں فون کرتے ہوئے بھی ہچکچا رہی تھی لیکن اماں نے کہا کہ اچھا ہے تھوڑی دیر کے لیے تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔ کب سے گھر میں ہی مقید ہو کر رہ گئی ہو۔ تم پوچھو نا عالم سے۔“
 ”جی۔“ وہ ہچکچا رہی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اس کے کہیں آنے جانے پر اس نے کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی لیکن اب معاملہ دوسرا تھا۔ سید عالم شاہ کو علم تھا کہ اب وہاں آ ذر بھی موجود ہے۔ ایسے میں وہ اسے جانے کی اجازت دیتا یا نہیں وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔
 ”اچھا آپا! میں پوچھ لوں گی۔“ بالآخر وہ بولی۔ ”پھر دیکھوں گی۔“
 ”جی بہتر۔“

اس نے ریسپور رکھ کر مڑ کر دیکھا۔ وہ ہاتھ آنکھوں پر رکھے لیٹا تھا۔
 اس نے ہاتھوں میں رکھی کتاب سائیز میز پر رکھی اور اٹھ کر پردے برابر کرنے لگی۔
 ”کہیں جانا ہے روشنی؟“ پیچھے سے اس نے پکارا تھا۔
 ”اس کے ہاتھوں کی حرکت تھم گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہ اسی طرح سے لیٹا ہوا تھا۔
 ”کل حارث کا عقیقہ ہے۔ آپا کہہ رہی تھیں تھوڑی دیر کے لیے آ جانا۔“
 ”جانا چاہتی ہو؟“

”میرا کچھ ایسا خاص ارادہ نہیں ہے لیکن وہ اصرار کر رہی تھیں۔“
 ”ہوں۔ چلی جانا۔“ وہ جیسے بڑبڑایا۔

ضوئی فٹن کا جی چاہا اس کی آنکھوں پر دھرا اس کا ہاتھ اٹھائے اور ان آنکھوں میں جھانک کر دیکھے وہاں کن جذبات کا ڈیرا ہے۔ کون سے جذبات کی پرچھائیاں ہیں۔ کن احساسات کے عکس ہیں۔
 بڑی دیر تک وہ اس کے کچھ اور کہنے کی منتظر رہی لیکن وہ اپنے خیالات کی عمیق گہرائیوں میں جا پہنچا تھا جہاں اسے واپس لانا کبھی بھی اس کے لیے آسان نہ رہا تھا۔



بلکہ گلابی رنگ کی خوبصورت ساڑی نے اس کے مرمریں جسم سے لپٹ کر اس کے وجود کو بہت باوقار اور دلکش تاثر بخش دیا تھا۔ بلاؤز کی آستینوں پر سفید موتیوں کا کام تھا۔ سچے موتیوں کا نازک ہار اس کی گردن کی خوبصورتیوں کو واضح کر رہا تھا۔ بالوں میں گجر اسجاتے ہوئے اس کی نگاہ آئینے میں نظر آتے عالم شاہ کی نگاہ سے ٹکرائی۔ وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ عجب سے احساسات کا شکار ہو گئی۔ آج اس نے یہ سارا اہتمام آذر کے لیے کیا تھا۔ محض اس کو دکھانے کے لیے۔ یہ جتانے کے لیے کہ وہ خوش تھی اور اپنے فیصلے سے مطمئن بھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ کسی بیوہ کا سا سا روپ لیے اس کے سامنے جائے اور اس کے ان اندیشوں کو تقویت بخشنے کہ وہ ناخوش ہے۔ سوز سے بھری غزل ہے۔ اپنے فیصلوں سے غیر مطمئن ہے مگر اب وہ سوچ رہی تھی کہ عالم شاہ کے ذہن میں اس وقت کون سی سوچ تھی۔ وہ اس کے چہرے پر کون سی تحریر تلاش کر رہا تھا۔ اس کی اس تیاری سے اس نے کیا نتیجہ اخذ کیا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ سادہ سے لہجے کی تہہ میں کئی اضطراب پوشیدہ تھے۔

”بڑے دنوں بعد تمہیں اس طرح بنا سنورا دیکھا ہے۔“ اس کا اپنا لہجہ بالکل سادہ تھا۔ ”اچھی لگ رہی ہو۔“

”مجھے کیا خبر تھی کہ میں صرف بن سنور کر ہی اچھی لگتی ہوں آپ کو۔“ وہ ہنسی۔ ”پتا ہوتا تو ہر وقت ایسے ہی رہتی۔ اچھا ہوا آپ نے بتا دیا!“ پھر ایسا کرو کہ جاؤ ہی مت۔“ وہ بھی مسکرا دیا۔

”کیا پتا کہ صرف فی الوقت ہی اچھی لگ رہی ہو۔ بعد میں بن سنور کر بھی اچھی نہ لگو۔“ وہ ہنس دی۔

”اچھا۔ آپ کہتے ہیں تو نہیں جاتی۔“

”نہیں۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں تو محض مذاق کر رہا ہوں۔ تم جاؤ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔“

وہ کھائی پر رسٹ واپس باندھنے لگی۔

”کب تک لوٹو گی؟“

ضوفشاں نے محسوس کیا وہ بے کل تھا۔ اندر سے کہیں بہت بے چین تھا۔

”جلدی لوٹوں گی انشاء اللہ۔ آپ کے کھانے کا کہہ جاؤں گی خیراں سے۔“

”نہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”تم آؤ گی تو پھر کھانا کھاؤں گا میں۔“

ضوفشاں نے ایک نظر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ اب آپ تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جائیں۔ میں یہ نیکے نکال دوں؟“

”ہاں۔“ اس نے گہرا سانس لیا۔ ”تھک گیا ہوں بیٹھے بیٹھے۔“

”ضوفشاں اس کو سہارا دے کر لیٹا نے لگی۔

”سنوروشنی۔“ اس نے اچانک اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ”میں ٹھیک ہو جاؤں گا ناں۔“

”انشاء اللہ ضرور۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔

”اور۔ اور نہ ہوا تو؟ ہمیشہ کے لیے اس طرح رہ جاؤں تو؟ بولو؟“

”بری۔ بہت بری بات ہے۔“

”میری بات کا جواب دو۔“ اس نے بے صبری سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں ہمیشہ کے لیے ایسا رہ گیا تو؟“

”تو بھی ساری عمر میں آپ کے ساتھ گزاروں گی اسی طرح۔“ اس نے عالم شاہ کی سیاہ بھنورا، خوبصورت آنکھوں میں جھانک کر مضبوط

لہجے میں کہا۔

”زبردستی۔“

”نہیں۔ اپنی رضا سے۔“

”رضا۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”رضا اور خوشی میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ کیا ہوتا ہے؟“

وہ محض خود سے بولا تھا۔ اس سے کچھ پوچھنا تھا جس کا وہ جواب دیتی۔ اس کی ایسی خودکلامیوں سے وہ ہمیشہ الجھ کر رہ جاتی تھی۔

”جاؤ روشنی۔“ اسے سوچ میں گم پا کر وہ بولا۔

”تمہیں دیر ہو رہی ہے۔“

”وہ کھڑی ہوئی اور ہولے ہولے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔“



اس کے وہاں چلے آنے سے وہ سب ہی خوش ہو گئے تھے۔ سب کے چہرے مسکرا اٹھے تھے۔

”اب کیسی طبیعت ہے عالم کی؟“

باری باری ہر کسی نے یہی پوچھا تھا۔ سب سے ملتی سب کو جواب دیتی وہ اچانک ہی تھمی تھی۔

حارث کو گود میں لیے، پیار کرتا ہوا وہ بڑا تعلق سا بیٹھا تھا۔ ہولے ہولے اس سے نجانے کیا باتیں کر رہا تھا۔

”کیسے ہوا ذر۔“ وہ خود جان کر اس تک آئی۔

”شکر ہے خدا کا۔“ اس نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔

”تم کیسی ہو۔“

پھر وہ جھک کر حارث کو اس کی گود سے لینے لگی۔ اس کا گجرا آذر کی نظروں کے سامنے ملنے لگا۔ اس کی خوشبو اس کے گرد بکھرنے لگی۔ سختی

سے دانت پر دانت جما کر اس نے رخ موڑ لیا۔

حارث کو لیتے لیتے ضوفشاں کو اچانک اس کی کیفیت کا علم ہو گیا۔ لمحہ بھر کی تاخیر کیے بغیر وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ مہ جہیں سے باتیں کرنے

لگی۔ بڑی دیر بعد اس نے رخ موڑا تو اس کی نگاہ آذر پر پڑی۔ وہ اپنی سابقہ کیفیت سے تاحال باہر نہ آ سکا تھا۔ اسی طرح کسی خواب کی حالت میں

تھا۔ کسی غیر مرئی نقطہ کو نگاہوں کی زد میں لیے وہ ماضی میں تھا۔ حال میں یا مستقبل میں۔ وہ کوئی اندازہ قائم نہ کر سکی۔

”ضوفی۔“ کھانے کے بعد مہ جہیں نے اس سے کہا۔

”مجھے ایک بات کہنی ہے تم سے۔ نجانے تمہیں کیسی لگے۔“

”کہیں آپا۔ دماغ اس قدر تھکا ہوا رہتا ہے کہ کسی بات کو مکمل طور پر سمجھ ہی نہیں پاتا اچھا یا برا کیا محسوس کرے گا۔“

”ضوفی! آذر کو دیکھا تم نے۔ کیسا ہو گیا ہے؟“

”کیسا؟“ اس نے نظریں جھکا لیں اور حارث کے ہاتھوں سے کھینے لگی۔

”بالکل بدل گیا۔ لگتا ہی نہیں یہ وہی پہلے والا آذر ہے۔ جو ہر وقت ہنستا تھا اور ہنساتا تھا چٹکے چھوڑتا رہتا تھا۔ نجانے کن خیالوں میں گم رہتا

ہے۔ شاید اب تک اپنا ماضی فراموش نہیں کر پایا ہے۔ یہ جدہ میں تھا پھوپھی اماں اس کی منتیں کیا کرتی تھیں کہ واپس آ جائے۔ شادی کر کے گھر بسا

لے۔ گولی مار۔ ایگریمنٹ کو۔ لیکن جب سے یہ لوٹا ہے ہر کوئی اداس اور پریشان ہو گیا ہے۔ اسے کب کسی نے اس طرح دیکھا تھا۔ ٹوٹا ہوا، بکھرا ہوا

اپنے خیال میں گم۔ ہم سب نے شادی کے لیے اصرار کیا مگر یہ کسی طرح نہیں مانتا۔ کہتا ہے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔“

وہ خاموش ہوئی تو ضوفشاں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی نظروں میں سوال تھا کہ مہ جہیں اس سے کیا چاہتی ہے۔“

”میں چاہتی ہوں ضوفی! کہ تم اس سے بات کرو۔“ بالآخر اس نے کہا۔

”میں! میں کیا بات کروں!“

”یہی۔ سمجھاؤ اسے ماضی کو ماضی سمجھے اور حال کو حال۔ میں جانتی ہوں وہ کبھی تمہارا کہا نہیں مالتا۔ تم اسے سمجھاؤ گی تو شاید وہ مان جائے۔ اسے کہو کہ سب اس کی طرف سے فکر مند ہیں۔ پریشان ہیں۔ پھوپھی اماں چاہتی ہیں کہ جلد از جلد اس کی شادی کر دی جائے۔ انہوں نے لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔“ ضوفشاں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”اچھا۔ کون ہے؟“

”پھوپھی کے دور پرے کے کوئی بھائی ہیں۔ ان کی بیٹی ہے نعمانہ۔ اچھی خوبصورت لڑکی ہے۔ پڑھی لکھی، سلیقہ مند، رکھ رکھاؤ میں بھی اچھی ہے۔“

”آپ خود کیوں نہیں بات کرتیں؟“

”میں نے بات کی تھی۔ تصویر بھی دکھائی لڑکی کی لیکن اس نے ایک نگاہ تک نہیں ڈالی۔ کہنے لگا جبیں باجی نظر کے سامنے کوئی تصویر ہو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ جو ایک تصویر دل کے فریم میں لگی ہے، نکالے نہیں نکلتی۔ دھندلاتی نہیں۔ ماند ہی نہیں پڑتی۔ میں کوئی اور تصویر دیکھوں بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔“

خوشی اور دکھ کی انتہائی متضاد کیفیات سے انسان ایک ساتھ بھی دو چار ہو سکتا ہے۔ ضوفشاں کو اندازہ ہوا۔

”میں چاہتی ہوں۔ تم اسے سمجھاؤ۔ اس سے ضد کرو کہ مان لے سب کی بات۔ ضد چھوڑ دے۔ ایک بار شادی ہو جائے تو سب بھول جائے گا۔“

شادی اور برین واشنگ کا آپس میں کیا تعلق ہے، ضوفشاں بڑی دیر تک سوچتی رہی لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ شاید اس لیے کہ وہ خود بھی شادی شدہ تھی۔

”کیا سوچنے لگی ہو؟“

”جی۔ کچھ نہیں۔“ وہ چونک اٹھی۔

”پھر۔ کرو گی بات؟“

”جی۔ کروں گی۔ لیکن وہ ہے کہاں؟“

”اوپر۔ اپنے کمرے میں تم بھی وہاں چلی جاؤ۔ وہاں آرام سے بات ہو سکتی ہے۔“

”نہیں آپا! اس طرح اچھا نہیں لگتا۔“ وہ ہچکچائی۔ ”اماں اب اسب یہیں ہیں۔“

”پھوپھی اماں نے خود مجھ سے کہا تھا۔ تم سے یہ بات کہنے کے لیے اور اماں بھی وہیں تھیں وہ جانتی ہیں کہ تمہیں اس سے کیا بات کرنی ہے۔“

ناچارہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ حارث کو اسے تھما کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ ہلکے ہلکے قدم بڑھاتی، ذہن میں جملوں کو ترتیب دیتی وہ بالآخر اس کے کمرے کے دروازے تک جا پہنچی۔

دروازے پر پڑا پردہ اس نے ذرا سا سر کا کر اندر جھانکا۔ وہ میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ پشت سے سر کا کر آنکھیں بند کیے نجانے وہ کس سوچ میں تھا۔ اس کا جی چاہا جا کر اس کی بند آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھے اس کے منہ سے کس کا نام نکلتا ہے۔

اسی لمحے وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”اندرا جاؤ اجالا!“ اس نے دروازے کی سمت دیکھے بغیر کہا تھا۔

وہ ایک لمحے کو حیران رہ گئی۔

”تمہیں کس طرح پتا چلا کہ میں باہر کھڑی ہوں۔“ وہ حیرانی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی وہ ہولے سے ہنسا۔ ایسی ہنسی جس میں طنز کی آمیزش تھی۔

”جو پرفیوم تم نے لگا رکھا۔ وہ اس قدر قیمتی ہے کہ میں اس کی محض ایک بوند میلوں کے علاقے کو مہر کا سکتی ہے اور میں تو تمہیں اس گجرے کی خوشبو سے پہچان سکتا ہوں جو تھوڑی دیر پہلے تمہارے بالوں میں لگا ہوا تھا۔“

”اب مجھ سے ایسی باتیں مت کیا کرو آذرا!“ وہ کچھ خفگی سے بولی۔

”میں کوشش کرتا ہوں کہ تم سے بات ہی نہ کروں لیکن تم سامنے آتی ہو تو نہ دل پر قابو رہتا ہے نہ زبان پر۔ اسی لیے میں یہاں اکیلا بیٹھا تمہارے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔“

”اس کیلے پن کو دور کیوں نہیں کرتے؟“ اس نے میز سے ٹک کر بات کا آغاز کیا۔

”کس طرح؟“ وہ میز کی سطح پر شہادت کی انگلی اس کچھ لکھ رہا تھا۔

ضوفشاں نے محسوس کیا وہ اس کی جانب دیکھنے سے بھی گریز کر رہا تھا۔

”شادی کرلو۔“

”شادی کر لینے سے اکیلا پن دور ہو جاتا ہے؟“

”شاید یقیناً“

”تنہائی اور اکیلے پن کا احساس کبھی کبھی انسان کے اندر رچ بس جاتا ہے ضوفشاں بیگم۔“

وہ اٹھ کر کھڑکی تک گیا اور پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے لگا۔ ”لیکن تم شاید اس فرق کو سمجھ نہ سکو۔“

”میں ہر بات سمجھ سکتی ہوں۔“ وہ رسانیت سے بولی۔ ”اور اسی لیے تمہیں بھی سمجھا رہی ہوں۔ ایک انسان دوسرے انسان کی تنہائی اور اکیلے پن کو ختم کر سکتا ہے۔ خواہ یہ اکیلا پن انسان کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔ انسانی جذبات، حساب کا کوئی فارمولا نہیں ہوتے جو ہر بار ایک جواب لوٹائیں۔“

وہ مڑا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔

”ہاں۔ تم یہ کہہ سکتی ہو۔ ہر چند کہ تمہارے جذبات مجھے حساب کا فارمولا ہی لگتے ہیں جو رقم بدلنے پر بھی اس سے وہم برتاؤ کرتے ہیں جو پہلے رکھی گئی رقم سے کیا تھا۔ بڑی مشینی سوچ ہے!“

وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔

”کیوں؟ کوئی جواب نہیں دیا۔“ وہ ہنسا ”ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ بہت سے سوال ایسے ہیں جن کے جواب دینا تم ضروری خیال نہیں کرتیں!“

”آذرا!“ وہ بے بسی سے بولی تھی۔

اس نے سختی سے آنکھیں بند کر کے پھر کھولیں۔

”مت پکارو مجھے اس طرح کہ اپنا نام بھی مجھے جھوٹا لگنے لگے۔ دنیا کی ہر سچائی کی طرح اور کیوں چلی آئی ہو یہاں اجالا۔ تم کیا چاہتی ہو۔ میں پاگل ہو جاؤں۔ دیواروں سے سر پھوڑوں؟ میں تمہاری طرف بڑھتا ہوں تو تم پلٹ کر بھاگنے لگتی ہو۔ مایوس ہو کر لوٹتا ہوں تو میرے پیچھے آتی ہو۔ تم کیا چاہتی ہو۔ کیا؟“

”میں چاہتی ہوں کہ تم شادی کرلو۔ گھر بساؤ، خوش رہو۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ تمہاری وجہ سے کتنے لوگ پریشان ہیں۔ پھوپھی اماں، پھوپھا، ابا، جیسے آپا۔ تم کو اس طرح دیکھ کر اندر ہی اندر سلگتے ہیں وہ۔ گھٹنے لگتے ہیں۔ سب تمہیں بے تحاشا چاہتے ہیں آذرا اور جنہیں چاہا جائے انہیں

نوشا ہوا، بکھرتا ہوا نہیں دیکھا جاسکتا۔“

”جب ایک بات مجھے خوشی نہیں دے سکتی تو کیوں کروں میں وہ کام۔“ وہ جھلایا۔
”دوسروں کی خوشی کی خاطر ہی سہی۔“

”دوسروں کی خوشی“ وہ زچ ہوا۔ ”میری اپنی بھی کوئی زندگی ہے۔ میری اپنی بھی خواہشات ہیں کیا ساری زندگی دوسروں کی خوشیوں کے لیے ہی بسر کروں گا میں، یا اپنی مرضی سے بھی اپنی زندگی کا کوئی حصہ گزار پاؤں گا۔ جواب دو!“
”لیکن اس طرح بھی تم خوش تو نہیں ہوا“ وہ عاجزی ہو کر کرسی پر ٹک گئی۔
”سکون سے ہوں۔ جی رہا ہوں۔ مجھے ایسے ہی رہنے دو۔“ وہ بھی تھک کر بند کے کنارے بیٹھ گیا۔
بڑی دیر تک دونوں اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے، خاموش بیٹھے رہے۔
”پھر نہیں مانو گے میری بات؟“ آخر سر اٹھا کر اس نے بڑی آس سے پوچھا تھا۔
کتنی باتیں منواؤ گی اجالا!“ اس نے سر اٹھایا۔
”کوئی فیصلہ تو مجھے بھی کر لینے دو۔“

”یہ میں تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں آذر۔ یقین کر دو میں نے کبھی تمہارا برا نہیں چاہا۔ ہمیشہ تمہاری خوشیوں کے لیے دعا کی ہے۔“
”پتا نہیں تمہاری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”شاید میرا اپنا اعمال نامہ یہ بہت سیاہ ہے۔“
اس کے اندر دھواں سا پھیل گیا۔ آنکھیں پھر لبالب بھر گئیں۔
”اب رو رہی ہو؟“ وہ ہنس دیا۔ ”عجیب لڑکی ہو۔ دکھ بھی دیتی ہوں، روتی بھی خود ہو اور شکایت بھی کرتی ہو! کیا چاہتی ہو یا رکزن تم؟“
وہ خاموش بیٹھی اپنے ہاتھوں کو گھورتی رہی۔
”تم ساڑی پہن کر اچھی لگتی ہو۔“ کچھ دیر بعد وہ بات بدل کر بولا تھا۔
”ہاں۔ عالم کو بہت پسند ہے یہ لباس!“ اس نے سر اٹھایا۔

”اس کی ضد پر پہنتی ہو؟“

”انہوں نے کبھی مجھ سے کسی کام کے لیے ضد نہیں کی۔ بس کبھی کبھار اپنی پسند کا اظہار کر دیتے ہیں۔“

”اور تم اس پسند کا خیال رکھتی ہو۔“ وہ ہنسا۔ ”اچھی بیوی ہو۔ آج تم یہیں رکو گی؟“

”اس نے چونک کر سر اٹھایا اور کھڑکی سے باہر سیاہ آسمان کو دیکھا پھر گھبرا کر اپنی رسٹ واچ دیکھی۔

”اوہ۔ خدایا! گیارہ بج گئے۔“ نجانے کیوں اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ”بہت دیر ہو گئی۔ میں چلتی ہوں۔“
وہ مڑ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

باہر گلی میں ڈرائیور نجانے کب سے اس کا منتظر تھا۔

”تم نے بارن کیوں نہیں دبایا؟“ وہ اس پر ہی برس پڑی تھی۔

”بی بی جی۔ آپ ہمیشہ خود ہی آ جاتی ہیں۔“ وہ بوکھلا گیا۔

وہ خود پر غصہ ہوتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ جانتی تھی عالم نے اس کے انتھار میں کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا اور نجانے کن اندیشوں کا شکار ہو۔

تمام راستہ وہ ایک بے چینی کا شکار رہی۔ خود سے لڑتی رہی۔ خود پر برستی رہی۔

”مجھے خود ہی خیال ہونا چاہیے تھا۔ آخر میں کیسے بھول گئی۔ کیسے۔“

”سیڑھیاں تیزی سے پار کر کے وہ ہال میں داخل ہوئی۔ خیر اس کی منتظر تھی۔

”خیراں۔ صاحب نے کھانا کھایا ہے؟“

”شاہ صاحب تو جی بس آپ کے ساتھ ہی کھانا کھاتے ہیں۔ میں نے پوچھا بھی تو انہوں نے بھی بری طرح ڈانٹ دیا!“ اس نے منہ

بوسورا۔

”اچھا۔ تم فوراً کھانا گرم کر کے لے آؤ۔ فناٹ۔“ اس نے ساڑھے گیارہ بجاتی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور تیزی سے آگے بڑھی۔ وہ کمرہ میں

داخل ہوئی تو اندر گھٹا نوپ اندھیرا اچھایا ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ساری لائیں آن کر دیں پھر چونک اٹھی۔

وہ ویل چیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی جانب پشت کیے شیشے کی دیوار کے پارتا ریکیوں کو گھور رہا تھا۔

”عالم۔ اتنے اندھیرے میں کیوں بیٹھے ہیں؟“ وہ اس تک پہنچی۔

سید عالم شاہ نے تھکی ہوئی مرجھائی نگاہ اس پر ڈالی۔

”بعض اوقات پتا نہیں چلتا کہ انسان اندھیرے میں ہے یا اجالے میں۔ بڑی تکلیف دہ کیفیت ہوتی ہے یہ۔ کبھی تم پر گزری ہے

روشنی؟“

”آذر آپ۔“ اس کے لبوں سے کیا نکل گیا تھا۔

لب بھیج کر وہ چند لمحوں کے لیے سنائے میں رہ گئی

سید عالم شاہ نے بڑی دیر تک اس کی جھکی ہوئی، لرزتی ہوئی پلکوں کو دیکھا پھر تھک کر اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

”بی بی صاحب! کھانا آ گیا ہے جی!“

دستک دے کر ٹرائی کھینچتی خیراں اندر آئی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ!“

وہ اٹھ کر ٹرائی تک آئی اور اسے اس تک لے آئی۔

”چاول نکالوں؟“

”جو تمہارا دل چاہے!“ وہ ست روی سے بولا تھا۔

”آپ۔ آپ خفا ہیں مجھ سے؟“

”نہیں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”اب اکثر میں خود سے خفا رہتا ہوں۔“

”عالم۔ آپ کو میرا یقین نہیں ہے؟“

سید عالم شاہ نے اس کی جانب دیکھا۔

”مثلاً کس بات کا یقین؟“

”مثلاً یہ کہ میں آپ سے مخلص ہوں۔“

”ہاں۔“ وہ ہنسا۔ ”یقین ہے مجھے۔ تم دنیا کے کسی شخص سے غیر مخلص نہیں ہو سکتیں۔ سو مجھ سے بھی نہیں ہو۔“

”عالم۔ عالم۔ آپ مجھ سے اس طرح سے بات مت کیا کریں۔“

”پلیٹ رکھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ وہ کیا کرتی۔ کس کس کو مناتی۔ کس کس کو سمجھاتی۔ اسے لگا کہ وہ ایک اونچے بلند سیاہ

پہاڑ کی چوٹی پر تبا کھڑی ہے۔

”عالم! میں پاگل ہو جاؤں گی۔“

آنسوؤں کے شفاف قطرے اس کے گالوں پر پھسلنے لگے۔

”روشنی۔“ اس کے جیسے دل پر چوٹ لگی تھی۔

”روشنی۔“ روؤ مت۔ پلیز۔“

اس نے بے تابی سے اس کے آنسو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کر لیے۔

”دیکھو میں خفا نہیں ہوں تم سے۔“

”خود سے کیوں ہیں؟“ وہ جھلائی۔

”اچھا۔ خود سے بھی نہیں ہوں۔ بس تم روؤ مت روشنی۔“

اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

وہ ہمیشہ کی طرح اپنی آنکھوں میں ساری محبتیں تمام تر وارفتگیاں لیے اسے دیوانہ وار دیکھ رہا تھا۔

اس کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا۔

”چلیں کھانا کھائیں۔“ وہ اسے کھانا کھلانے لگی۔



بڑی تھکی باری وہ لوٹی تھی۔ سارے دن کی شاپنگ نے اس کا جوڑ جوڑ دکھا دیا تھا اور کچھ اس کا شاپنگ کا موڈ بھی نہ تھا۔ لیکن بہت سی چیزیں تھیں جن کی اسے ضرورت تھی۔ پچھلے کافی دنوں سے وہ اس قدر مصروف رہی تھی کہ باوجود کوشش کے بازار جانے کا وقت نکال ہی نہ پاتی تھی۔ لیکن صبح جب مہ جبین نے فون کر کے شاپنگ کو جانے کے لیے استفسار کیا تو وہ فوراً مان گئی۔ سوپورا دن لگا کر اب تھک بار کر لوٹی تھی۔

”امید۔“ میٹرھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ملازم سے کہا۔ ”گازی میں جتنا بھی سامان ہے وہ اوپر پہنچا جانا۔“

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ عالم شاہ پانی آرام کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

”بہت تھک گئی ہوں میں۔“ اس نے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا پھر دوبارہ کتاب کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”آپ تب سے یہ کتاب پڑھ رہے ہیں؟“

”نہیں۔“ اس نے کتاب بند کر کے واپس ایک میں رکھ دی۔ ”بیچ کے عرصے میں کچھ اور پڑھتا رہا تھا۔“

”کیا؟“ اس نے بال کھول کر ان میں انگلیاں چلائیں۔

”تمہارے ابا آئے تھے۔“ وہ عام سے لہجے میں بتانے لگا۔

”اچھا! وہ چوٹک اٹھی۔“ کتنی دیر بیٹھے؟ میرا انتظار بھی نہیں کیا انہوں نے؟“

”بس تھوڑی دیر کے۔ مجھ سے ملنے آئے تھے اور۔“

”اور؟“ اسے محسوس ہوا کہ وہ کچھ تناؤ کا شکار تھا۔

”اور۔ تمہاری کچھ چیزیں ملی تھیں انہیں۔ وہ دینے آئے تھے۔“

”میری چیزیں؟“ اسے حیرت ہوئی۔ ”میری کون سی چیزیں رہ گئی ہیں وہاں بھلا؟“

اس نے ذرا سا ترچھا ہو کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا شیشم کی لکڑی سے بنا چھوٹا سا خوبصورت منقش باکس اٹھا کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

اس کی نظر باکس پر پڑی پھر کچھ دیر کو وہ ساکت رہ گئی۔ یہ باکس اسی کا تھا۔ ابا نے کئی سال پہلے اسے سوات سے لا کر کر دیا تھا۔ اس میں وہ

اپنی نئے سال کی ڈائری اور اپنے ضروری کاغذات رکھا کرتی تھی اور ان چیزوں کے علاوہ اس میں آذر کے خطوط بھی تھے اور وہ اپنی ڈائری کی جلد میں

رکھ دیا کرتی تھی۔

”بیچ کے عرصے میں، میں کچھ اور اور پڑھتا رہا تھا۔“

اسے چند لمبے قبل ادا کیا گیا جملہ یاد آیا۔

”لو۔ پکڑو۔“

اسکی حالت مراقبہ سے واپسی کا کچھ دیر منتظر رہ کر وہ خود ہی بولا۔ اسنے چونک کر پہلے اسے پھر باکس کو دیکھا اور آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

”تمہارا تعلیمی ریکارڈ اچھا ہے۔“ اس نے واپس اپنی کتاب ریک سے نکال لی تھی اور اب اس کے صفحے بے وجہ الٹ رہا تھا۔

اس نے باکس کھولا اور اس میں رکھی چیزیں نکالنے لگی۔ اس کے شوٹلیٹ تھے، ایک نوٹ بک تھی۔ اس کی تین سال پرانی ڈائری تھی جو اسے آڈرنے نیا سال شروع ہونے پر لا کر دی تھی۔

اس نے ڈائری کی جلد پر ہاتھ پھیرا۔ وہ ابھری ہوئی تھی۔ پھر اس نے چور نظروں سے سید عالم شاہ کو بے نیاز بیٹھا دیکھا۔

”معاف کرنا روشنی۔“ وہ اچانک بولا تھا۔ ”میں دخل درذاتیات کا قائل نہیں ہوں اور نہ ہی تجسس کا زیادہ شکار ہوتا ہوں۔ لیکن وہ سب کچھ پڑھنے بغیر نہ رہ سکا۔ آئی ایم سوری۔ اس ڈائری میں تمہاری کچھ تحریر ہے اور اس کی جلدی میں کبھی لکھے گئے تمہارے کزن کے خطوط۔ میں پڑھے بغیر نہ رہ سکا۔“

اس کے لبوں سے ایک گہرا سانس آزاد ہوا۔ وہ دوبارہ ساری چیزیں اس میں واپس رکھنے لگی۔ تمام چیزیں رکھ کر اس نے وہ باکس الماری کے اوپری خانے میں رکھ دیا۔

”روشنی۔ مکرم علی کو بلاؤ۔ میں لیٹنا چاہتا ہوں۔“ اس کا لہجہ تھکن سے چور تھا۔ صوفشاں نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا پھر بیڈ کے سائیڈ میں لگا بٹن پیش کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ تکیوں کے سہارے، بستر پر نیم دراز کچھ سوچ رہا تھا۔

”روشنی۔“ بڑی دیر بعد اس نے پکارا تھا۔ ”آؤ کچھ دیر میرے پاس بیٹھو۔“

وہ جا کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”تھکی ہوئی لگتی ہو۔“

”جی!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیا ضرورت تھی آج ہی پوری خریداری کرنے کی۔ کل پھر چلی جاتیں۔“

وہ شاید کچھ کہنے کے لیے لفظ ڈھونڈ رہا تھا۔

”بس میں نے سوچا، روز روز کہاں فرصت ملتی ہے!“ وہ اپنے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔

”ہاں۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”میں نے کہا تھا ناں کہ میں ایک جوان انسان سے اچانک ہی ایک بچے میں تبدیل ہو گیا ہوں۔ اور بچے

کہاں فرصت دیتے ہیں۔ میری وجہ سے کتنی مصروف رہتی ہوں۔“

”مجھے خوشی ہوتی ہے آپ کے ساتھ مصروف رہ کر۔“

عالم شاہ نے غور سے اس کی جھکتی پلکوں کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

”روشنی! تم بہت اچھی ہو۔ بحیثیت ایک انسان کے جتنی اچھائیاں کسی میں ہونی چاہئیں تم میں ہیں۔ خصوصاً تمہاری یہ بات تمہاری یہ

بات مجھے پسند ہے کہ تم کسی کا دل نہیں توڑ سکتیں۔“

وہ دھیرے سے ہنس دی

”کتنے دل توڑے ہیں میں نے عالم شاہ۔“ اس نے سوچا۔ ”لیکن وہ حساب کتاب تو آپ کب کا بھول چکے ہیں۔“

”روشنی۔“

”جی! اس نے پلکیں اٹھائیں۔“ جو کہنا چاہتے ہیں کہہ کیوں نہیں دیتے؟“

”تم برا بھی تو مان جاتی ہو۔“ وہ کسی بچے کی سی معصومیت سے بولا تھا۔

”نہیں۔“ وہ ہنس دی۔ ”جو کہنا چاہیں کہیں میں برا نہیں مانوں گی۔“

”ایک بات پوچھوں پھر؟“

”ضرور۔“ وہ مسکرائی۔

”تمہارا کزن۔ ابھی بھی چاہتا ہے تمہیں؟“

ایک گہرا سانس اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

”بولو۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ ہو سکتا ہے ہاں۔ ہو سکتا ہے نہیں۔“

”تبھی پوچھنے سے قبل تم سے اجازت لی تھی کہ کہیں تم جھوٹ نہ بولو۔ لیکن پھر بھی تم نے جھوٹ بول رہی ہو۔“ وہ ہنسا۔ ”میں بتاؤں روشنی۔“

وہ اب تک تمہیں چاہتا ہے۔ اسے اب بھی تمہارے قرب کی خواہش ہوگی۔“

”عالم۔“ وہ زچ ہوئی۔ ”اگر آپ سب کچھ جانتے ہیں تو پھر کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”روشنی۔ تم۔“ وہ رک رک کر بولا۔ ”تم۔ تم بھی چاہتی ہو اسے اب تک۔“

”کیا ہو گیا ہے آپ کو۔“ وہ بری طرح الجھ گئی۔

”عالم! آپ نے کبھی مجھ سے ایسی باتیں نہیں کیں۔ آپ میرے ماضی کو جانتے ہیں۔ ہر بات سے واقف ہیں۔ آپ نے مجھے اپنی

خواہش، اپنی رضا سے اپنا یا تھا پھر یہ استفسار کیوں؟ یہ شک کیسا؟“

”نہیں روشنی نہیں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”میں شک نہیں کر رہا ہوں میں اتنا بدگمان نہیں ہوں۔ میرا یقین کرو۔ میں نے زبان دی تھی تمہیں

کہ کبھی تمہاری جانب سے معمولی سا بدگمان بھی نہ ہوگا۔“

”میں۔ میں رشک و حسد کی اس کیفیت سے گزر رہا ہوں جسے تم سمجھ نہیں پاؤ گی روشنی!“ وہ بے بسی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا تھا۔“

میں تمہیں کھودینے کے وہم میں مبتلا نہیں ہوں۔ میں تمہیں پانہ سکنے کے غم سے چور ہوں۔ مجھے احساس ہو رہا ہے اب اکثر ہوتا رہتا ہے کہ میں تمہیں پا

کر بھی نہ پا سکا اور اس نے تمہیں کھو کر بھی نہیں کھویا۔ مجھے اس شخص پر رشک آتا ہے۔ کوئی مجھے اختیار دے تو میں اس شخص سے اپنا وجود بدل ڈالوں

جس پر آج بھی تمہاری نگاہ اٹھتے ہوئے محبتوں سے بھر جاتی ہوگی۔ آہ۔ کہیں پڑھا تھا روشنی کہ محبت بڑی خطرناک شے ہوتی ہے۔ یہ زندگی میں پائی

جانے والی خوشیوں کی قاتل ہوتی ہے۔

اس کا کاٹا سوتے میں مسکراتا اور جاگتے میں روتا ہے۔ میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ مصنف کیا کہنا چاہتا ہے۔ بھلا محبت خوشیوں کی قاتل کیسے

ہو سکتی ہے۔ محبت تو خوشی کا دوسرا نام ہے لیکن آج ان چند سطروں کا مطلب مجھ پر اسی طرح واضح ہے جس طرح مصنف پر وہ سطریں تحریر کرتے ہوئے

ہوگا۔ اس کا کاٹا سوتے میں مسکراتا اور جاگتے میں روتا ہے۔“

وہ کسی بت کی مانند ساکت تھی۔ اس کا دل بے شمار دکھوں سے بوجھل تھا اور آنکھیں خالی تھیں۔

”روشنی۔ کوئی میری ساری زندگی کے تجربوں کا نچوڑ مانگے تو میں کہوں گا کہ کبھی کسی عورت کو اس کی رضا کے بغیر مت اپنا اور اپنا لو تو کبھی

اس سے محبت کی خواہش مت کرنا۔ میں نے عورت کو ہمیشہ بہت کمزور سمجھا تھا۔ موم کی گڑیا کی طرح لیکن ایک عمر برتنے کے بعد میں نے یہ جانا ہے

عورت موم ہے یا پتھر۔ اس کا فیصلہ وہ خود کرتی ہے۔ کسی دوسرے شخص کو اسے موم یا پتھر کا خطاب دینے کا حق نہیں ہوتا۔ وہ خود چاہے تو موم بن کر

محبوب کے اشاروں کی سمت مڑتی رہی ہے اور پتھر بننے کا فیصلہ کر لے تو کوئی شخص بھکاری بن کر بھی اس کی ایک نگاہ التفات نہیں پاسکتا۔ اپنی ہستی تمہاری نام لکھ کر بھی میرا دل ایک کشتکول کی طرح خالی ہے روشنی۔ یہ وہ کشتکول ہے جو ہمدردی، مروت اور جبر کے تحت دیے گئے تمام سکے نیچے گرا دیتا ہے۔ جیسے کسی اندھے فقیر کو خود بخود خبر ہو جائے کہ اسے دیا جانے والا سکہ کھوٹا ہے۔ یہ کشتکول محض محبت سے بنا سکہ مانگتا ہے روشنی۔ سوا ب تک خالی ہے۔“

وہ جانتی تھی کہ ان تمام باتوں کے جواب میں کہنے کے لیے اس کے پاس ایک حرف بھی نہیں سو وہ خاموش بیٹھی رہی۔
سید عالم شاہ نے اس پر نگاہ ڈال کر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اس سانس میں ہزار صدیوں کی تشنگی تھی۔



کئی دنوں بعد وہ آج خاصے خوشگوار موڈ میں تھا۔ صبح سے اس سے باتیں کر رہا تھا۔ مذاق کر رہا تھا۔ ضوفشاں نے سکون کا گہرا سانس لیا تھا۔

تھوڑی دیر قبل ڈاکٹر اس کا چیک اپ کر کے گیا تھا اور اس سے امید افزا باتیں کی تھیں۔ سو اس کا موڈ مزید خوشگوار تھا۔
”روشنی۔“ وہ اسے دوائی کھلا کر مڑی تو اس نے پیچھے سے اس کی ساڑی کا پلو تھام لیا۔
”جی۔“ وہ مڑ کر مسکرائی۔

”پتا ہے، آج میرا کہاں جانے کا دل چاہ رہا ہے۔“

”آپ بتائیں!“ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”نہیں۔ تم بوجھو۔“

اس نے چند لمحے سوچا۔ اس کا پسندیدہ مقام وہی مصنوعی جھیل تھی جہاں وہ اسے شادی کے بعد دو تین مرتبہ لے جا چکا تھا۔
”جھیل پر؟“

”نہیں۔“ وہ ہنسا۔ ”میں جانتا تھا تم یہی کہو گی۔ میرا دل آج اپنی آبائی حویلی پر جانے کا چاہ رہا ہے۔ تمہارے ساتھ۔ تمہیں میں کبھی وہاں لے کر نہیں گیا۔“

”آپ ٹھیک ہو جائیں پھر چلیں گے۔“

”میرا دل ان برآمدوں، کمروں اور طویل راہداریوں میں چہل قدمی کرنے کو چاہ رہا ہے تمہارے ساتھ، میں تمہیں ہر جگہ دکھاؤں گا جہاں بیٹھ..... کر میں نجانے کیا کچھ سوچا کرتا تھا۔“

وہ اسے سوچ میں گم ہوتا دیکھ کر مسکرا دی۔

”شاہ صاحب۔“ باہر سے ملازم نے دروازہ بجایا۔

”آپ سے کوئی آذر صاحب ملنے آئے ہیں۔“

”سید عالم شاہ نے اس کی حیران ہوتی آنکھوں میں جھانکا۔ ضوفشاں نے دیکھا، اس کے چہرے پر چمکتی وہ الوہی خوشی یکدم غائب ہو گئی تھی۔“

”مجھ سے نہیں۔ وہ تم سے ملنے آیا ہو گا روشنی۔ جاؤ مل لو۔“

”عالم! وہ میرا کزن بھی ہے۔ آپ سے ملنے آسکتا ہے۔“ اس نے رسامیت سے کہا۔

”کزن بھی۔“ وہ بڑبڑایا پھر عجیب طریقے سے مسکرا دیا۔ ”اچھا اگر مجھ سے ملنے آیا ہو تو لے آنا اسے یہاں۔ ورنہ وہیں سے رخصت

کر دینا۔“

وہ الجھن میں مبتلا اٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔ آذر کی آمد نے اسے ذہنی طور پر پریشان کر دیا تھا۔ سیرھیاں اترتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنے گھر آنے سے منع کر دے گی۔

وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہ دیوار کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھ پیٹ کی جیبوں میں ڈالے وہ دیوار پر پیٹ کی ہوئی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

اسکے قدموں کی آہٹ پا کر وہ مڑا اور مسکرا دیا۔

اس کے قدموں کی آہٹ پا کر وہ مڑا اور مسکرا دیا۔

”کیسی ہوا جالا۔“

”نھیک ہوں۔ بیٹھو۔“

”شکریہ۔“ وہ اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ ”میرا یہاں چلے آنا تمہیں پریشان کر دیتا ہوگا۔“

”ہاں!“ وہ صاف گوئی سے بولی۔

”میں جانتا ہوں لیکن پچھلے کچھ دنوں سے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے اس تمام عرصے میں تمہارے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں رکھا۔ نجانے کیوں میں تمہیں دکھ دے رہا تھا۔ لاشعوری طور پر۔ مجھے معاف کر دوا جالا۔“

”میں نے ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ ”معاف کرنے کا پانہ کرنے کا کیا جواز۔ میرا نہیں خیال کہ تم نے کوئی ایسی بات کی۔“

”میں اتنا خود غرض ہو گیا تھا جالا کہ تمہارے شوہر کو دیکھنے اور اس کا حال دریافت کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔“ وہ تاسف کے سمندر میں غرق تھا۔ ”میں عالم صاحب سے ملنے ہی آیا ہوں۔“

”اچھا!“ وہ خاموش ہو گئی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سید عالم شاہ اس سے مل کر کیسا محسوس کرے گا۔ اس کے جذبات اور اس کا رویہ کس طرح کا ہوگا۔ وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔

”میں ان سے تمہارے کزن کی حیثیت سے ملنا چاہتا ہوں جالا۔“ اسے سوچ میں غرض دیکھ کر وہ بے حد تاسف سے بولا تھا۔ ”لیکن اگر تم کچھ اور سوچ رہی ہو تو پھر میں چلتا ہوں۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ بھی گھبرا کر کھڑی ہوئی۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ تم ان سے ضرور ملو مجھے خوشی ہوگی۔“

اس کو اپنی عمر اسی میں لیے وہ اپنے کمرے تک چلی آئی۔

”عالم۔“

وہ آنکھیں موندے لینا تھا۔ اس کی آواز پر چونک اٹھا۔

”یہ آذر ہیں۔“

”السلام علیکم۔“ وہ خوش دلی سے آگے بڑھا تھا۔

”کیسے ہیں آپ؟“

سید عالم شاہ نے بڑی دیر اس کے چہرے کو دیکھا پھر تھکے تھکے انداز میں اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

”بیٹھو۔“ اس نے صوفے کی سمت اشارہ کیا۔ ”روشنی ذرا مجھے سہارا دینا۔“

آذر اس سے ہاتھ ملا کر صوفے پر جا بیٹھا۔ صوفشاں اسے تکیوں کے سہارے بیٹھنے میں مدد دینے لگی۔

”آپ صوفی کو روشنی کہتے ہیں۔“ وہ اس سے مخاطب تھا۔

”ہاں۔ یہ میری زندگی کے اندھیروں میں روشنی بن کر اتری تھی۔ میرے لیے یہ روشنی ہی ہے۔“

”بڑے خوش قسمت ہیں آپ!“

سید عالم شاہ نے غور سے اسے دیکھا۔

”بعض لوگوں کو اپنی قسمت کے چمکتے کاغذ کا علم ہی نہیں ہوتا۔ وہ محض لفظوں کو پڑھتے ہیں۔ تم انہی لوگوں میں سے ایک ہو۔“

”جی؟“ وہ متعجب ہوا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”میری باتوں سے مطلب کم ہی نکلتا ہے۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔ ”لفظوں کے پیچھے مت بھاگا کرو یا را!“

آذر نے پہلے صوفشاں کو پھر سید عالم شاہ کو دیکھا۔ اس کو شاید عالم شاہ کی دماغی حالت پر شبہ ہوا تھا۔

”بڑے فلسفی ناپ بندے لگتے ہیں آپ!“ وہ ہنسا تھا۔

”مجھے معلوم نہیں فلسفی کسے کہتے ہیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ حالات انسان کو اپنی مرضی کے مطابق سوچ بخش دیتے ہیں۔ جیسا میں اب سوچتا

ہوں کچھ عرصے قبل اس طرح سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔“

کچھ دیر کے لیے تینوں خاموش بیٹھے رہے پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔“

”روشنی! ان کو نیچے تک چھوڑ کر آؤ۔“ وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولا تھا۔

”جی بہتر۔“ وہ اس کے پیچھے پیچھے باہر نکلی۔

”اس تکلف کی ضرورت نہیں۔“ آذر نے اسے روک دیا۔ ”میں چلا جاؤں گا خدا حافظ۔“

اسے سیڑھیاں اترتے وہ دیکھتی رہی پھر مڑ کر اندر آ گئی۔

وہ خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

”آذر۔ آپ سے ہی ملنے آیا تھا۔“ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

”اچھا لڑکا ہے۔“ اس نے محض اتنا ہی کہا۔

وہ تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھی پھر کھانے کی ہدایات دینے کے لیے نیچے آ گئی۔ سید عالم شاہ کے لیے اکثر وہ اپنے ہاتھ سے سوپ تیار کرتی

تھی۔ کچھ دیر سوچ کر وہ کچن میں چلی آئی۔ بہت عرصے بعد اس کا کھانے پکانے کا دل چاہنے لگا۔ ورنہ عالم شاہ اسے کسی کام کو ہاتھ لگانے کی اجازت

نہیں دیتا تھا۔

”بی بی صاحب۔ فون ہے آپ کا۔“ حسینہ اندر آئی تھی۔

”کس کا ہے؟“ اس نے پیاز کاٹتے ہوئے آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کیے۔

”کوئی آذر صاحب ہیں۔“

”یا اللہ۔ یہ آذر کو کیا ہو گیا ہے۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”پیاز رکھ کر وہ باہر آ گئی۔“

”ہیلو۔“ اس نے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو اجالا۔“ اس کی آواز حیرت انگیز طور پر بدلی ہوئی تھی۔ وہ بے تحاشا جوش کے تحت بول رہا تھا۔

”اجالا! آج۔ آج اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا ہے مجھ پر۔ تم نے یہ قربانی میری خاطر دی ہے ناں۔ میں سمجھ گیا ہوں اجالا میں سمجھ گیا

ہوں۔“

”کون سی قربانی؟“ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ”کیا کیا ہے..... میں نے تمہاری خاطر؟“

”اجالا۔ تم عظیم ہو۔ فخر ہے مجھے اپنی محبت پر۔“ اس کی آواز بھیگ گئی۔

”آذر۔ خدا کے لیے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔“

”اجالا۔ آج جس وقت میں تمہارے اس محل سے نکلا وہاں ایک جیپ آ کر رک کی جانتی ہو اس میں کون تھا۔ تمہارے گریٹ عالم شاہ کے وہ

کتے جنہوں نے مجھے اغوا کیا تھا۔ مجھے جس بے جا میں رکھا تھا۔ مجھے مارا پیٹا تھا۔ اجالا۔ خدا کی قسم آج ایک بات میری آنکھوں کے سامنے واضح

ہوئی ہے۔ میرا اغوا ہونا پھر ان لوگوں کو بغیر کسی لالچ کے مجھے چھوڑ دینا۔ میری قسم کھاؤ اجالا! کہ مجھے تمہارے شوہر نے اغوا کروایا تھا۔ کھاؤ قسم کہ تم نے

اس سے اپنی مرضی اور خوشی سے شادی کی تھی۔ کھاؤ قسم اجالا کہ تم خوش ہو۔ تمہارا پلکیں کسی انجانے دکھ سے بھیگی ہوئی نہیں رہتیں۔ بولو۔ جواب دو۔“

”آذر۔ آذر۔ اس کا سانس پھولنے لگا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔“

”مت جھوٹ بولو اجالا۔ مجھ سے مت جھوٹ بولو۔ جھوٹ بول بول کر تم نے کتنی زندگیاں خراب کیں۔ اپنی زندگی۔ میری زندگی۔ ہم

سے منسوب لوگوں کی زندگیاں۔ بتاؤ کیوں اتنے دکھ اٹھائے تم نے اور کیوں اتنے عذابوں سے گزرے ہم سب! کیوں جھوٹ بولا تھا تم نے ہم سب

سے؟ ایک بار کچھ بتایا تو ہوتا۔“

وہ گہرے دکھ کے احساس کے ساتھ بولتا جا رہا تھا۔

”مجھے بھی حیرت تھی کہ تم۔ تم اجالا کیسے بدل سکتی ہو۔ مجھے تو تمہارے لبوں سے نکلا اقرار کا ایک ایک حرف یاد تھا۔ میرے دل کی جھیل پر

تمہاری محبتوں کے کنول تو بڑی تازگی اور خوبصورتی سے کھلے ہوئے تھے۔ میری قربتیں تمہاری سانس کی ضمانت تھیں۔ تمہاری خوشیاں تھیں۔ تم اس

طرح کیسے اپنے لفظوں سے منکر ہو سکتی تھیں۔ اب میری سمجھ میں آیا ہے۔ تم بدلی نہیں تھیں، تمہیں بدلا گیا تھا۔ زور بازو سے، طاقت و جبر سے۔ میری

زندگی کے بدلے تم سے تمہارا وجود طلب کیا گیا تھا اور تم نے انکار نہیں کیا۔ کہو اجالا ایسا ہی ہوا تھا ناں۔ کہو اجالا۔ جو جو بالکل سچ اور کھرا ہے وہ کہو۔

تمہیں میری قسم۔ اگر تمہارے دل میں میرے لیے رتی برابر بھی محبت ہے تو سچ کہو۔ تمہیں میری قسم ہے۔“

”آذر۔“ وہ دکھ سے بولی۔ ”اگر یہ سب سچ بھی ہے تو اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”فرق پڑتا ہے اجالا۔ فرق پڑتا ہے۔ صرف یہ کہو کہ جو کچھ میں نے کہا وہ سچ ہے۔“

”اچھا۔ پھر!“ وہ تھک کر بولی۔ ”مانا میں نے پھر؟“

”اف۔ اف خدایا!“ وہ شاک کی حالت میں تھا۔ ”سید عالم شاہ۔ تم نے کیا چھینا ہے مجھ سے۔ تم نے کیا چھین لیا ہے مجھ سے۔ میری

زندگی کی ساری خوشیاں، تمام مسرتیں، میری ہنسی، میرا سکون، میری نیند، میرا آرام، میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔“

”آذر! خدا کے لیے مت کرو ایسی باتیں!“ کچھ تھا جو دل پر چوٹ بن کر پڑا تھا۔

”اجالا۔ میں تمہیں اس طرح اپنی زندگی خراب کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اب تم وہ کرو گی جو ہر کسی کو اس کی مسرتیں لوٹا دے۔“

”تم چاہتے کیا ہو؟“ اس نے تھک کر پوچھا۔

”اجالا۔ میں تمہیں ہر گز اجازت نہیں دوں گا کہ تم اپنی زندگی ایک پانچ، دہنی مریض کے ساتھ سسک سسک کر گزارو۔ وہ شخص یقیناً پاگل

ہے۔ جو اتنی زندگیاں برباد کر دے، وہ ذی ہوش نہیں ہو سکتا۔“

”آذر! خدا کے لیے۔“ اس نے بولنا چاہا۔

”اجالا۔ میرا یقین کرو۔ میں تمہیں ہر وہ خوشی لوٹاؤں گا جو تم سے چھین لی گئی۔ ہم اپنی زندگی کی نئی ابتدا کریں گے۔ ہم اس پاگل، اپانچ شخص کی پہنچ سے بہت دور چلے جائیں گے۔ ایک بار ہاں کہہ دو صرف ایک بار ہاں کہہ دو۔“

وہ خاموش کھڑی اپنے دل کی دھڑکنیں گنتی رہی۔ ابھی ابھی ایرپیس پر ایک گہرے سانس کی آواز ابھیر تھی۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی وہ سانس آذر کا نہیں تھا۔ وہ گہرا بوجھل سانس کس شخص کا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ ریسورڈونوں ہاتھوں سے پکڑ کر وہ بے حس و حرکت کھڑی رہ گئی۔

”اجالا۔ اجالا۔ اجالا۔“

ایرپیس سے آذر کی آواز نکل کر اس کے ارد گرد پھیل رہی تھی۔

لرزتے، کانپتے وجود کے ساتھ وہ کمرے میں آئی تھی۔ وہ تکیوں کے سہارے بستر پر نیم دراز تھا۔ بہت دیر تک صوفشاں اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ چہرہ کسی کتاب کی سادہ جلدی کی طرح تھا۔ کوئی حرف کوئی لفظ ایسا تحریر نہ تھا جس سے وہ کچھ معنی اخذ کر پاتی وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں کن کن خیالوں کا عکس تھا۔ اسے قطعاً علم نہ ہو سکا۔

”کیا انہوں نے وہ باتیں سن لی ہیں؟“

”درزدیدہ نظروں سے اس نے عالم شاہ کے برابر رکھے کارڈلیس کو دیکھا۔“

”عالم شاہ۔“ بالآخر اس نے قریب آکر اسے مخاطب کیا۔

اس نے گہرا سانس آزاد کرتے ہوئے نگاہوں کا زاویہ بدلا اور اس کے چہرے پر نظر جمادی۔

”کھانا لاؤں؟“ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”نہیں۔“ وہ زیر لب بولا۔

”سوپ پی لیں، میں نے خود بنایا ہے آپ کے لیے۔“ اس نے نرم لہجہ میں کہا۔

”ابھی نہیں۔“ اس نے سر پیچھے لٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“

”تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ اس نے آنکھیں بند کیے کیے پوچھا ”وہ کون سی سوچ ہے جس کے بارے میں تم جاننا چاہتی ہو؟“

اس کے چہرے کی طرح اس کا لہجہ بھی بالکل سٹ تھا کوئی ایسا تاثر نہ تھا جس سے وہ اس کے موڈ کا اندازہ لگا پاتی۔

”میں آپ کی ہر سوچ کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔“ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور ایک ٹک اسے

دیکھنے لگا۔

”روشنی۔“

”جی کہیے۔“

”ادھر دیکھو میری طرف..... میری آنکھوں میں۔“

اس سے نظریں ملانے میں صوفشاں کو ہمیشہ جھک محسوس ہوا کرتی تھی تاہم اس کے کہنے پر وہ اس کی جانب دیکھنے لگی۔ چند لمحے گزر گئے وہ

اسی طرح اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں ایسے؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔

”سنا ہے آنکھوں میں جتنے بادل ہوتے ہیں وہ دل کے سمندر کے پانیوں سے بنتے ہیں، میں ان بادلوں کا رنگ دیکھ رہا ہوں۔“

”پھر؟ کیا رنگ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ اس نے آذر کی سے نظروں کا زاویہ بدلا ”پڑھنے والی نظریں بھی تو غیر جانبدار ہونی چاہئیں ناں، یہ دل تو ہمیشہ اپنی ہی

کہتا ہے۔“

”جو کچھ دل کہتا ہے اس پر یقین نہ کرنے کی وجہ؟“

”وہ چند حرف جو کسی لمحہ غیر موجود میں ہیں جو نہ کبھی کہے گئے نہ سنے گئے۔ یہ دل ان الفاظ پر یقین کرنا چاہتا ہے روشنی میں کیسے مان لوں

اس کی بات۔“

اس کے لہجے میں دکھوں کا سمندر موجزن تھا ان آنسوؤں کی نمی تھی جن کا اس کی آنکھوں میں آنا تو شاید ناممکن تھا۔ ہاں وہ اس کے اندر کہیں گر رہے تھے۔

”اس حادثے نے آپ کو کیا بنا دیا ہے عالم۔“ وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”آپ ایسے تو کبھی نہ تھے، کبھی آپ نے ایسی باتیں نہیں کیں، آپ کو تو اپنی ذات پر، اپنی محبتوں پر ایمان کی حد تک یقین تھا، یہ یقین آج متزلزل کیوں ہے عالم۔“

”یہ جو حادثے ہوتے ہیں ناں روشنی یہ بڑے رہنما ہوتے ہیں۔ انسان کے شعور کو آگہی کی اس منزل تک لے جاتے ہیں جہاں عام حالات میں جانا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ انسان اپنے آپ کو یوں سرنگوں پاتا ہے کہ اس کی ذات کا تمام غرور، ساری اکڑ خاک ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں لیکن جو کچھ اس بیماری کے درمیان مجھ پر منکشف ہوا ہے اسے تا عمر فراموش نہ کر سکوں گا۔“

”یہ سب کچھ آپ کے لیے تکلیف دہ ہے۔“

”ہاں، بے حد تکلیف دہ، خامیوں کا احساس ہونا خوشگوار کیسے ہو سکتا ہے روشنی؟“

”لیکن ایک خوشی اس بات کی بھی تو ہوتی ہے کہ ان خامیوں کا احساس ہونا، خامیوں سے نجات پالنے کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔“

”خامیوں سے نجات۔“ وہ تمنی سے ہنسا۔ ”کب ملتی ہے روشنی؟ ہاں، زندگی سے نجات ممکن ہے، اس کے غموں اور دکھوں سے نجات ممکن

ہے۔“

”خدا جانے کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔“ وہ زچ ہو گئی۔ ”میں آپ کے لیے کھانا لاتی ہوں۔ وہ اُنھنے لگی لیکن اس کا ہاتھ عالم شاہ کے

ہاتھ کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکا۔

”مت جاؤ روشنی میرے پاس بیٹھی رہو۔“ اس کے انداز میں منت تھی۔ ”میں نہیں چاہتا تم میرے پاس سے جاؤ تمہیں دیکھتے رہنا چاہتا

ہوں، تمہیں محسوس کرتے رہنا چاہتا ہوں تا عمر۔“

خوفشاں نے چونک کر اسے دیکھا، اس جملے کے پیچھے کون سے معنی پوشیدہ تھے۔ اس نے درحقیقت کیا پوچھا تھا اسے کس وہم نے پریشان

کر رکھا تھا، وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”میں کچھ پوچھ رہا ہوں روشنی۔“ اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”مجھے چھوڑ کر چلی تو نہ جاؤ گی۔“

”کہاں جاسکتی ہوں میں آپ کو چھوڑ کر آپ ہی بتائیں؟“ وہ ذرا خفگی سے پوچھنے لگی۔

”ناراض ہو گئیں؟“ وہ کسی بچے کی طرح بولا۔ ”ناراض مت ہو روشنی اچھا چلو، وہ سوپ لے آؤ جو تم نے میرے لیے بنایا ہے۔“

”میں خیر اس سے کہہ کر منگوالیتی ہوں۔“ وہ ہنسی۔

”آپ میرا ہاتھ چھوڑیں گے تو جاؤں گی ناں۔“



”روشنی۔“ کتاب پڑھتے پڑھتے اس نے اچانک پکارا تھا۔

”جی؟“ اس نے اچانک کر سر اٹھایا۔ وہ منگ میں مصروف تھی۔

”ایک بات تو بتاؤ۔“ اس نے کتاب بند کر کے سائینڈ میں رکھ دی۔

”پوچھیے؟“ اس کے ہاتھ پھر سلاخیوں کو چلانے لگے۔

”کہتے ہیں عورت اپنی پہلی محبت کو تا عمر نہیں بھولتی۔ کیا درست ہے؟“

اس کے ہاتھ تھم گئے، عالم شاہ کی دماغی رواب مسلسل ایک سمت میں بہا کرتی تھی۔ اس نے گہرا سانس بھر اور نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ایک بات پہلے آپ مجھے بتائیں عالم، آپ نے زندگی میں سب سے پہلی محبت کس سے کی؟“

”تم سے۔“ وہ کھل کر مسکرایا ”پہلی محبت، ہاں آخری محبت کسی اور سے کروں گا۔“

ضوفشاں کی آنکھوں میں بے یقینی کی پرچھائیں نمودار ہوئی۔

”کیا؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”میں نے کہا پہلی محبت تم سے کی ہے البتہ آخری محبت کسی اور سے کروں گا۔“

”کس سے۔“ وہ حد درجہ متعجب تھی۔

”وہ جو تمہارا دوسرا روپ ہوگی اس سے، اپنی بیٹی سے۔“ وہ ہنس دیا۔

وہ چند لمحے بیٹھی رہی، پھر خود بھی ہنس دی۔

”آپ کو کیا خبر کہ وہ بیٹی ہی ہوگی۔ بیٹا بھی تو ہو سکتا ہے ناں۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا ”وہ بیٹی ہی ہوگی یقیناً جیسی، چاند مجھے اجلی، معصوم تمہارا دوسرا روپ، شاید میں اسے اتنا چاہوں گا،

جتنا میں تمہیں بھی نہیں چاہا، لیکن تم کیا پوچھ رہی تھیں؟“

”میں پوچھ رہی تھی کہ فرض کیجیے، میں اور آپ جدا ہو جائیں۔“

”روشنی۔“

”فرض کیجئے ناں۔“ وہ بولتی گئی۔ ”یا ایسا ہو کہ آپ کسی اور سے شادی کر لیں، کئی سال گزر جائیں تو کیا آپ بھول جائیں گے مجھے؟“

”نہیں۔“ وہ خفا سا تھا اس کی بات پر۔

”کبھی بھی نہیں؟“

”آخری سانس تک نہیں۔“

”پھر؟ یہ پہلی اور آخری محبت کا طعنہ عورت کے حصے میں کیوں آتا ہے؟ اور میں پوچھتی ہوں یہ فلسفہ کون جھاڑتا ہے کہ فلاں شے، فلاں

جذبہ عورت سے مشروط اور فلاں مرد انسانی جذبات اور احساسات تو جنس کی تخصیص کے بغیر ایک سے ہوتے ہیں، عالم کا نپا چبھے تو تکلیف دونوں کو

ہوتی ہے۔ آرام پا کر دونوں خوش ہوتے ہیں پھر یہ کیا بات ہے کہ فلاں بات عورت نہیں بھولتی، فلاں کام مرد نہیں کرتا، منہ بنا کر، ہاتھ ہلا کر اس نے

تقریر جھاڑی۔

وہ بے اختیار زور سے ہنسا تھا اور پھر کافی دیر تک ہنستا رہا۔ ضوفشاں نے اپنی ازدواجی زندگی کے دوران اسے بہت کم ہنستے ہوئے دیکھا

تھا۔ عموماً وہ محض مسکراتا یا ہولے سے ہنس دیتا تھا۔ اس طرح بے اختیار ہنستے ہوئے وہ اسے بہت الگ، بہت اچھا لگا وہ نگاہ جمائے اسے دیکھتی رہی۔

”اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات ہے بھلا؟“ پھر وہ مسکرا کر پوچھنے لگی۔

”پتا ہے روشنی! آج پہلی بار تم مجھے بیوی لگی ہو سرتاپا ”بیوی“ چڑ کر جھلا کر جس طرح تم نے مسلسل بولتے ہوئے اپنی بات مکمل کی ہے، وہ

محض ایک بیوی کا ہی خاصہ ہو سکتا ہے، کتنی اچھی لگی ہو مجھے تم، تم شاید تصور بھی نہ کر سکو۔“

وہ مسکرا دی، سر جھکا کر دوبارہ سلائیاں چلانے لگی۔

”سنو، مکرم علی کو بلاؤ، میں ادھر تمہارے پاس بیٹھنا چاہتا ہوں۔“
 ضوفشاں نے ہٹن پٹن کر دیا۔ چند لمحوں میں ہی مکرم علی حاضر تھا۔
 ”مکرم علی۔“ وہ اسے تکیوں کے سہارے بٹھارہا تھا جب عالم شاہ نے اسے پکارا۔
 ”حاضر سائیں حکم۔“

”تم اپنی پسند سے شادی کی ہے ناں؟“
 وہ مسکرا دیا سر جھکائے کھڑا رہا۔
 ”بولو ناں مکرم۔“

”جی سائیں۔“ وہ ہولے سے ہنسا ”آپ نے دیکھا ہے ناں بیگماں کو۔“
 ”اچھا یہ بتاؤ اب کبھی تمہیں اپنی بیوی میں اپنی محبوبہ کی جھلک نظر آتی ہے۔“ مکرم علی ہنسا۔
 ”نہیں شاہ جی اب تو بالکل بدل گئی ہے۔“

”پتا ہے مکرم علی، مجھے اپنی محبوبہ میں بس کبھی کبھی بیوی کی جھلک نظر آتی ہے۔“ اس کا لہجہ شگفتہ اور شرارتی تھا۔
 مکرم علی مسکراتا رہا۔ ضوفشاں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”بس مکرم علی شکریہ۔“ پھر وہ بولی ”اب تم جاؤ۔“
 ”جی بی بی صاحبہ۔“ وہ مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔

”دل کی باتیں کرنے کے لیے مکرم علی ہی دستیاب ہوا آپ کو؟“ وہ کچھ خفگی سے بولی ”کیا سوچتا ہو گا وہ۔“
 ”مکرم علی۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”تم مکرم علی کے سوچنے کی بات کر رہی ہو، ارے جان عالم بڑی بھولی ہو تم، مکرم علی محض ایک جسم کا نام ہے۔ دماغ تو اس کے پاس ہے ہی نہیں، وہ سوچ ہی کیسے سکتا ہے۔“
 ”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔“ وہ چڑی۔

”ٹھیک کہہ رہا ہوں کبھی آزمایا مکرم علی کو ایک روبوٹ ہے جسے محض اتنا علم ہے کہ اسے میرے اشاروں پر چلنا ہے، میں کہوں مکرم علی ہنسو تو وہ لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر ہنسنے لگے گا۔ اگلے ہی لمحے میں اسے رونے کا حکم دوں تو وہ مگر مجھ کے سے موٹے موٹے آنسو بہانے لگے گا۔“
 اسے ہنسی آگئی۔

”کہاں سے مل گیا یہ روبوٹ آپ کو؟“

”تقدیر سے۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا ”یہ جو میری اس ہتھیلی پر سیدھی، گہری قسمت کی لکیر بڑی شان سے دوڑتی نظر آتی ہے ناں، روشنی اس کے محض دو مقام ایسے ہیں جن کی بنا پر میں خود کو خوش قسمت خیال کرتا ہوں، ایک وہ جہاں تمہارا نام لکھا ہے اور دوسرا مقام جہاں سے مجھے مکرم علی ملا وہ خود کو محض میرا ایک ادنی غلام خیال کرتا ہے لیکن میں اسے اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ سمجھتا ہوں۔“
 ”کب سے ساتھ ہے یہ آپ کے؟“

”بچپن سے۔“ وہ مسکرایا ”عمر میں یہ مجھ سے دو سال بڑا ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا مکرم علی کو اپنی ہمراہی میں پایا ہے دراصل یہ جو ہمارے ملازمین ہیں ناں یہ سب ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیشہ سے ان کا خاندان ہمارے خاندان کا تابع چلا آ رہا ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا، یہاں کا ہر ملازم ایک دوسرے سے تعلق رکھتا ہے۔ رشتے دار ہیں یہ سب آپس میں، ہمارے ہاں باہر کے کسی شخص کو نوکری نہیں رکھا جاتا، یہاں جتنے ملازم ہیں سب ہمارے آبائی گاؤں سے یہاں آئے ہیں جب میں پیدا ہوا تھا ناں تو بابا سائیں نے مکرم علی کو میرا خاص ملازم بنایا تھا۔ ہر چند کہ وہ خود اس وقت محض دو سال کا تھا۔ ہم ساتھ ساتھ بڑھتے گئے۔ مجھے تو بابا سائیں کے فیصلے کا کوئی خاص احساس نہ ہوا لیکن مکرم علی کے ذہن میں یہ بات

نجانے کس نے کس طرح ہٹھادی کہ اب وہ میرے بنارہ ہی نہیں سکتا۔ میری تمام آیائیں تو مفت کی روٹیاں کھاتی تھیں۔ مجھے تو درحقیقت مکرم نے پالا ہے، وہ کسی بزرگ کی طرح شفیق، دوست کی طرح غمگسار اور کسی ادنیٰ غلام کی طرح میرا تابع ہے کیا ایسا شخص فی زمانہ دستیاب ہونا قسمت کی مہربانی نہیں۔“

وہ غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی مسکرا دی۔

”بڑی محبت ہے آپ کو مکرم علی سے، اتنی تعریفیں تو شاید آپ نے کبھی میری نہ کی ہوں گی۔“

”تمہاری کیا تعریف کروں روشنی۔“ وہ بڑے پیٹھے لہجے میں بولا تھا۔ ”تمہارے جلتے حسن کے آگے تو لفظوں کے چراغ مدھم پڑ جاتے

ہیں۔“

وہ دوبارہ سلائیوں کی جانب متوجہ ہو گئی مگر ڈائریجن بھول گئی، سر جھٹک کر مسکرائی پھر ہنس دی۔

”آج تو تم بڑی خوش لگتی ہو۔“ وہ اس کے بالکل قریب بیٹھا بڑی محبتوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آج، آپ بھی تو خوش لگتے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”تو میں یہ سمجھوں کہ میری خوشی تمہاری خوشی ہے؟“

اس کے لہجے میں آرزوؤں کے دیئے جھلملائے۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر فون کی بیل بج اٹھی تھی۔

اس نے سائیڈ میں رکھے فون پر ہاتھ رکھا مگر اس سے قبل ریسپور اٹھاتی اس کے ہاتھ پر عالم شاہ کا مضبوط ہاتھ آ گیا۔

”تم رہنے دو، میں اٹھا تا ہوں۔“

اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

”ہیلو..... عالم شاہ بول رہا ہوں۔“ وہ ریسپور کان سے لگا کر بولا۔

صوفی شاہ بے ارادہ اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ واضح طور پر بدلا تھا، اس کی آنکھوں میں جھمکاتی

لودھم ہو گئی تھی۔

کچھ کہے بنا خاموشی سے اس نے ریسپور سے تھما دیا۔

”ہیلو۔“ وہ سمجھ گئی تھی دوسری جانب کون تھا۔

”اجالا، میں آذر ہوں۔“

”ہاں معلوم ہے مجھے، کہو۔“ اس نے لہجے کو حتی الامکان بے تاثر اور پرسکون رکھا۔

”اجالا اس دن بغیر کچھ کہے تم نے فون بند کیوں کیا تھا میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔“

”اس لیے کہ۔“ وہ لمحہ بھر کو رکی ”اس لیے کہ ان باتوں کا کوئی جواب ہو بھی نہیں سکتا تھا۔“

”اجالا، کیوں برباد کر رہی ہو یہ زندگی، کیا سات جنموں پر یقین رکھتی ہو کہ اگر ایک برباد ہو بھی گیا تو کیا اگلا جہنم خوبصورت بنالیں

گے۔ اجالا، یہ زندگی ایک بار ملتی ہے اسے ضائع مت کرو۔“

وہ پریشان ہو گئی آذر کو علم نہ تھا کہ وہ اس وقت عالم شاہ کے پہلو سے لگی بیٹھی ہے۔ اس کے اس قدر قریب تھی کہ اس کی سانسوں کو اپنے

وجود سے ٹکراتا محسوس کر رہی تھی۔ ایسے میں یہ بھی ممکن تھا کہ آذر کی آواز وہ بھی سن رہا ہو۔

”آذر۔“ اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا کہے۔

”ہاں، کہو! آج برسوں بعد تمہارے شیریں لبوں سے یہ نام واقعی اپنا لگا ہے۔“

اس نے کن آنکھوں سے دیکھا وہ بے نیازی سے اس کے بنائے سویٹر کے ڈیزائن کو دیکھ رہا تھا۔

”آذر میرا خیال ہے کہ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔“ اس نے بات بنانی چاہی۔

”نہیں اجالا! ابھی دیر نہیں ہوئی تم بس اتنا کہو کہ تم مجھے چاہتی ہو، تمہیں میرے قرب کی خواہش ہے اور تم اس پاگل خانے سے رہائی چاہتی ہو، بس تم ایک بار صرف ہاں کہو۔“ عالم شاہ نے اس کا دوسرا ہاتھ تھام لیا اور اس کی انگلی میں پڑی انگوٹھی کو گھمانے لگا اس کے اپنے ہاتھوں میں ایک خفیف سی لرزش تھی۔ ایک اضطراب تھا جسے وہ محسوس کر سکتی تھی۔

”آذر..... مجھے کچھ کام ہے پھر بات کریں گے۔“

”میں آجاؤں؟“ اس نے بے تابلی سے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ بے طرح گھبرا گئی ”میں خود آؤں گی۔“

”یکلخت عالم شاہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ یا شاید خود بخود چھوٹ گیا تھا۔

”کب آؤ گی اجالا۔“ ادھر وہ بہت بے تاب تھا ”مجھے وقت بتاؤ۔“

”کل، میں کل آؤں گی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”میں انتظار کروں گا دل و جان کی تمام تر شدتوں سے۔“

”خدا حافظ۔“

اس نے آہستگی سے ریسیور رکھ دیا۔ عالم شاہ کے بے جان ہاتھوں سے اوئی سلاخیاں اور اون کا گولہ نکالا اور ایک عجب اضطراب کے عالم میں پھندے گننے لگی۔ نبجانے سویٹر واقعی غلط بن گیا تھا یا اس ذہنی الجھن کے عالم میں اسے لگا۔ اس نے سلاخیاں نکالیں اور سویٹر اذھیڑنے لگی۔

”روشنی۔“

”جی.....؟“ وہ چونکی۔

”انسانی زندگی اور اس اون کے گولے میں کتنا فرق ہوتا ہے ناں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حد درجہ متعجب ہوئی۔

”دیکھو ناں، اسے بن کر ایک شکل دو، پھر اذھیڑ دو، نئے سرے سے بن لو کسی نئے نمونے کے مطابق وہ پسند نہ آئے تو پھر اذھیڑ لو، لیکن انسان کی زندگی کا تانا بانا ایک بار جس طرح بن گیا سو بن گیا پھر بار بار بدلاتو نہیں جاسکتا ناں۔“

”جی!“ اس نے گہرا سانس لیا ”درست کہتے ہیں آپ۔“

”پھر بعض لوگ اپنی زندگی کو نئی نئی شکلیں کیوں دینے کے درپے ہیں؟“

”مطمئن نہیں ہوتے ناں زندگی کی شکل سے اس لیے۔“

”تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو روشنی؟“

ضوفشاں نے اس کی جلتی بجھتی آنکھوں میں دیکھا اور مسکرا دی۔ پھر وہ انھی اور جا کر پردے برابر کرنے لگی۔



آتش گاہ بی بارڈر کی گہری زرد ساڑھی باندھ کر اس نے بالوں کا جوڑا بنایا اور لبوں پر گہری سی لپ اسٹک جمانے لگی۔

”کہیں جارہی ہو۔“ وہ نسخہ ہائے وفا کے صفحات پلٹ رہا تھا۔

”جی ہاں، ذرا آپا کی طرف جارہی ہوں۔“ وہ پرفیوم اسپرے کر رہی تھی۔

خود کو انتہائی بے نیاز ظاہر کرتے ہوئے اندر سے بالکل چور ہو رہی تھی۔

”میں خیر اس سے آپ کے کھانے اور دوائی کا کہہ کر جاؤں گی۔ جب وہ آئے تو پلیز اسے ڈانٹ کا بھگادینے کے بجائے کھانا کھا لیجئے گا، اور دوائی بھی۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ اس نے جیسے بے خیالی میں سر ہلایا۔

ضوفشاں نے آئینے میں اس کے عکس کو غور سے دیکھا ایک ورق وہ دائیں پلٹتا تھا، اگلے کئی صفحات بائیں طرف الٹ دیتا۔ کسی لفظ پر اس کی نگاہ جم ہی نہیں پار رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ بے نیاز صرف وہ ہی نہیں بن رہی تھی۔

”عالم۔“

”ہاں، کہو۔“

”میں جلد آ جاؤں گی۔“ وہ نرم لہجے میں بولی۔

عالم شاہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں نے کچھ کہا تو نہیں تم جتنی دیر رکنا چاہو رک جانا۔“

اچانک ہی اس کا من شرارتی ہوا۔

”سوچ لیں کیا کہہ رہے ہیں۔“

اس نے ایک سنجیدہ نگاہ اس پر کی اور واپس کتاب پڑھنے لگا۔

”اف خدا کچھ اور نہ سمجھیں۔“ دل ہی دل میں خود کو سرزنش کرتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”خدا حافظ عالم۔“ باہر نکلتے ہوئے وہ بولی تھی۔

”اللہ حافظ۔“ وہ بڑبڑایا۔

اس کے چلے جانے کے بعد اس نے تا دیر دروازے کو دیکھا پھر لب بھینچ کر کتاب کو تکیے پر کھینچ مارا۔



”ہیلو کرن۔“ وہ چائے پی رہا تھا۔ اسے دیکھ کر شگفتگی سے مسکرایا۔

”آذریہ کیا پاگل پن ہے۔“ وہ تھکے ہارے انداز میں بیٹھی تھی۔

”عشق، عشق، عشق۔“ وہ ہنسا ”ویسے یار بڑی زیادتی نہیں ہوئی ہمارے ساتھ؟“

”آذر۔“ وہ چند لمحے اسے گھورتی رہی ”میں قطعاً سنجیدہ ہوں۔“

”میں تمہیں مذاق کرتا نظر آتا ہوں۔“ اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کپ ایک طرف رکھ دیا۔

”اجالا زندگی نے اس قدر خطرناک مذاق کیا ہے میرے ساتھ کہ مجھے تو ہنستے ہوئے بھی خوف آتا ہے اور سچ پوچھو تو مجھ سے زیادہ بہادر تو تم

ہو کتنی آسانی سے سب گنیں سب کچھ، کسی کو بھٹک بھی نہ پڑنے دی۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو پاگل ہو جاتا چیخنے چلانے لگتا۔“

”بہر حال۔“ اس نے بات کاٹی تھی ”جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا، زندگی کو اون مت سمجھو کچھ غلط ہوا بھی ہے تو بس ہو گیا۔ اسے ادھیڑ کرنے

سرے سے بننے کی کوشش رکھنا حماقت ہے۔“

”جو کچھ نئے سرے سے شروع کیا جاسکتا ہے اسے آزمانے میں حرج بھی کیا ہے۔“

”پاگل مت بنو۔“ وہ غفلت سے بولی۔

”اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے؟ یہ بے لطف بے کیف زندگی کیا یونہی گزارتے چلے جائیں، یہ زندہ لاشے گھسیٹتے پھریں، اجالا خوشبو کے جگنو بھی ہماری پہنچ سے دور نہیں، اپنی خالی بند مٹھی کو کھولو اور ان کی طرف ہاتھ بڑھاؤ کیا خبر ہم انہیں قید ہی کر لیں۔“

”آذر، کیا یہ سب کچھ آسان سمجھتے ہو؟“ وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

”نہیں، بہت مشکل مگر ناممکن ہرگز نہیں۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ وہ زور دے کر بولی تھی ”قطعاً ناممکن، کوئی کھیل اس وقت کھیلنے والے راضی ہوں، میں اس کھیل میں تمہارا ساتھ ہرگز نہیں دے پاؤں گی۔“

”میں کوئی کھیل تو نہیں کھیل رہا اجالا۔“ وہ دکھ سے بولا۔ ”کھیل تو کھیلا تھا تمہارے سید عالم شاہ صاحب نے ایسا کھیل جو فیئر بھی نہیں تھا جس کے فیصلے غیر منصفانہ تھے اور ایسے غیر منصفانہ کہ ان کی سزا آج تک جاری ہے۔ میں کہاں کوئی کھیل کھیلنا چاہتا ہوں میں تو محض انصاف چاہتا ہوں اجالا۔“

”جب..... ایک بار کسی کو غلط فیصلے کی سولی پر چڑھا دیا جائے تو پھر اس کی لاش کو اتار کر اس میں نئی روح نہیں پھونکی جاسکتی آذر جو نہیں ہو سکتا اس کی تمنائے کرو۔“

اس کا لہجہ قطعی تھا۔ وہ اسے بے بسی سے تکتا رہ گیا۔

”ہاں، وہ اس روز والی بات ادھوری ہی رہ گئی تھی۔“ اچانک ضوفشاں کو خیال آیا ”آپا بتا رہی تھیں کہ پھوپھی اماں نے تمہاری ہونے والی دلہن کا انتخاب کر لیا ہے۔“

”میری ہونے والی دلہن کا انتخاب، میں نے اور امی نے مل کر کیا تھا۔“ اسے غور سے دیکھتے ہوئے وہ کہنے لگا ”لیکن ہوا یوں کہ وہ جس راستے پر چل دی وہ کہیں اور جاتا تھا اسے مجھ سے، میری تمناؤں سے بہت دور لے گیا لیکن کسی کے دور جانے سے یہ بے چاری تمنائیں مر تو نہیں جاتیں ناں، میں آج بھی اس کا ہی منتظر ہوں، شاید اسے صحیح راستہ بھائی دے جائے“ پھر وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”آذر۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

”خدا تمہیں صحیح راستہ بھائے۔“

وہ واپس لوٹی تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سیرھیاں چڑھتے ہوئے اس کا دماغ الجھا ہوا تھا۔

”خیراں، تمہارے شاہ صاحب نے کھانا کھایا تھا۔“ اس نے اوپر کمرے میں جانے کے بجائے کچن میں جا کر رات کے کھانے کی تیاری کرتی خیراں سے پوچھا۔

”جی بی بی صاحبہ! تھوڑا بہت کھالیا تھا۔“ اس نے عقلمند بننے ہوئے سر ہلایا ”ویسے آپ گھر پر نہ ہوں تو وہ دل سے نہیں کھاتے یونہی ایک دو نوالے لے کر چھوڑ دیتے ہیں۔“

”ہوں۔“ اس نے کسی گہری سوچ میں سر ہلایا۔ پھر چونک اٹھی ”اور دوائی کھائی تھی انہوں نے؟“

وہ مڑ کر کچن سے نکل آئی۔ منتشر دماغی سے سیرھیاں عبور کر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”عالم۔“ اندر داخل ہو کر اس نے اسے پکارا۔

آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ ہاتھ ہٹا کر اسے دیکھنے لگا۔

”سو گئے تھے؟“ وہ قریب آتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”نہیں۔“ اس نے گہرا سانس بھرا ”کر رہا تھا غم جہاں کا حساب۔“

”کل یونس صاحب آئیں گے آپ کا چیک اپ کرنے، یاد ہے ناں آپ کو؟“ اس نے جان بوجھ کر اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔

”تمہیں یاد ہے، بس کافی ہے میں یاد رکھ کر کیا کروں گا۔“

”کیوں، آپ کا جی نہیں چاہتا، جلد نھیک ہو جانے کو۔“

”جی کے چانے کی کیا بات کرتی ہو جان عالم۔“ وہ اداسی سے مسکرایا۔ ”یہ جی تو خدا جانے کیا کیا چاہتا ہے لیکن ہر خواہش کہاں پوری ہوتی ہے ہم تو وہ سیاہ نصیب ہیں کہ..... خیر جانے دو میں سوچ رہا تھا روشنی یہ جو بد نصیبی ہوتی ہے ناں ایک گول چکر کی طرح ہوتی ہے ایک جگہ سے شروع ہو تو پھر رکتی نہیں، ایک دائرے میں گھومتی ہی چلی جاتی ہے۔ پتا ہے میرے بابا سائیں جو تھے ناں، ان کی ٹانگیں ایک ایکسڈنٹ میں ضائع ہوئی تھیں۔ پھر بقیہ ساری عمر انہوں نے یونہی بستر پر گزار دی۔“

”خدا نہ کرے جو آپ کے ساتھ ایسا ہو۔“ وہ ناراض ہوئی ”کیوں ایسی باتیں کر کے میرا خون خشک کرتے ہیں آپ۔“

”شاید میں اذیت پسند ہوں۔“ وہ اداس لہجے میں بولا ”لیکن یقین کرو روشنی تمہیں تو میں ذرا سی تکلیف پہچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ کوشش کرتا ہوں کہ ان زہریلی سوچوں کے ڈسنے سے جو اذیت ہوتی ہے اسے خود تک محدود رکھوں لیکن دماغ کا بدن سے عجب رشتہ ہوتا ہے، پلک جھپکتے میں یہ زہر سارے بدن کی نرس میں رس جاتا ہے، پھر بھلا زبان کیسے محفوظ رہ سکتی ہے۔ اور زبان زہریلی ہو جائے تو الفاظ میٹھے کیسے نکلیں؟ میری مجبوری کو سمجھو روشنی، اور خفا مت ہوا کرو۔“

”یا خدا!“ وہ پریشان ہوئی ”عالم کبھی تو ان بے کار، جان جلانے والی سوچوں کے حلقے سے باہر نکل کر کچھ اور بھی سوچا کریں۔ اچھا چلیں، آج مجھے بتائیں وہ کون سے وہم ہیں جو اس قدر پریشان کر ڈالتے ہیں آپ کو۔“

”وہم نہیں، روشنی! حقیقتیں۔“ وہ مسکرایا ”کچھ حقیقتیں یوں روشن ہو گئی ہیں مجھ پر کہ میں بہت اندر تک خوفزدہ ہو گیا ہوں جزا اور سزا کا جو تصور ہے ناں وہ میرے دماغ کے پردے پر واضح ہو گیا ہے۔ کسی کو خوشی دو تو جواب میں خوشی، دکھ دو تو جواب میں دکھ، گلاب کا پودا لگاؤ تو گلاب، بول بوؤ تو کانٹے جھاڑ، یہ حقیقتیں کتنی دل افروز ہوں گی ان کے لیے جو خوشیاں دیتے ہیں گلاب بولتے ہیں، لیکن میں میں ڈر گیا ہوں، بے چین رہتا ہوں، روشنی! میں نے شاید ہی زندگی میں کسی کو خوشی دی ہو، شاید ہی مسکرا ہٹیں بانٹی ہوں لیکن تم“ وہ لمحہ بھر کو ”خدا جانتا ہے کہ میں تم کو کس قدر چاہتا ہوں زمانے بھر کی خوشیاں ڈھیر کر دینا چاہتا ہوں تمہارے قدموں میں اور تم میرے ساتھ ہو تو میں سزا بھی بھگت لینے کو تیار ہوں، اپنے اعمالوں کی، اپنے گناہوں کی، لیکن کیا تم میرا ساتھ دو گی روشنی؟“

”کتنی بار پوچھیں گے یہ سوال؟ کب تسلی ہو گی آپ کی۔“

”سنو روشنی۔“ اس نے اس کی بات کو نظر انداز کیا۔

”ایک بات ذہن میں رکھنا کبھی مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کر لو تو مجھے بتا کر کرنا جب مجھے تنہا چھوڑ کر جاؤ تو دن کے اجالے میں جانا۔ رات کے اندھیروں میں نہیں، دیکھو ناں، جدائیوں میں آخر کچھ وقار ہونا چاہیے۔“

”عالم۔“ وہ ایک سنائے میں رہ گئی۔

اس نے تکیے پر دائیں بائیں سر مارا اور ایک اذیت کے عالم میں آنکھیں موند لیں جیسے کرب کی سولی پر معلق ہو۔

”وہ تھوڑی دیر تک اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر انھی اور شیشے کا دروازہ کھول کر میسر پر آ گئی۔ ماربل کے ٹھنڈے فرش پر چند لمبے ننگے پاؤں کھڑی غائب دماغی کی کیفیت میں سیاہ بادلوں سے ڈھکے آسمان کو دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نیچے اترتے گول زینے کی سرچھیوں پر بیٹھ گئی۔ رینگ سے سر نکالے وہ الفاظ کے اس ہجوم میں کھونے لگی۔ جو اس کے ذہن میں ٹھانھیں مار رہا تھا۔

”میں نے ہمیشہ تمہاری خوشیوں کی آرزو کی ہے اجالا۔“ ایک آواز ”چاہتا تھا کہ تم سے نہ ملوں تاکہ تم مزید خوش رہو۔“

”خدا جانتا ہے کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں زمانے بھر کی خوشیاں ڈھیر کر دینا چاہتا ہوں تمہارے قدموں میں۔ پھر ایک اور آواز پہلی آواز سے ٹکرائی۔“

”میری خواہشوں کا تو ہمیشہ ایک ہی نام ہے تمہاری ہنسی تمہارا اطمینان، تمہاری خوشی۔“

”میرا جی چاہتا ہے کہ دنیا کی ہر شے باضابطہ طور پر تمہارے نام لکھ دوں، جو کچھ میں تمہارے لیے کرتا ہوں کیا تمہیں اس سے خوشی نہیں ہوتی روشنی؟“

”اب تم وہ کرو گی جو ہر کسی کو اس کی مسرتیں لوٹا دے۔ میرا یقین کرو اجالا، میں تمہیں وہ ساری خوشیاں لوٹاؤں گا جو ہم سے چھین لی گئیں۔“

”تو میں یہ سمجھوں کہ میری خوشی، تمہاری خوشی ہے؟“

”اجالا! خوشیوں کے جگنو ابھی ہماری پہنچ سے دور نہیں، اپنی خالی، بند مٹھی کو کھولو اور ان کی طرف ہاتھ بڑھاؤ کیا خبر ہم انہیں قید کر ہی لیں۔“

”انسانی زندگی کا تانا بانا ایک بار جس طرح بن گیا سو بن گیا اسے بار بار بدلاتو نہیں جاسکتا ناں۔“

”جو کچھ نئے سرے سے شروع کیا جاسکتا ہو اسے آزمانے میں حرج بھی نہیں ہے؟“

”مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی روشنی؟ دیکھو ناں جدائیوں میں بھی آخر کچھ وقار ہونا چاہیے مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی روشنی؟“

”نہیں۔“ کافی بلند آواز میں اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بڑی دیر تک وہ دماغ میں جگنوؤں کی طرح سے چلتے بچھتے الفاظ کی بازگشت کے تھمنے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر بالآخر سارے لفظ خاموش ہو گئے۔ اب وہ تھی اور نیچے دور تک پھیلے ہوئے لان کا سناٹا۔

اس نے سر اٹھا کر سیاہ بادلوں سے ڈھکے آسمان کو دیکھا پھر اٹھی اور آہستہ روی سے چلتی کمرے میں آ گئی۔

”عالم کھانا منگواؤں؟“ آہستگی سے اس نے پوچھا۔

دوسری جانب سے کوئی جواب نہ آنے پر اس نے مڑ کر دیکھا وہ لیٹے لیٹے سو گیا تھا دونوں ہاتھ سینے پر رکھے، گہری سانس نیند میں تھا وہ بنا آہٹ کیے اس تک آئی اور اسے غور سے دیکھنے لگی اسے احساس ہوا کہ وہ کس قدر گھل کر رہ گیا تھا خم دار پلکوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے تھے۔ لبوں کی سیاہیاں واضح ہو گئی تھیں۔

”یہ محبت میرے جیسے انسان کے بس کا روگ تو نہ تھی۔“

کبھی اس کے کہے ہوئے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

وہ آہستگی سے اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کی فراخ پیشانی پر بکھرے سیاہ بالوں کو ہولے سے سنوار کر پیچھے کیا۔

”مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی روشنی۔“

اس کی غرور سے اٹھی ستواں ناک کو دیکھتے ہوئے اس کا التجائیہ لہجہ اسے یاد آیا ایک مدھم، خوبصورت مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔ وہ ہولے سے جھکی اور اپنے لب اس کے کانوں کے قریب لے آئی۔

”نہیں۔“ اس نے ہولے سے سرگوشی کی اور مسکرا دی۔

وہ بدستور گہری نیند میں تھا۔



گنگناتے ہوئے اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور چاندی کی کنگھی گیلے بالوں میں پھیرنے لگی۔ ذرا سا رخ موڑ کر اس نے دیکھا۔ وہ آرام دہ کرسی پر دراز پر دے بٹائے، نیچے نظر آتے لان کو دیکھ رہا تھا۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے سے ہٹ کر دیوار میں بنے کیبنٹ تک آئی اور کیبٹیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد مغنی کی خوبصورت آواز کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجی۔

آج یوں موج در موج غم تھم گیا اس طرح غمزہوں کو قرار آ گیا جیسے خوشبوئے زلف بہار آگئی جیسے پیغام دیدار یاد آ گیا عالم شاہ نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے کسی سوچ میں گم مسکراتے دیکھا اور چند لمحے دیکھتا رہا۔ وہ دوبارہ آئینے کے سامنے آگئی اور بال سنوارنے لگی۔ اس کے اپنے لب بھی کمرے میں پھیلتی آواز کے ساتھ ہل رہے تھے۔

جس کی دید و طلب وہم سمجھے تھے ہم رو برو پھر سر رہزرا آ گیا صبح فردا کو پھر دل ترسنے لگا، عمر رفتہ تر اعتبار آ گیا وہ جتنی خوش نظر آرہی تھی اس کا دل اتنا ہی بے چین ہونے لگا ایک سکتے کے عالم میں وہ اس کی ایک ایک اداسے جھلکتی سرمستی کو دیکھ رہا تھا۔ فیض کیا جانے یاد کس آس پر منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر مے کشوں پر ہوا مختسب مہرباں، دلفگاروں پہ قاتل کو پیارا آ گیا وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ کر اس کے پاس آگئی۔

”کیا سوچ رہے ہیں۔“ اس نے عالم شاہ کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔ اس نے چونک کر پاس کھڑی صوفیاں کو دیکھا سیاہ قمیص اور سرخ اور سیاہ چنری کے دوپٹے میں وہ بے حد حسین نظر آرہی تھی۔ ”سوچ رہا ہوں آج تم خوش ہو اس لیے اتنی حسین نظر آتی ہو یا آج اتنی حسین نظر آنے پر خوش ہو یا اس بے تحاشا خوشی کا منبع کچھ اور ہے“ اس کا لہجہ نارمل تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”شاید تینوں باتوں ہی درست ہیں، ویسے عالم ایک بات ہے، تعریف کے الفاظ میں محبت کی خوشبو نہ ہو تو بات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے، ہے ناں۔“

وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا زندگی میں اس سے پہلی ملاقات سے لے کر اب تک یہ پہلا موقع تھا جب اس نے اس طرح کھلکھلا کر ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔

”تینوں۔“ پھر وہ گہری سانس بھر کر بولا ”یعنی آخری بات بھی درست ہے۔“ ”جی۔“ وہ شرارت سے بولی اور مڑ کر کیبنٹ کے پاس گئی ڈیک آف کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ بڑی دیر تک فضاؤں میں گھورتا رہا۔

جس کی دید و طلب وہم سمجھے تھے ہم رو برو پھر سر رہزرا آ گیا صبح فردا کو پھر دل ترسنے لگا، عمر رفتہ تر اعتبار آ گیا اس کے کانوں میں مغنی کی آواز اب تک گونج رہی تھی۔ اس کی منھیاں خود بخود بخند و خنکی سے بند ہوئیں لب بھنچ گئے، آنکھوں میں سرخی اور وحشت اتر آئی۔



”روشنی۔“

”جی۔“ اس نے لقمہ بنا کر اس کی جانب بڑھایا۔

”بس۔“ اس نے اس کا ہاتھ ایک طرف کر دیا ”میں کہہ رہا ہوں کہ شاید مجھے چیک اپ کے لیے باہر جانا پڑ جائے ڈاکٹر یونس سے میری تفصیلی بات ہوئی ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ وہ کچھ دیر سوچ کر بولی ”میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔“

”نہیں۔“ وہ بولا ”میرا مطلب ہے تمہاری طبیعت آج کل ویسے بھی ٹھیک نہیں رہتی، تمہارا جانا ضروری بھی نہیں اور ویسے بھی ہفتہ بھر کی بات ہے۔“

”اچھا، پھر مکرملی کو ساتھ لے کر جائیں۔“ وہ پلٹیں ٹرائی میں رکھنے لگی۔

”مکرملی یہیں رہے گا تمہارے پاس۔“

”مجھے کیا کام ہے مکرملی سے۔“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔ ”آپ کو اس کی زیادہ ضرورت۔“

”جیسا میں کہو، اسے مان جایا کرو روشنی۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی سختی در آئی۔

ضوفنشاں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا پچھلے کئی دنوں سے وہ اسے کچھ بدلا بدلا سا محسوس کر رہی تھی۔ اس کا رویہ اکھڑا اکھڑا تھا۔ الفاظ تنے تنے سے تھے لہجہ اکثر تلخ ہو جاتا تھا۔

”کتنے دنوں سے آپ نے کوئی کتاب بھی نہیں پڑھی۔“ وہ بات بدلنے کی خاطر آہستگی سے بولی۔

”اس طرح لیٹے لیٹے تلخ ہو جاتے ہیں آپ۔“

”تب ہی تو جانے کی ہانی بھری ہے میں نے۔“ اس نے تکیے سے سر نکال لیا ”ماحول بدلے گا تو طبیعت پر خوشگوار اثر پڑے گا۔“

”اور مجھے ساتھ کیوں نہیں جانا چاہیے۔“ اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”کچھ دنوں کے لیے تم سے دور رہ کر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ ہولے سے بولا۔

”بیزار ہو گئے ہیں مجھ سے؟“

”بیوی سے کون بیزار نہیں ہوتا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

وہ زور سے ہنس دی۔

”چلیں، درست ہے، اچھا ہے آپ کو بھی کچھ احساس ہو جائے ہماری اہمیت کا۔“

وہ غٹفٹگی سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پھر کب جانا ہے آپ نے؟“

”تم چاہتی ہو میں نہ جاؤں؟“ اس نے اچانک پوچھا۔

”ہائیں، میں نے کب یہ کہا۔“ وہ متعجب ہوئی ”میں تو چاہتی ہوں آپ جلد از جلد جائیں“ عالم شاہ نے غور سے اسے دیکھا۔

”میں چاہتی ہوں جلد سے جلدی سارے مراحل طے ہوں۔“ وہ چیزیں سمیٹنے کے دوران گفتگو کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھی۔

”مثلاً کون سے مراحل۔“ اس پر نگاہ جمائے جمائے وہ بولا تھا۔

”آپ کا چیک اپ، آپریشن اور صحت یابی۔“ وہ مسکرائی۔

وہ کچھ الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھتا رہا یہاں تک وہ ٹرائی کھینچتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی، نچلا ہونٹ دانٹوں سے چلتا ہوا وہ گہری سوچ میں تھا۔



سنگی بچ پر وہ دونوں پاؤں اوپر کیے بیٹھی تھی۔ گھٹنوں کو بازوؤں کے حصار میں لیے ٹھوڑی جمائے وہ فواروں سے پھوٹے شفاف پانیوں کو

سنگ مرمر کی ناکوں پر سفید جھاگ کی صورت بکھرتے دیکھ رہی تھی۔

آرام کرسی پر نیم دراز سید عالم شاہ نے ڈوری کھینچی تو پردہ سمٹ گیا۔ نیچے پھیلے سرسبز لان کا منظر واضح ہو گیا۔ گہری سبز گھاس کے دوران کھلتے ہوئے لال رنگ کے لباس میں ملبوس اس کا وجود کسی پھول کی مانند خوبصورت اور تروتازہ لگ رہا تھا سفید سٹی بنچ پر بیٹھی وہ اوپر سے یوں نظر آئی تھی جیسے ایک حسین رتھ پر ایک معصوم پری جلوہ گر ہو، وہ بڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔

دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہونے والا شخص مکرم علی تھا۔

”سائیں، یاد کیا تھا آپ نے۔“

”کون؟“ وہ گہری محویت سے باہر آیا ”مکرم علی! آگئے تم۔“

”جی سائیں حکم۔“

”مکرم، کل شام کی فلائٹ سے میں امریکا جا رہا ہوں۔ وہاں ڈاکٹروں کی ٹیم میرا چیک اپ کرے گی ڈاکٹر یونس میرے ساتھ ہوں

گئے۔“

”جی سائیں خدا آپ کو صحت دے۔“

”تمہاری بی بی صاحبہ یہاں اکیلی ہوں گی ان کا خیال رکھنا، تمہاری ذمہ داری ہے۔“

”جان حاضر ہے سائیں۔“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا دیا۔

عالم شاہ نے گرد موڑی اور ایک نظر نیچے دیکھا۔ وہ اب کھڑی ہو گئی تھی۔ ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔

”مکرم علی۔“ اس کی آواز میں بے حد گہرا پن تھا۔

”اس کے علاوہ بھی ایک کام ہے جو تمہارے سپرد ہے۔“

”حکم سائیں۔“ اس نے ایک نگاہ اپنے مالک کے بے حد تنے ہوئے چہرے پر ڈالی۔

”تمہاری بی بی صاحبہ کہاں کہاں جاتی ہیں، کس کس سے ملتی ہیں۔ یہاں کون کون آتا ہے، اور وہ فون پر کس سے کیا باتیں کرتی ہیں، تمہیں

ان تمام باتوں کا مکمل ریکارڈ رکھنا ہے مکرم علی۔“

”وہ چند لمبے خاموش کھڑا رہا۔“

”سن رہے ہو مکرم؟“

”جی سائیں۔“ اس کی آواز مدہم تھی۔

”اس طرح کہ ان کو رتی برابر شک نہ ہونے پائے کہ ان کی نگرانی ہو رہی ہے اور تمہارے لیے وہ ہر صورت قابل احترام اور قابل عزت

رہیں گی خواہ تم انہیں کسی سے بھی ملتے ہوئے کچھ بھی کہتے ہوئے سنو۔“

”سائیں۔“ اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا جیسے اپنی خوب صورت و خوب سیرت مالکین کے لیے ان الفاظ کا انتخاب اس کے لیے

بہت ہی تکلیف دہ ہو۔

”جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے غور سے سن لو مکرم، یہ وہ معاملہ ہے جہاں تمہاری رتی برابر غفلت بھی قابل معافی نہ ہوگی، وہ جب فون پر گفتگو

کریں تمہیں وہ گفتگو ریکارڈ کرنی ہے، یہاں جو شخص بھی آئے اور جہاں بھی بیٹھے، ان دونوں کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو تمہیں لفظ بہ لفظ مجھے

بتانی ہے سمجھ رہے ہو۔“

”جی سائیں۔“

”میں ہفتہ، دس دن میں لوٹ آؤں گا مکرم خیال رکھنا تمہاری بی بی صاحبہ کو کوئی تکلیف نہ ہو، ان کی کہی ہر بات کو پورا کرنا۔“

”مکرم علی کو آپ کہیں غافل نہیں پائیں گے سائیں۔“

”ہوں اب تم جاسکتے ہو مکرم۔“

اس کے چلے جانے کے بعد بھی وہ دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر ایک نگاہ شیشے کی دیوار کے پار ڈالی۔

”کبھی کبھی اپنی اپنی سوچی ہوئی بات کو کس سختی سے روک رہے کو جی چاہتا ہے۔“ کرسی کے ہتھے پر اس کے ہاتھ کی گرفت بڑھنے لگی ”خدا

کرے کہ میں نے غلط سوچا ہو خدا کرے۔“



اسے گئے ہوئے تین دن ہو گئے تھے

”پیر، منگل، بدھ۔“ بے خیالی میں وہ انگلیوں پر گن رہی تھی ”ایک، دو، تین اوں ہوں پیر کی صبح سے بدھ کی شام تین، تین دن بنتے ہیں۔“

بے کلی سے پہلو بدل کر وہ دروغروب ہوتے سورج کے دیکتے رنگوں کو آسمان پر بکھرتا دیکھنے لگی۔ انتظار کی اس کیفیت کی گہرائی میں کون سا جذبہ کارفرما تھا۔ وہ تعجب سے سوچنے دیکھنے لگی۔ کیا اس لیے کہ اس کے ساتھ مسلسل مصروف رہ کر اب اسے اس مصروفیت کی عادت ہو چکی تھی اور فارغ رہنے سے عجب بے چینی محسوس ہو رہی تھی یا اس لیے کہ ہاسٹل میں بھی روم میٹ کے کہیں چلے جانے سے ایک عجب خلا محسوس ہوتا ہے وہ تو پھر اس کا شوہر تھا..... یا.....

اس کی سوچ کی پرواز تھم گئی، اسے یوں لگا جیسے لمحہ بھر کے لیے اس کے دل کی دھڑکن بھی تھم گئی ہو۔

”کیا میں چاہنے لگی ہوں اسے؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے خود سے پوچھا تھا ”نہیں بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“

”مجھے یقین ہے روشنی، ایک دن تم ساری دنیا کو بھلا کر مجھے چاہو گی۔“

”میں تمہارے وجود کو اپنی محبتوں سے سینچ کر تمناؤں سے سنوار کر اس میں چاہتوں کے گل و گلزار کھلا دوں گا۔“

”یہ بات میں تمہارے لبوں سے سنوں گا لیکن دل اور دماغ کی مکمل ہم آہنگی کے ساتھ۔“ کیا اس کا دل بدل رہا تھا کیا اس کے دل کے بظاہر متناہی نظر آنے والے صحرا میں چاہتوں کی پہلی کوئیل پھوٹ نکلی تھی۔ کیا عالم شاہ نے اس تاج محل جیسے مقبرے میں داخل ہونے والا چور دروازہ ڈھونڈ نکالا ہے۔

فون کی بیل نے اسے اس کے خیالات کی دنیا سے باہر اکھڑا تھا۔

”عالم ہوں گے۔“

اس نے سوچا پھر جلدی سے اٹھ کر فون تک آئی۔

”ہیلو۔“ ریسپورڈاٹھا کر اس نے بے تابی سے کہا تھا۔

”اجالا، میں آذربات کر رہا ہوں۔“

”اوہ۔“ اس کے لبوں سے گہرا سانس برآمد ہوا۔

”ہاں آذربات کیسے ہو؟“

”کیا کر رہی ہو؟“

”فارغ ہوں۔“ وہ دھیرے سے ہنسی ”میرے پاس کرنے کے لیے ہے ہی کیا۔“

”ہاں بھئی، نوکروں کی فوج حاضر رہتی ہے تمہارا ہر کام پلک جھپکتے میں نبھانے کے لیے..... ویسے اگر اتنی ہی فالتو ہو تو ساری صلاحیتیں

سوچنے پر لگا دو۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسی ”مثلاً کیا سوچوں۔“

”مستقبل کے بارے میں اجالا۔“ اس کی آواز میں نرمی در آئی۔ ”اجالا پلیز سنجیدگی سے جلد کوئی فیصلہ کر لو۔“

”کیسا فیصلہ۔“ وہ بے نیاز بنی ”میں نے اس زور تمہیں ہر قسم کے فیصلوں سے آگاہ کر دیا تھا۔“

”تو تم اپنے فیصلوں پر قائم ہو۔“

”بالکل۔“

”سوچ لو اجالا تمہاری ساری زندگی کا معاملہ ہے۔“

”آذر ساری زندگی کی بات جب ہم کرتے ہیں ناں تو ہمیں خبر نہیں ہوتی کہ ہم سالوں اور مہینوں کی بات کر رہے ہیں یا محض چند لمحوں

کی۔“

”زندگی چند لمحوں کی ہی سہی، اسے غیر منصفانہ فیصلوں کی بھیٹ نہیں چڑھنا چاہیے ظلم کے خلاف احتجاج اور بغاوت کا سلسلہ جاری رہنا

چاہیے۔“

”آذر۔“ وہ عاجزی سے بولی۔ ”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب ہمارے درمیان اس موضوع پر مزید بات نہ ہو۔“

”اجالا، اجالا تم نہیں جان سکتیں۔ میں امید اور مایوسی کے کس برزخ میں معلق ہوں۔ آج سے چند سال پہلے جب تم نے مجھے جذائی کا

فیصلہ سنایا تھا تو میں نے بلا چون و چرا اسے تسلیم کر لیا تھا۔ احتجاج کا ایک لفظ زبان سے نہیں نکالا کیونکہ وہ تمہارا فیصلہ تھا لیکن آج جب کہ مجھے یہ علم

ہو چکا ہے کہ میری عمر بھر کی خوشیوں کو بیک جنبش قلم پامال کر دینے والا وہ فیصلہ کسی اور کے سفاک قلم کی نوک سے تحریر ہوا تھا تو اب اس سزا کو بھگتے چلے

جانا میرے لیے ناممکن ہے میں اب احتجاج کر سکتا ہوں، بغاوت کر سکتا ہوں، لیکن تم۔“ وہ تھک کر بولا۔ ”تم میرا ساتھ دینے سے کیوں انکار کر رہی

ہو، مجھے سچ سچ بتاؤ اجالا کیا آج بھی تمہاری زبان پر زبردستی کے پہرے ہیں؟“

”نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔ ”وہ فیصلہ بے شک میرا اپنا نہ تھا، لیکن یہ فیصلہ واقعی میرا اپنا ہے۔“

”میں ایک بار پھر تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟ اس اصرار سے تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا آذر۔“

”پھر بھی اجالا..... پلیز..... بس ایک بار۔“ وہ اتنی منت سے بول رہا تھا کہ اس سے انکار ممکن نہ رہا۔

”اچھا ٹھیک ہے“ وہ کچھ سوچ کر بولی ”میں کل آؤں گی۔“

”تھینک یو، تھینک یو، سوچ۔“ وہ ممنونیت سے بولا۔

اس نے ریسرور رکھا اور بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی آرام کرسی پر آ بیٹھی۔ ذرا سی گردن موڑ کر اس نے دیکھا ریک پر اس کی پسند کی

کتابیں ترتیب سے جچی ہوئی تھیں۔ ہاتھی دانت سے بنا ہوا سگریٹ کیس، خوبصورت لائٹر، کرسٹل ایش ٹرے۔ ہر ہر شے کی نفاست اور خوبصورتی میں

اسے سید عالم شاہ چھپا ہوا لگنے لگا۔

اسے خود پر حیرت ہونے لگی۔ وہ کون سے چور درہے تھے جو اس کی ذات میں یوں چپکے سے بنا کسی آہٹ کے کھلے تھے کہ اسے خود کو علم نہ

ہو سکا تھا۔

کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ نیم دراز ہو گئی، آنکھیں بند کر کے اپنے اندر ہر سو بکھرتے رنگوں کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ گہرا سانس

لے کر اسے احساس ہوا کہ کمرے کے اس مخصوص حصے میں عالم شاہ کی مہک بہت واضح تھی۔ ہر چند کہ وہ کبھی پر فیوم استعمال نہیں کرتا تھا۔ پھر بھی مہک

کا ایک خاص احساس تھا جو اسے محسوس ہوا کرتا تھا نجانے یہ اس کے صابن کی خوشبو تھی، شیوینگ کریم، سگریٹ کی یا ان سب چیزوں کی مشترکہ خوشبو

تھی۔ بہر حال اس مہک کے ساتھ عالم شاہ کا خیال وابستہ تھا۔ اور یہ مہک اس گھر کے ہر در و دیوار سے پھونکتی تھی۔

اس مہک کے گھر جانے سے اس کے اندر مچلتی بے چینیوں کو قرار آنے لگا۔ آنکھیں بند کیے کیے وہ نیند کی گہری اور پرسکون وادیوں میں اتر گئی۔

”مکرم علی میں آؤ آؤ پاکی طرف جارہی ہوں۔“ میڑھیاں اترتے ہوئے وہ پیچھے پیچھے آتے مکرم علی کو بتا رہی تھی ”تمہارے شاہ صاحب کا فون آئے تو ان سے کہنا مجھے وہاں رنگ کریں میں بات کروں گی ان سے۔“

”جی بی بی صاحبہ۔“ وہ ادب سے بولا۔

”انہوں نے فون کیوں نہیں کیا اب تک۔“ اس کے انداز میں عجب جھلاہٹ اتر آئی تھی ”کہیں ایسا تو نہیں میں سو رہی ہوں اور انہوں نے جگانے سے منع کر دیا ہو۔“

”نہیں بی بی صاحبہ ان کا کوئی فون آیا ہی نہیں۔“

”خیر، میں جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کروں گی، تم انہیں میرا پیج بہر حال دینا۔“

”جی ہاں۔“

اس نے آگے بڑھ کر اس کے لیے دروازہ کھولا اور سر جھکا کر باہر نکل گئی۔

پھوپھی اماں کے گھر کا منظر اس کے لیے غیر متوقع تھا وہاں سب جمع تھے۔ اماں، ابا، پھوپھا، ابا عاصم بھائی ہر کوئی گھر پر ہی تھا۔

”السلام علیکم۔“ اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

”یہاں تو رونق بکھری ہوئی ہے۔“

”وعلیکم السلام۔“ سب نے مشترکہ جواب دیا۔

”میری بچی۔“ اماں نے جس طرح سے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا وہ مشکلوک ہو گئی۔

”کیا ہوا اماں خیریت۔“

”ضوفا، تو اتنی بہادر ہے میں تو تجھے بہت بزدل، بہت کمزور سمجھتی تھی۔ تیری ماں ہو کر بھی میں تجھے پہچان نہ سکی۔“ ان کی پلکیں نم ہو گئیں۔

اس نے بے اختیار آنسو ڈھکی کھاتا۔

”اسے مت گھورو۔“ مہ جیس مسکرائی ”سب کچھ میرا کیا دھرا ہے۔“

”لیکن آپا۔“ وہ الجھی۔

”خاموش رہو۔“ اس نے اسے جھڑک دیا ”بہت عقلمند سمجھتی ہو تم خود کو۔ اکیلے اکیلے سارے فیصلے کر لیے ایک عذاب کر لی اپنی زندگی بھی اور دوسروں کی بھی۔ ارے کسی سے کچھ پھوٹا تو ہوتا۔“

”ضوفا، ہم سب مر گئے تھے کیا؟“ اب عاصم بھائی کی باری تھی ”یا چوڑیاں پہنے بیٹھے تھے تم نے کسی کو اس قابل نہیں گردانا کہ کچھ بتا سکو، کسی کندھے کو اتنا اہل نہیں جانا کہ وہ تمہارا بوجھ بانٹ سکے۔“

”کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو۔“ وہ بے بسی سے بولی ”آخر ان گڑے مردوں کو اکھاڑنے سے کیا حاصل۔“

”میں تجھے اس زنداں میں یوں گھٹ گھٹ کر مرتے نہیں دیکھ سکتی میری بچی۔“ اماں تڑپ کر بولیں ”کیسی خوشیاں خاک میں ملائی ہیں اس فرعون زادے نے سب کی۔“

”اماں پلیز۔“ اس نے ان کا ہاتھ تھام لیے۔ ”یقین کریں اماں میں خوش ہوں۔“

”کیا خاص یقین کروں، یوں انھی تھی تیری ڈولی جیسے جنازہ اٹھا ہو۔ کیسی لاش کی طرح خاموش تھی تو۔ کتنی بار مہ جیس نے مجھ سے کہا کہ اماں ضوفا خوش نہیں ہے، یہ کیسی شادی ہوئی ہے اس کی، اور میں رد کرتی اس کی بات کو، میں کہتی تھی کہ اس نے خود یہ فیصلہ کیا ہے۔ وہ بھلانا خوش کیوں

ہونے لگی۔ مجھے معاف کر دے میری بچی میں کیا جانتی تھی تو نے کیسا قربان کر ڈالا خود کو۔“

”اور اب بھی تم مصر ہو کہ سب صحیح ہے۔“ مہ جہیں نے اسے گھورا ”ابھی بھی تمہیں یہ خوف دامن گیر ہے کہ کہیں تمہارا فیصلہ ہم سب کی خوشیاں خاک میں نہ ملا دے۔ ضوفی کیا تمہیں خدا پر اعتبار نہیں؟“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ آپ؟“

”بس تو پھر، کرو تسلیم کہ تم ناخوش ہو، مان لو کہ جو کچھ ہوا وہ قطعاً غلط تھا۔“

”اچھا فرض کریں میں مان لوں پھر کیا ہوگا؟“ اس نے چڑ کر پوچھا۔

”ہم مقدمہ لڑیں گے تمہارا۔ چھٹکارا دلائیں گے تمہیں اس قید خانے سے، ابھی دنیا میں اتنا ادھر نہیں پھیلنا ضوفی، اور آذر کو دیکھو، آج بھی تمہارا منتظر ہے۔ اپنا نے کو تیار ہے تمہیں۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”ڈرو مت ضوفی۔“ وہ اس کے پاس آ بیٹھی ”اس بار فیصلہ ہم سب کو مل کر، کر لینے دو ہم اتنے امیر اور با اثر نہ سہی لیکن پھر بھی آخری دم تک لڑ سکتے ہیں۔ کیا تمہیں یقین نہیں کہ ہم سب کو تم کتنی عزیز ہو؟“

”یار کزن۔“ وہ بھی اس کے پاس آ بیٹھا۔ ”ایک بار تصور کرو کہ تم وہی پہلے والی ضوفشاں ہو، میں وہی پہلے والا آذر ہوں، اور ہمارے درمیان کوئی عالم شاہ نہیں، دیکھو کزن، غور کرو کیا یہ تصور تمہیں مسرت کا بے پایاں احساس نہیں بخشتا؟“

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

”کیا جو کچھ وہ کہہ رہا تھا ویسا ممکن تھا؟ کیا زندگی کی کتاب سے اپنے ناپسند صفحات کو پھاڑ کر پھینک دینا اتنا ہی آسان تھا، کیا وہ پہلے والی ضوفشاں بن سکتی تھی۔“

”مجھے چھوڑ کر چلی تو نہ جاؤ گی روشنی۔“

کسی کی التجائیہ آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

تقدیر کے بے رحم ہاتھوں نے اسے اجالا سے روشنی بنا دیا تھا۔ ایسا ممکن تھا سو ہو گیا لیکن کیا وہ روشنی سے اجالا بن سکتی تھی۔

”کیا ایسا ممکن ہے؟“

”اس نے بڑا کر خود سے پوچھا تھا، آذر سے، یا اپنی تقدیر سے کوئی نہ سمجھ پایا۔“



آرام دہ، نرم بستر پر وہ گھٹنوں کو بازوؤں کے حصار میں لیے بیٹھی تھی۔ نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمائے وہ گہری سوچ میں تھی کارڈ لیس اس کے پاس تکیہ پر رکھا تھا۔

”یار کزن! ایک بار تصور کرو کہ تم وہی پہلے والی ضوفشاں ہو، میں وہی پہلے والا آذر ہوں اور ہمارے درمیان کوئی عالم شاہ نہیں۔ دیکھو غور کرو کیا یہ تصور تمہیں بے پایاں مسرت کا احساس نہیں بخشتا۔“

”اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی، رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور نیند کی اس کی آنکھوں میں ہلکی سی پرچھائیں بھی نہ اتری تھی۔“

”آخر انہوں نے فون کیوں نہیں کیا۔“ اس نے بے چینی سے سوچا ”کتنا بدل گئے ہیں عالم، نہ وہ پہلی سی بے قراریاں، نہ وہ پذیرائیاں۔“

”کچھ دنوں کے لیے تم سے دور رہ کر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”بیوی سے کون بیزار نہیں ہوتا۔“

”اتنے بیزار ہو گئے کہ ایک فون کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔

”کتنا اچھا طریقہ نکالا مجھے تنگ کرنے کا، میری بے رخی کا بدلہ چکانے کا، پہلے اتنی محبتیں دیں کہ میرا دامن چھوٹا پڑنے لگا۔ پھر ان محبتوں اور چاہتوں کا خوگر بنانے کے خود پر بے رخی کی تہہ جمالی، واہ، سید عالم شاہ صاحب، بڑے کائیاں ہیں آپ تو۔“ وہ جھنجھلائی۔

”کہاں میرے بنا ایک پل گزارنا قیامت تھا اور آج چھٹاروز ہے، مڑ کر خبر تک نہیں لی کہ جیتی بھی ہو کہ نہیں۔“

”آز کو دیکھو۔“ اسے مہ جہیں کی بات یاد آئی۔

”آج بھی منتظر ہے تمہارا۔“

”میں کیا کروں آپا۔“ اس نے گہرا سانس لیا ”یہ دل کسی اور کا منتظر ہو گیا ہے۔“



پورے بارہ دن بعد وہ لوٹ آیا تھا۔ مکرم علی نے سہارا دے کر، ٹھایا صوفشاں غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ مزید کمزور ہو گیا تھا۔ چہرے پر پیلاہٹیں واضح ہو گئی تھیں۔ لب سیاہ ہو رہے تھے سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بہت خاموش، بہت شکستہ لگ رہا تھا۔

”عالم۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیسے ہیں آپ؟“

”جیسا نظر آتا ہوں۔“ وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ”تم کیسی ہو جان عالم۔“

”میں..... میں سخت خفا ہوں آپ سے۔“

”اچھا! وہ دھیرے سے ہنسا ”میں تو سمجھا تھا تم خوش ہو گی۔ خیر بتاؤ خفا کیوں ہو؟“

”آپ نے ایک فون کرنے کی زحمت تک نہیں کی اتنے بیزار ہو گئے مجھ سے۔“

”تم فون کر لیتیں۔ مکرم علی سے کہتیں، یہ تمہیں نمبر ملو ایتا۔“

”جی! جانتی تھی لیکن میں صرف یہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ نے فون کیوں نہیں کیا؟“

”کیا کرتی رہیں اتنے دن۔“ اس نے بات بدلی۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے ایک فنگلی بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

”کہاں کہاں گئیں۔“ اس نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔

”کہاں جانا تھا۔“ اس نے سر بلایا ”کہیں نہیں گئی اچھا یہ بتائیں ڈاکٹر نے کیا کہا؟“

”ڈاکٹر کا ایک ہی تو کام ہے، ہمت بندھانا تسلیاں دینا، لیکن کچھ باتیں انسان کے دل میں خود بخود اترتی ہیں۔ میرے دل میں یہ بات قطعاً واضح ہے کہ اب میں کبھی ٹھیک نہیں ہو پاؤں گا۔“

”عالم۔“ وہ بچھ کر رو گئی۔

”ایک ماہ بعد میرا آپریشن ہے فیصلہ کن آپریشن لیکن تم دیکھنا روشنی۔“

”خدا کے لیے خاموش رہیں۔“ اس نے بے تابی سے اس کی بات کاٹ دی ”انشاء اللہ وہ آپریشن ضرور کامیاب ہوگا۔ آخر آپ اتنے ناامید کیوں ہیں؟“

”وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ ایک بے حد زخمی سی مسکراہٹ جو صوفشاں کا دل چیرتی چلی گئی۔

”روشنی تم نہیں جانتیں میں نے بڑے گناہوں بھری زندگی گزاری ہے اور گناہوں کا کفارہ تو ہر صورت ہوتا ہے۔“

”ایسی ناامیدی کی باتیں سوچ سوچ کر کیا حالت بنائی ہے آپ نے اپنی۔“

”میں تھک گیا ہوں روشنی، بہت تھک گیا ہوں، میری سوچوں کی ایک سمت میں رواں رہنے دو، ان کے آگے ان تسلیوں، ہمدردیوں کے بند نہ لگاؤ، اس طرح میری تھکن بڑھتی ہے۔ مجھے سوچوں کے اس بہاؤ کے ساتھ بہتا رہنے دو، اس طرح ٹوٹ پھوٹ تو ہوتی ہے، ہاں تھکن نہیں ہوتی۔“

وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ عالم شاہ جو اس کے سامنے تھا کتنا مختلف تھا۔ رات اتری تو وہ نیچے لان میں آ بیٹھی۔ عجب سناٹے تھے جو جو دم میں دھیرے دھیرے اتر رہے تھے۔ عالم شاہ کی بے بسی، اس کی ناامیدیاں اس کے دل کو مسلسل نشتر لگا رہی تھیں۔

گرمر احرف تسلی وہ دو اہو جس سے

جی اٹھے پھر تراجز اہو ابے نور دماغ

تیری پیشانی سے دھل جائیں یہ تذلیل کے داغ

تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے

”بی بی جی۔“ اس کی محویت کو حسینہ نے توڑا۔

”آں..... ہاں کہو۔“ اس نے پلکوں سے نمی صاف کی۔

”آذر صاحب کا فون ہے۔“

ایک گہرا سانس بھر کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی آہستہ روی سے چلتی ہوئی اندر تک پہنچی۔

”ہیلو آذر۔“ اس نے ریسیور اٹھایا۔

”اجالا کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“

”اجالا، میں نے بڑا انتظار کیا تمہارا لیکن کوئی جواب نہ ملا شاید میری زندگی میں تمہارے ساتھ کی ایک سکون بھری شام بھی نہیں ہے۔“ وہ

مایوس مایوس سا بول رہا تھا ”میں واپس جا رہا ہوں اجالا۔“

”واپس۔“

”ہاں، بس چند راہیں ہی ایسی ہیں جنہیں کھلا پاتا ہوں، دس دن بعد فائنٹ ہے میری۔“

”بڑی اچھی بات ہوتی اگر تم پھوپھی اماں کی خواہش پوری کر دیتے۔“

”اس سے زیادہ اچھی بات یہ ہوتی کہ تم بہت سے لوگوں کی خواہشوں کا احترام کر لیتیں۔“

”آذر.....! جہاں تم دروازہ سمجھتے ہو وہاں درحقیقت کوئی دروازہ ہے ہی نہیں، ایک دیوار ہے مضبوط اونچی دیوار، یہ انتظار لا حاصل ہے،

ہاں اگر مجھے کچھ سمجھتے ہو تو میری بات مانو اور.....“

”خدا کے لیے اجالا۔“ اس نے بات کاٹی ”مجھ سے کچھ ایسا مت کہنا جسے پورا کرنا میرے لیے ناممکن ہو۔“

”یہ ناممکن کب ہے آذر۔“ وہ اداسی سے ہنسی۔

”جہاں دیوار ہے وہاں تو دروازہ سمجھتے ہو اور جہاں دروازہ ہے وہاں دیوار، نعمان اچھی لڑکی ہے۔“

”کس قدر سنگدل ہو۔“ وہ ذرا خفگی سے بولا۔

”بے وقوف تو میرا دل ہے جو سر پھوڑنے کے لیے بھی تمہارا ہی آستان مانگتا ہے۔“

”خدا کے لیے آذر میں شادی شدہ عورت ہوں مجھ سے ایسی باتیں کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔“ وہ قدرے جھلا کر بے بسی سے بولی۔
 ”اجالا، ایک بار، ایک بار اتنا بتا دو کیا وہ محبت جو کبھی تم نے مجھ سے کی تھی، کیا وہ محبت مر گئی ہے؟“
 وہ بڑی دیر کے لیے خاموش رہ گئی۔

”نہیں۔“ پھر وہ بولی ”وہ محبت ایک خوبصورت شفاف ندی تھی۔ جواب بھی وہیں بہتی ہے۔ لیکن فرق اتنا ہوا ہے کہ اس کا پانی آگے جا کر ایک بڑے سمندر میں مل گیا ہے خدا تمہارا حافظ ہو، جہاں رہو خوش رہو۔“
 ریسپورر رکھ کر وہ مر گئی۔



”مکرم علی“ وہ اسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے مکرم علی اسے زندگی اور موت سے کسی ایک شے کا انتخاب کرنے کو کہنے لگا تھا۔
 ”کہو، جلد کہو۔“ وہ بے تابی سے لبوں پر زبان پھیر کر بولا۔

”شاہ صاحب، یہ ہے وہ کیسٹ۔“ اس نے جیب سے کیسٹ نکال کر اس کی سمت بڑھا دی۔
 ”آپ کے جانے کے بعد بی بی صاحب نے جو گفتگو فون پر کی وہ سب اس ٹیپ میں ہے۔ یہاں ان سے ملنے کوئی نہیں آیا البتہ وہ ایک بار اپنی بہن کے گھر گئی تھیں۔“
 ”ٹھیک ہے، کیسٹ پلیئر مجھے یہاں لا دو اور تم جاؤ۔“
 ”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔

کچن میں اپنی نگرانی میں اس کے لیے سوپ اور کھانا تیار کر رہا تھا جب وہ اوپر کمرے میں آئی تو وہ پتھر کے کسی بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔

”عالم۔“ وہ پریشانی سے اس کے نزدیک آئی۔ ”عالم طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔“
 اس نے اپنی ہتھیلی اس کی پیشانی پر رکھی۔

”روشنی۔“ اس کا ہاتھ تھام کر وہ بھیگی آواز میں بولا تھا۔
 ”جی کہیے کیا ہوا ہے۔ عالم۔“

”روشنی۔“ اس نے اس کی ہتھیلی پر اپنے لب رکھ دیئے ”روشنی مجھے معاف کر دو یا بے شک سزا سنا دو، میں مجرم ہوں تمہارا، عالم شاہ خود کو کٹہرے میں کھڑا کرتا ہے۔ تم اسے سزا سناؤ۔“

”کیا ہو گیا ہے عالم۔“ وہ حد درجہ پریشان ہو گئی ”کچھ بتائیں تو سہی۔“

”عالم شاہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا وہ بھی بے تابی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی سیاہ چھنورا آنکھوں میں جانے کس احساس سے نمی اتری ہوئی تھی۔ جن آنکھوں میں رنگ و بو کا ناز و غرور کا ایک طوفان پھاڑتا تھا آج ضوفشاں کو وہ آنکھیں بالکل خالی اور ویران نظر آئیں۔ وہ آنکھیں جو کبھی ایک شکوہ عايشان قلعہ کی طرح تھیں آج وہی آنکھیں اسے کھنڈرات کا سلسلہ نظر آئیں۔“

”روشنی۔“ اس نے ننھا سا کیسٹ پلیئر اس کی جانب بڑھا دیا۔

”کیا ہے یہ؟“ وہ تعجب سے بولی۔

عالم شاہ نے اسے پلے کر دیا۔

چند لمحے سو سو سنائی دینے کے بعد کچھ واضح الفاظ سنائی دینے لگے۔

”مجھے یہ علم ہو چکا ہے کہ میری عمر بھر کی خوشیوں کو بیک جنبش قلم، پامال کر دینے کا وہ فیصلہ کسی اور کے سفارک قلم کی نوٹ سے تحریر ہوا تھا۔“
یہ آواز اور یہ الفاظ وہ بخوبی پہچان سکتی تھی۔

”اب اس سزا کو بھگتتے چلے جانا میرے لیے ناممکن ہے، میں اب احتجاج کر سکتا ہوں بغاوت کر سکتا ہوں، لیکن تم! تم میرا ساتھ دینے سے کیوں انکار کر رہی ہو؟ مجھے سچ بتاؤ اجالا، کیا آج بھی تمہاری زبان پر زبردستی کے پہرے ہیں۔“

”نہیں۔“ اگلی آواز اس کی اپنی تھی ”وہ فیصلہ بے شک میرا نہیں تھا لیکن یہ فیصلہ میرا اپنا ہے۔“
وہ بے یقینی اور شک کی حالت میں بیٹھی رہ گئی۔ یہ جو کچھ بھی تھا اسے تسلیم کرنا اس کے لیے بے حد مشکل امر تھا۔ سید عالم شاہ نے اس کی ذات پر شکوک و شبہات کی جو کچھ اچھالی تھی اسے اپنے وجود پر ہر جگہ اس کی جھینٹیں دکھائی دے رہی تھی۔

”خدا کے لیے آذر میں شادی شدہ عورت ہوں مجھ سے ایسی باتیں کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔“ گفتگو کا سلسلہ طویل تھا جس کے دوران وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرائے اپنی اپنی جگہ پتھر کے بت بنے بیٹھے رہے۔ ندامت، دکھ، تاسف اور شرمندگی کا سمندر تھا جو عالم شاہ پر سے گزر رہا تھا۔ اور ذلت اور غم کا طوفان تھا جو صوفشاں کے اندر برپا تھا۔

کیسٹ ختم ہو چکنے کے بعد جب کیسٹ پیئر خود آف ہو گیا تو وہ دونوں اپنے اپنے حواسوں میں آ گئے۔
”کچھ کہو گی نہیں روشنی۔“ وہ سر جھکا کر بولا ”کوئی سزا، کوئی انتہائی سخت سزا سنا دو روشنی، عالم شاہ اس وقت سولی پر چڑھ جانے کے لیے بھی تیار ہے۔“

اس نے بہتے ہوئے آنسو پونچھے اور خاموش رہی۔
”تمہاری جیسی عظیم، باوقار عورت ملی عالم شاہ کو، کس قدر خوش قسمتی تھی میری اور کتنی بڑی بد نصیبی ہے کہ میں اس میں اپنی ماں جیسی عورت کو ڈھونڈتا رہا۔ آہ سید عالم شاہ کس قدر حراما نصیب ہو تم! اپنے حصے کی خوش نصیبی کو خود ہی اپنے اوپر حرام کر لیا لیکن ٹھیک ہی تو ہے، سب کچھ درست ہی تو ہوا، ایک بنے بنائے نظام کے تحت جسے جھٹلانا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں میں نے کہا تھا تاں روشنی یہ مکافات عمل ہے، خوشیاں بانٹو تو خوشی، گلاب بوؤ تو گلاب، دکھ پھیلاؤ تو دکھ، کانٹے لگاؤ تو کانٹے پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ خوشیاں چھین کر، دکھ پھیلا کر، بول بو کر عالم شاہ خوش رہ پاتا۔ ناممکن تھا روشنی جو کچھ میں نے سب کے ساتھ کیا آج اپنے دامن میں اسی کا شمر پاتا ہوں دوسروں کی نیندیں اجاڑی تھیں میں نے، تمہاری قسم روشنی سکون کی نیند عالم شاہ پر بھی حرام رہی۔ دوسروں کو محروم تمنا کیا تو خود نارسائیوں کے عذاب بھگتے یہ شک، یہ بے وفائیوں کا الزام تمہارے لیے کس قدر سوہان روح ہوگا روشنی، میں سمجھ سکتا ہوں، لیکن یقین جانو عالم شاہ کے اپنے لیے یہ بات، یہ سوچ زہر میں بجھاؤ تیر تھی جو پچھلے کئی دنوں سے دل میں اس طرح پیوست تھا کہ سانس لینا مشکل تھا“ وہ خاموش بیٹھی روتی رہی۔ روتی رہی پھر انھی اور باہر نکل گئی۔



”آخر آپ مجھے بھیجنے پر کیوں مصر ہیں جب کہ میں ہرگز جانا نہیں چاہتی۔“ اس نے جھلا کر پوچھا تھا۔

وہ ادا سی سے مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں صدیوں کی تھکن تھی۔

”جانا تو میں بھی نہیں چاہتا روشنی۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ”تمہیں چھوڑ کر۔“

”جی؟ کیا کہا آپ نے؟“

”روشنی؟ تم بہت اچھی بیوی ہو، میری ہر بات مانتی ہو پچھلے دنوں جو واقعہ ہماری زندگی میں رونما ہوا میں اس پر پریشان ہوں، نادم ہوں ایسے میں تم اپنے میکے نہ جا کر مجھے کوئی خوشی نہیں دے رہیں بلکہ میں ہرگز رتے دن کے ساتھ مزید شرمسار، مزید پشیمان ہوتا جا رہا ہوں، اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں کچھ دیر کے لیے جا کر مل آؤ سب سے تمہاری آپا دو مرتبہ فون کر چکی ہیں۔ کیا میں اسے اپنے لیے سزا سمجھوں روشنی، جو تم خود کو یوں مقید

کر کے دے رہی ہو۔“

”عالم۔“ وہ بے بسی سے بولی ”نجانے آپ کو خوشی کس بات میں ہے، میں آپ کو جتنا خوش رکھنا چاہتی ہوں آپ اتنے ہی اداس ہوتے چلے جاتے ہیں ٹھیک ہے، میں آج جاؤں گی آپ کی طرف تسلی ہو جائے گی آپ کی؟“
وہ مسکرایا۔

وہ بڑی بے دلی سے تیار ہو کر وہاں آئی تھی۔ اور اب تو اس کا دل کسی شے میں نہیں لگتا تھا۔
کس قدر خوش تھی وہ محض چند ہی روز پہلے کتنی مطمئن ہو گئی تھی۔ اور اس خوشی، اس اطمینان تک پہنچنے کے لیے اسے لگتا تھا اس نے صدیوں تپتے صحراؤں کا سفر کیا ہے سید عالم شاہ نے ایک بار پھر خوشیاں اس کی دسترس سے دور کر دی تھیں۔
اب وہ اس کے اداس ہونے پر اداس رہتی تھی۔ وہ آنسو جنہیں وہ بڑی خاموشی سے اپنے اندر اتار لیتا تھا، ضوفاں کی آنکھوں میں چلے آتے تھے۔ اس نے آج تک عالم شاہ کی وارفتگیاں ہی دیکھی تھیں۔ اس کی بے پناہ محبتوں کی عادی ہو چلی تھی وہ اور اب اس موڑ پر لا کر وہ اس سے دور دور کھنچا رہنے لگا، اسے لگتا تھا بس چند دنوں میں وہ پاگل ہو جائے گی۔
”اجالا اس قدر خاموش کیوں ہو۔“

منہ جیسے کھانا پکانے کے لیے اٹھ گئی تو وہ حادثے سے کھیلتا ہوا اسے پوچھنے لگا۔
اس نے ایک سرد آہ بھری اور اس کی جانب دیکھا۔
”سنا تھا آذر محبت کا کاٹا سوتے میں ہنستا ہے اور جاگتے میں روتا ہے۔ یہ محبتیں زندگی میں پائی جانے والی خوشیوں کی قاتل ہیں۔ اب مجھے لگتا ہے کہ مرد محض محبت کا دعویٰ کرتا ہے، بے پناہ محبت کا، پاگل پن کی حد تک محبت کا، عشق کا، جنون کا اور قتل ہوتا ہے، عورت کی خوشیوں کا۔ سوتے میں ہنستی ہے تو عورت، جاگتے میں روتی ہے تو عورت، کتنا ظلم ہے ناں آذر، محبتوں کا بوجھ اٹھاؤ، احسان سے جھک بھی جاؤ اور اسکے کفارے بھی ادا کرو۔“
”وہ ایک نلک اسے دیکھتا رہا۔“

”اجالا، بڑی گہرائیاں اتر آئی ہیں تمہاری ذات میں، سبب پوچھ سکتا ہوں۔“
وہ سر جھکا کر زخمی ہنسی ہنس دی۔
”یہ جو حادثے ہوتے ہیں ناں لوگ ان سے بہت ڈرتے، بہت گھبراتے ہیں آذر، حقیقت تو یہ ہے کہ یہ حادثے بڑے رہنما ہوتے ہیں۔ انسان کے شعور کو آگہی و ادراک کی ایسی منزلوں تک لے جاتے ہیں جہاں پہنچنا عام حالات میں انسان کے بس میں نہیں ہوتا لیکن میں کہتی ہوں ان منزلوں تک پہنچ کر بھی کیا حاصل جہاں سفر مکمل ہو جائے اور انسان کی ذات ادھوری ہو جائے۔“
آذر نے حیرت و تعجب سے اسے دیکھا لمحہ بھر پہلے اپنی ہی کہی بات کی وہ خود نفی کر رہی تھی۔
”اجالا کیا ہم اچھے دوست بھی نہیں رہے؟“ وہ ہمدردی سے بولا ”یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم پریشان ہو، لیکن کیا میں یہ نہیں جان سکتا کہ تم پریشان کیوں ہو۔“

”آج کل مجھے محض ایک سوچ پریشان کرتی ہے آذر وہ یہ کہ کیا کوئی ایسا اسم ہے جسے پڑھنے سے انسان اپنی تقدیر کے چکر سے باہر آ سکے۔ ایک سیدھی رواں متوازن راہ پر سکون و اطمینان سے چل سکے۔ مجھے محض اس راہ کی آرزو ہے۔“ نھنڈی آہ بھر کر وہ خاموش ہو گئی۔
وہ اسے بے چارگی سے تکتا رہا۔ اسے یقین تھا اس کی ذہنی کیفیت نارمل نہیں ہے۔



مکرم علی نے ہاتھ میں پکڑے چابیوں کے گچھے کی جانب دیکھا پھر بستر پر دراز اپنے مالک کے سوتے ہوئے پیلے چہرے کی طرف نظر کی۔
”یہ الماری کھولو مکرم علی اور تیسری چھوٹی چابی سے اس کا سیف کھولو، سیف میں ایک چھوٹی دراز ہے۔ اس میں ایک شیشی ہے۔ نکال لاؤ۔“

مکرم علی نے چند لمحوں میں حکم کی تعمیل کر ڈالی۔

”لاؤ اسے مجھے دے دو۔“

”سائیں۔“ اس کا دل دھڑکا ”اس میں کیا ہے سائیں؟“

”آب حیات ہے مکرم علی۔“ وہ بمشکل مسکرایا۔

”اور کچھ مخصوص حالات کے لیے اسے پاس رکھنا ہمارے خاندان کی روایت، لاؤ اسے مجھے دے دو۔“

”مکرم علی ادھر بیٹھو میرے پاس۔“ اس نے اشارہ کیا۔

”بندہ یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہے، سائیں۔“

”میں تم سے کہہ رہا ہوں مکرم علی ادھر آؤ بیٹھو میرے پاس شاباش آؤ۔“

”وہ جھجکتا ہوا اس کے قریب مسہری کے کونے پر ٹک گیا۔

”مکرم..... تم میرے دوست ہو، ایسا دوست جو قسمت سے ملتا ہے۔“

”بندہ حکم کا غلام ہے سائیں آپ حکم کریں۔“

”مکرم، تم بچپن سے لے کر اب تک ہر قدم پر میرے ساتھ رہے ہو، مجھے یاد نہیں پڑتا تم نے کبھی میرے کسی حکم کی تعمیل کرنے میں غفلت یا

کوتاہی برتی ہو، اس لیے مجھے یقین ہے کہ آج جو چند حکم میں تمہیں دے رہا ہوں تم عمر بھر ان کی تعمیل کرتے رہو گے۔“

”آپ، کہیں جارہے ہیں سائیں؟“

”ہاں مکرم، آج جس مقام پر میں کھڑا ہوں وہاں سے آگے محض ایک راہ جاتی ہے۔ میری مجبوری ہے کہ مجھے اسی راہ پر چلنا ہے۔ سنو مکرم

علی غور سے سن لو، میرے جانے کے بعد تمہاری بی بی صاحبہ کی تمہارے لیے وہی اہمیت وہی جگہ ہوگی۔ جو میری ہے، ان کا ہر حکم ماننا تمہارا فرض ہوگا۔

انہیں ہر قسم کی پریشانیوں سے محفوظ رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔“

”سائیں۔“ مکرم علی کی آواز لرزنے لگی۔ ”آپ، آپ کہیں جارہے ہیں سائیں؟“

”جہاں بڑا سکون، بڑی راحتیں ہیں۔“ وہ ہولے سے ہنسا ”اور کیا خبر ہیں بھی کہ نہیں۔“

”نہیں سائیں، نہیں۔“ وہ بے یقین ہو رہا تھا۔

”مکرم، اسی بات پر تو ناز ہے مجھے کہ کبھی تمہارے لبوں سے لفظ ”نہیں“ نہیں سنا اور آج، آج تو بالکل نہیں سنوں گا، یہ لو۔“

اس نے ایک لفافہ اس کی جانب بڑھایا۔

”یہ کچھ کاغذات ہیں، انہیں تم سنبھال کر رکھو گے مکرم، انہیں کب کھولنا ہے تم خود جان جاؤ گے۔ اور جو کچھ میں نے کہا ہے، مجھے یقین ہے

کہ تم نے اپنی سماعتوں کے پردے پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہوگا۔ زندگی میں جو بڑے قیمتی تحفے میں نے پائے ہیں ان میں سے ایک تم ہو مکرم۔“

اس نے شیشی کھولی، پاس رکھے جو اس کے جگ میں انڈیلی اور مسہری کے پیچھے ڈال دی۔

مکرم علی پھٹی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا رہا۔

دروازہ کھول کر وہ تھکی ہاری اندر آئی۔ وہ چند لمحے کھڑی وہ ان دونوں کو دیکھتی رہی۔

”کیا بات ہے عالم۔“ پھر اس نے استفسار کیا۔

”کچھ نہیں جان عالم۔“ وہ مسکرایا ”میں تمہارا انتظار تو کر رہا تھا۔“

”اچھا۔“ وہ مسکرائی اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”یہ جوں ویسے کا ویسا پڑا ہے چھو اتک نہیں آپ نے۔“

”دل نہیں چاہ رہا تھا۔“ وہ مسکرایا ”اب چاہ رہا ہے۔“

”نکال کر دوں۔“

”ہوں، پلا دو اپنے ہاتھوں سے جو مجھے بہت عزیز ہیں۔“

اس نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”سائیں۔“ مکرم علی کے لب لرزے اور اس کا توپور او جو دلرز رہا تھا۔

عالم شاہ نے اسے ایسی گہری سرد نگاہ سے دیکھا اور اندر تک ٹھنڈا ہو گیا۔

وہ گلاس بھرنے میں منہمک تھی۔

”یہ لیں۔“

”کہاناں تم پلاؤ۔“ اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔

وہ مسکرائی بڑے دنوں بعد وہ اس طرح سے بولا تھا، لہجے میں شگفتگی لیے اور نظروں میں پیار۔ اس نے گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔

مکرم علی نے کرب کی انتہا منزل پر پہنچ کر آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

”روشنی۔“ گلاس خالی کر کے وہ بڑی محبت سے بولا۔

”جی، کہیں۔“ وہ ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ جما کر اسے دیکھنے لگی۔

”کچھ باتیں ہیں جو میں تم سے کرنا چاہتا ہوں، لیکن ہمت نہیں پاتا۔ اس لیے وہ باتیں میں نے لکھ لی ہیں۔“

”اوہ۔“ وہ شوخی سے مسکرائی ”لائیں دیں پڑھوں تو سہی ایسی کون سی باتیں ہیں جو آپ مجھ سے نہیں کہہ پارہے۔“

”ہاں، دوں گا ایک شرط پر۔“

”کہیے۔“

”تم اس وقت تک میرے پاس بیٹھو گی جب تک میں آرام سے سونہ جاؤں۔“

”پھر نیچے لان میں جا کر پڑھو گی میں نے کیا لکھا ہے۔“

”ٹھیک۔“ وہ زور سے ہنسی ”اور کچھ ایسا ویسا لکھا ہوگا تو بات بھی نہیں کروں گی، اس لیے سوچ سمجھ کر دیجئے گا۔“

وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرایا اور سائید میں دبا لفاظہ نکال کر اسے دیے دیا۔

”چلیں سوئیں اب۔“ وہ مسکرائی ”بند کریں آنکھیں۔“

”ذرا کو۔“ اس نے التجا کی ”تمہیں ٹھیک سے دیکھ تو لوں۔“

نگاہوں میں بے تحاشا جذبے بھرے وہ اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں چند لمحوں میں وہ بے خبر

ہو گیا۔



اس نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اس میں سے عالم شاہ کی مخصوص مہک آرہی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس نے لفافہ چاک کیا خط نکالا اور

پڑھنے لگی لکھا تھا۔

روشنی کے نام

جس نے میری تقدیر کے اندھیروں کو دور کیا۔

دعا ہے کہ تمہیں وہ تمام خوشیاں ملیں جو تم سے چین لی گئیں۔

تمنا تھی کہ تمہیں اس نام سے پکاروں جس نے ہمیشہ تمہارے گردا جائے بکھیرے اور تمہارے لبوں پر مسکرائیں کھلائیں۔ تمہارا حق ہے کہ تمہیں اسی نام سے پکارا جائے لیکن شرمندہ ہوں کہ شاید مجھے وہ نام لینے کا بھی حق نہیں.....

روشنی! آج وہ عالم شاہ تم سے مخاطب ہے جسے تم نے بنایا اور جو تم پر ہی مٹ جانے کی تمنا بھی رکھتا ہے۔ وہ سید عالم شاہ جو جبر اور قوت کو اپنی شناخت سمجھتا تھا کب کا فنا ہو چکا۔

میں سمجھتا ہوں کہ روشنی میں تم سے محبت نہیں عشق کرتا ہوں۔ محبت کو میں نے اپنے جنون کے لیے بڑا معمولی لفظ سمجھا تھا لیکن خبر ہوئی کہ عالم شاہ نے تو اپنی ساری عمر اندھیروں میں گزاری ہے۔ مجھے احساس ہوا روشنی کہ محبت کا نام ہے محبوب کی خوشیوں کی تمنا رکھنے کا اس کے نام اپنے حصے کی خوشیاں اور مسرتیں لکھ دینے کا، اپنی ہستی کو فنا کر کے اس کی ذات کو جلا بخشنے کا۔

محبت وہ کب تھی، جو عالم شاہ نے کی۔

محبت تو وہ تھی جو اجالانے کی۔

عشق تو وہ تھا جو آذر نے کیا۔ جنہوں نے اپنے لیے ہمیشہ آنسوؤں کا انتخاب کیا۔ اور محبوب کے لیے مسکراہٹوں کا، کانٹے اپنے حصے میں رکھے اور پھول دوسروں کے دامن میں ڈال دیے۔

محبت تو اسی جذبے کا نام ہے عالم شاہ نے چاہا تھا تو خود کو، خوشیاں چاہی تھیں تو اپنی ذات کے لیے۔ وفائیں کسی کے نام لکھیں بھی تو پس پردہ خواہش کی تھی دنیا بھر کی وفائیں اپنے نام لکھوا لینے کی۔ عالم شاہ تو بڑا خود غرض، بڑا کمینہ شخص تھا اور تم عظمتوں کے مینار پر کھڑی وہ ہستی ہو جس نے اپنے عالم شاہ کو بھی مایوس نہیں کیا جو اس نے چاہا اس کے دامن میں ڈال دیا۔ اپنا تمام خلوص، اپنی ساری وفائیں اسے سوپ دیں جو شاید اس قابل تھا ہی نہیں۔ سید عالم شاہ خوش نصیب ہے کہ اس نے اپنی زندگی سے جو چاہا وہ اسے مل گیا۔ اور جواب میں اس نے تمہیں کیا دیا؟ آنسو، دکھ، نارسانیاں اور بے وفائی کے الزام، یہ وہ گناہ ہے جو میری اپنی نگاہ میں ناقابل معافی ہے۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ سید عالم شاہ بھی تمہیں وہ شے دے گا جو تمہاری دی گئی چیزوں کے جواب میں بڑا خوب صورت قیمتی اور انوکھا تحفہ ہے۔

تمہیں یاد ہوگا روشنی، میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ محبت جو تم نے آذر سے کی اور آذر نے تم سے ان دونوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پر عالم شاہ کی محبت جنون اور خواہش کو تو عالم شاہ کا پلڑا بھاری ہوگا تو وقت آپڑا ہے اپنی بات کو سچ کر دکھانے کا۔

ایک ہی تو وصف رہا ہے عالم شاہ میں ہمیشہ اپنے کہے کا پاس کیا۔

تو سنو روشنی!

عالم شاہ تمہیں آزاد کرتا ہے ہر اس بندھن سے جو اذیتوں کا، اپانج پن کا بندھن ہے۔

عالم شاہ تمہیں آزاد کرتا ہے ان تمام بندھنوں سے جو جبر، ظلم اور زبردستی کے بندھن تھے۔ عالم شاہ آزاد کرتا ہے اس معصوم، خوبصورت چڑیا کو جو اس کی سخت بے رحم مٹھی میں سہمی سہمی رہتی تھی۔ آنکھوں میں خوف اور آنسو بھرے۔

عالم شاہ اسے خوشیوں کی، مسکراہٹوں کی نوید سناتا ہے۔

خط کو دونوں ہاتھوں میں بھینچ کر اس نے ایک خوف کے عالم میں سینے سے لگا لیا۔ دل اس طرح سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے ابھی سینہ پھاڑ کر باہر آ جائے گا۔

”کیا..... کیا مطلب ہے ان لفظوں کا۔“ لبوں پر زبان پھیر کر اس نے سوچا ”طلاق؟“

”نہیں، نہیں، عالم شاہ تم ایسا نہیں کر سکتے، ابھی تو میں نے تم سے وہ سب کچھ کہنا ہے جو کب سے اس دل میں ایک خزانے کی طرح منہ بند رکھا ہے۔“

لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے خط کو سیدھا کیا اور آگے پڑھنے لگی۔

”تم اتنی اچھی بیوی ثابت ہوئیں کہ تم نے کبھی میری کوئی بات نہیں نالی۔ چند خواہشات ہیں روشنی، مجھے یقین ہے تم انہیں ضرور پورا کر گئی۔ اسے عالم شاہ کا حکم سمجھو یا التجا، پہلی خواہش یہ ہے روشنی کہ اس گھر کو کبھی مت چھوڑنا، یہ گھر تمہارے بنا اس جاتا ہے، اور اس کا اداس ہونا مجھے اداس کر دیتا ہے۔ یہ گھر جس کے در و بال سے تمہاری خوشبو آتی ہے بہت عزیز ہے مجھے۔ اس گھر کو مت چھوڑنا روشنی۔

ایک خواہش یہ ہے کہ اس شخص کو مزید مایوس مت کرنا جو نجانے کب سے ہجر کے تپتے صحرا میں ننگے پاؤں تمہارے قرب کے سراب کے پیچھے دوڑتا چلا آ رہا ہے وہ شخص جس کا عکس تمہارے آنسوؤں میں لرزتا ہے، اور تمہاری مسکراہٹوں سے جھلکتا ہے، اسے مایوس مت کرنا۔

میں نے تم سے کہا تھا روشنی کہ تم ساتھ ہو تو عالم شاہ ہر اس سزا کو پانے کے لیے تیار ہے جو مکافات عمل کے تحت اس کے حصے میں آئے لیکن میں غلطی پر تھا میں نے سوچا ہی نہیں کہ اپنے اپنے حصے کی سزا تو ہر شخص نے اکیلے ہی پانی ہوتی ہے۔ یہ سزا تو صرف میرا مقدر ہونا چاہیے تو سنو روشنی، عالم شاہ اپنی سزا خود منتخب کرتا ہے۔

جس لمحے تمہاری نظر کی خوشبو ان الفاظ پر بکھر رہی ہوگی۔ سید عالم شاہ اپنے انجام کو پہنچے گا۔ وہ انجام جو بڑا دلکش بڑا خوش کن ہے کہ تمہاری مرمریں ہاتھوں سے آخری جام پی کر حاصل ہوا ہے۔ اور وہ انجام جسکے بعد سید عالم شاہ ہمیشہ کے لیے تمہیں کھونے کے خوف سے رہائی پا جائے گا۔

آخری خواہش یہ ہے روشنی کہ میری قبر اسی گھر کے کسی گوشے میں بنا دینا کہ مر کر بھی تم سے جدا ہونا عالم شاہ کو گوارا نہیں۔ میرے لیے بس اتنی دعا کرنا کہ خدا میرے گناہوں کو معاف کر دے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تمہاری دعائیں رو نہیں ہوتیں۔

تمہارا حرماں نصیب

سید عالم شاہ

وہ چند لمحے سکتے کے عالم میں بیٹھی رہی موت کے سناٹے اس کے اندر گونجنے لگے پھر اس کے بے جان جسم کو جیسے کسی نے ایک غیر مرئی شکنجے سے آزاد کر دیا۔

”عالم.....عالم۔“

زور زور سے چیختی وہ اٹھ کر اندر کی طرف بھاگی۔ دیوانہ وار راستہ طے کر کے وہ اوپر پہنچی، اندر کمرے میں مکرم علی اس کے دونوں پاؤں تھامے سسک رہا تھا۔

”نہیں، نہیں۔“ وہ دروازے پر ہی رک گئی ”ایسا نہیں ہو سکتا، تم مجھے اس طرح بچا راہ میں چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ وہ گھسنی ہوئی اس تک پہنچی۔

”سنو عالم شاہ تم مجھے اس طرح چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ دیکھو دیکھو تم ہمیشہ غیر منصفانہ کھیل کھیلتے ہو۔“

”سنو عالم شاہ، وہ چڑیا جسے تم نے ایک عرصے پانی مٹھی میں بند رکھا، اس چڑیا کو تمہارے ہاتھوں کی گرماہٹ، ان کی خوشبو، ان کی نرمی کی عادت ہو چکی ہے، وہ چڑیا اپنے ظالم، بے رحم صیاد سے محبت کرنی لگی ہے۔“

وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”بڑی خواہش تھی ناں تمہیں یہ الفاظ سننے کی تو سنو عالم شاہ میں محبت کرتی ہوں تم سے۔“

تم مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ دیکھو جب مقبرے میں پہنچ ہی گئے تھے تو خزانہ تلاش کرنے کو کچھ دیر تو رکے ہوتے۔ منزل پر پہنچ کر بار گئے لوٹ آؤ عالم شاہ لوٹ آؤ۔“

اپنی چیختی، بین کرتی مالکن کو مکرم علی نے بڑی مشکلوں سے سہارا دیا تھا۔



اس نے مٹی کو مٹھیوں میں بھرا ہوا اور چھوڑا پھر بھریا۔

”دیکھو کتنے غیر منصفانہ کھیل کھیلتے ہو تم، آخر ہونا ظالم و ڈیرے سارے فیصلے اکیلے کر لینے کے عادت جو رہی ہے تمہیں، نہ ملتے ہوئے پوچھا، نہ کچھڑتے ہوئے۔

سیاہ آنچل میں اس کا چہرہ جذبات کی حدت سے دھک رہا تھا۔

”اور کیسا بدلہ چکا گئے ہو، آج میں شدتوں سے یہ خواہش کرتی ہوں کہ تم ایک بار کہیں سے مجھے مل جاؤ اور میں تم سے کہوں، سنو عالم شاہ، میں محبت کرتی ہوں تم سے۔“

”اجالا۔“ آذر نے جھک کر اسے سہارا دے کراٹھایا ”چلو اب بس کرو، اندر چلتے ہیں۔“ وہ اٹھی اس کی گود سے سحر کو لیا۔ چوما اور اس کے ساتھ اندر چل پڑی، اور آذر جانتا تھا اندر جا کر بھی وہ پردے ہٹائے گی اور شیشے کی دیوار کے پار نظر آتی عالم شاہ کی قبر کو تادیر دیکھتی رہے گی۔
مجھے لگتا ہے آذر مرد محض دعویٰ کرتے ہیں۔“ اس نے کبھی کہا تھا ”بے پناہ محبت کا عشق کا، جنون کا اور قتل ہوتا ہے عورت کی خوشیوں کا، جاگتے میں روتی ہے تو عورت، سوتے میں مسکراتی ہے تو عورت۔“

اور وہ اسے نجانے کب سے جاگتے میں روتا اور سوتے میں مسکراتے ہوئے دیکھتا تھا۔ لیکن اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس نے کہا تھا۔
”کیا کوئی ایسا اسم ہے جسے پڑھنے سے انسان اپنی تقدیر کے چکر سے باہر آ سکے۔ ایک سدھی رواں، متوازن راہ پر سکون و اطمینان سے چل سکے۔ مجھے محض اس راہ کی آرزو ہے۔“

اور آذر کو یقین تھا، وہ راہ سید عالم شاہ نے تحفہً ان دونوں کو دے دی تھی۔ اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ محبتیں ہرزہ کا تریاق ہوتی ہیں، وہ اپنی اجالا کی راہ میں دوبارہ سے اجالے بکھرا دینے کا ہنر جانتا تھا اور اسے اپنے ہنر پر پورا بھروسہ تھا۔
مکرم علی نے دونوں کے لیے دروازہ وا کیا۔ اور ان کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔
باہر لان میں ایک گوشے میں بنی قبر پر لیمپ روشن تھا اور اس کی روشنی میں اس قبر کے کتبے پر لکھی تحریر صاف پڑھی جاسکتی تھی لکھا تھا۔

سید عالم شاہ

وہ عمر جس کی ماروی کو اس سے محبت ہو گئی



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com